تفسیر

سورۂ اخلاص

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر
سورۂ اِخلاص

شیخ الاسلام
امام ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ

www.KitaboSunnat.com

ناشر
مکتبہ نذیریہ لاہور
قینچی امرسدھو فیروز پور روڈ • ڈاکخانہ کوٹ لکھپت

نام: تفسیر سورۃ اخلاص

تصنیف: شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رح

ترجمہ: مولانا غلام ربانی، بی۔ اے

مطبع: شاہ اینڈ سنز پریس پرنٹرز لاہور

ناشر: مکتبہ نذیریہ لاہور

قیمت: ۲۱ روپے

عرضِ ناشر

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

زیر نظر کتاب "سورہ اخلاص" میں خالص توحید کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں عیسائیت، مادہ پرستی، ہندوازم، قدریت جہمیت اور رافضیت جیسے باطل نظریات پر کڑی تنقید ہے۔

"سورۃ اخلاص" کی چند آیات کی تفسیر میں قرآن وسنت کے بیشمار نئے نئے نکات ومعارف کا انکشاف ہے۔

یہ کتاب علمی مضامین کا بحرِ ذخار ہے۔ جس کی تلاطم خیز امواج کے سامنے فرقہ ہائے ضالہ خس وخاشاک کی طرح بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس کتاب کے محاسن دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں:

یہ کتاب اہلِ علم کے لئے ایک بے نظیر علمی خزانہ ہے۔ اور فرقہ ہائے ضالہ کے خلاف ایک برہنہ تلوار، ان خصوصیات کی بناء پر شدت سے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اِس کتاب کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

لہٰذا مکتبہ نذیریہ لاہور نے کتاب کی افادیت کے پیشِ نظر کتاب کو منظرِ عام پر لانے کی سعی وکوشش کی۔

لیجئے حضرات ! اب یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، مطالعہ فرمائیے۔ دینی معلومات میں اضافہ کیجئے، اپنے ایمان کو جلا بخشئے اور ادارہ کی ترقی کے لئے دعا کیجئے۔ اگر کہیں کوئی لغزش نظر آئے تو مجھے مطلع کیجئے۔

الخادم المخلص

العبد الضعیف محمد حنیف یزدانی

ناظم مکتبہ نذیریہ — لاہور

۳۰ ؍ مارچ ۱۹۷۹ء

یکم ؍ جمادی الاوّل بروز جمعہ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ
سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ
لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا
عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا۔

سورۂ اخلاص

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ
اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ
وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ

کہہ دیجئے! کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اُس نے جنا اور نہ وُہ جنا گیا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

الصّمد کی تفسیر

اسم صمد کے متعلق سلف سے متعدد تفسیریں منقول ہیں بعض کا خیال ہے، کہ یہ تفسیریں باہم مختلف ہیں لیکن درحقیقت وُہ سب درست ہیں، ان میں سے دو قول سب سے زیادہ مشہور ہیں، ایک یہ کہ صمد وُہ ہے جس میں کھوکھلا پن نہ ہو، دوسرا یہ کہ صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ اپنی حاجتیں لے جاتیں۔

پہلے قول سے اکثر صحابہ و تابعین اور اہلِ لغت کی ایک جماعت نے اتفاق کیا ہے دوسرے قول کی تصدیق سلف و خلف کی ایک جماعت، جمہور اہلِ لغت اور ان آثار و روایات سے ہوتی ہے جو مستند کتب تفاسیر و صحاح ستہ وغیرہ میں سلف سے مروی ہیں الصمد کی یہ تفسیر کہ یہ وُہ چیز ہے جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔ موقوفاً و مرفوعاً[1] ابن مسعود، ابن عباس، حسن بصری، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، ضحاک، سدی اور قتادہ سے منقول ہے سعید بن مسیب کا قول ہے کہ صمد اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں حشو نہ ہو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے حشو کی بجائے جمع کا صیغہ احشاء استعمال کیا ہے شعبی کا قول ہے کہ **صمد** اس چیز کو کہا جاتا ہے، جو نہ کھائے نہ پیئے محمد بن کعب قرظی اور عکرمہ سے مروی ہے کہ صمد اس چیز کا نام ہے جس میں سے کچھ نکل نہ سکے۔ میسرہ سے مروی ہے کہ انھوں نے صمد کے معنی مصمت (ٹھوس چیز) بتاتے ہیں۔ ابن قتیبہ کا قول ہے کہ گویا "ت"، "د" سے بدل گئی ہے اور صمت دراصل صمد ہی ہے۔ میرے نزدیک ابدال نہیں، بلکہ اشتقاقِ اکبر ہے[2]۔ اور ان شاءاللہ

---

[1] موقوف وُہ روایت ہوتی ہے جس کی سند صحابی تک پہنچ کر رک جائے مرفوع وُہ روایت ہے جس کا سلسلہ اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے۔ مترجم

[2] اشتقاق کی تین اقسام ہیں بحث آگے آئے گی۔ ان شاءاللہ

اس قول کی وجہ بلحاظ اشتقاق ولغت آگے چل کر بیان کی جائے گی اور اس کی تائید و ثبوت میں وُہ حدیث پیش کی جاتی گی جو اس آیت کے سبب نزول کے متعلق امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کی ہے اور اس کے علاوہ ابوسعد صنعانی کی بھی حدیث پیش کریں گے۔

حدیث: ابو جعفر رازی نے ہم سے ایک حدیث بیان کی ہے، جو انھوں نے ربیع بن انس سے اور انھوں نے ابو عالیہ سے اور انھوں نے ابی بن کعب سے روایت کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، ہمیں اپنے رب کا نسب نامہ بتاؤ، اس پر اللہ تعالیٰ نے قل ھو اللہ احد اللہ الصمد۔ کی سورت مبارکہ نازل فرمائی، آپ نے فرمایا، الصمد وُہ ہوتا ہے جو نہ خود کوئی بیٹا بیٹی جنے اور نہ کسی اور نے اُسے جنا ہو۔ کیونکہ جو چیز کسی سے پیدا ہوتی ہے اس کو موت لازم ہے اور یہ ضروری ہے کہ جو چیز مرے اس کا کوئی وارث ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نہ تو مرتا ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوسکتا ہے اور یہ تفسیر کہ صمد وُہ سردار ہوتا ہے جس کی طرف لوگ اپنی حاجتیں لے کر جائیں تو یہ بھی ابن عباسؓ سے موقوفاً و مرفوعاً مروی ہے۔ یہ تفسیر والبی نے بروایت ابن عباسؓ کی ہے۔ آپ نے فرمایا، صمد اُس سردار کو کہتے ہیں جس کی سرداری کامل ہو۔ ابو وائل شفیق بن سلمہ سے مشہور روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، صمد وُہ سردار ہوتا ہے جس کی سیادت انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ ابو اسحٰق کوفی بروایت عکرمہ ناقل ہیں کہ صمد وُہ ہے جس سے برتر کوئی نہ ہو۔ علی اور کعب الاحبار سے مروی ہے کہ صمد وُہ ہوتا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی شخص اس کی برابری نہ کر سکے۔ سدی سے بھی مروی ہے کہ صمد کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کہ جس کی طرف لوگ آرزوئیں لے کر جائیں اور مصیبتوں کے وقت اس سے فریاد کریں۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صمد وُہ ہوتا ہے جو ہر ایک سے بے نیاز ہو اور ہر شخص اس

محتاج ہو۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ صمد وُہ ہے جو اپنے سارے افعال و صفات میں کامل ہو۔ ربیع سے مروی ہے کہ صمد اس شخص کو کہا جاتا ہے جس پر آفات وارد نہ ہو سکیں۔ مقاتل بن حیان سے مروی ہے کہ صمد وُہ ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ ابنِ کیسان سے روایت ہے کہ صمد اس ذات کا نام ہے جس کی صفات دوسروں سے نرالی ہوں۔ ابو بکر انباری فرماتے ہیں۔ اہلِ لغت میں اس بات کے متعلق کوئی اختلاف نہیں کہ صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس سے برتر کوئی نہ ہو اور جس کی طرف لوگ امورِ حاجات لے کر جائیں۔ زجاج کا قول ہے کہ صمد وُہ ہے جس پر سیادت ختم ہوتی ہو۔ ہر چیز کا صمود اس کی طرف ہو یعنی ہر شے اس کا قصد کرے، اور کسی چیز کا صمود اس کی طرف ہونے کے یہ معنیٰ ہیں کہ ہر ایک چیز میں اس کی صفت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لفظ کے متعلق دو مشہور شعر بھی کہے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے ؎

الا بکر الناعی بخیر بنی اسد

بعمرو بن مسعود وبالسید الصمد

کیا خبر مرگ دینے والے نے علی الصبح قبیلہ بنی اسد کے بہترین رکن عمرو بن مسعود کی خبر نہیں دی جو سید صمد ہے۔

دوسرا شعر یہ ہے: ؎

علوته بحسامی ثم قلت لہ،

خذها حذیف فانت السیّد الصمد

میں نے اپنی تلوار اٹھا کر اس کے سامنے پیش کی اور اس سے کہا کہ حذیف اسے لے لیجیے، کیونکہ آپ تو سیّد صمد ہیں۔

بعض اہل لغت نے کہا ہے، کہ صمد وُہ سردار ہوتا ہے۔ جو مقصودِ حاجات

ہو۔ عرب کہا کرتے ہیں صمدت فلانا اصمدہ۔ (بالکسر) واصمدہ (بالضم) صمدا (بہ سکون میم) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں نے اس کی طرف جانے کا قصد کیا اور جس طرح قبض مقبوض اور نقض منقوض کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صمد مصمود کا ہم معنی ہو سکتا ہے۔ جب لوگ کسی گھر کی طرف بوقتِ حاجات جانے کا ارادہ کیا کریں تو وُہ گھر بیتِ مصمود اور بیت مصمد کہلاتا ہے۔ طرفہ کا قول ہے ؎

وان یلتق الحی الجمیع تلاقنی

الی ذروۃ البیت الرفیع المصمد[1]

اور اگر سارا قبیلہ جمع ہو تو بلند اور مصمد مکان کی چوٹی پر

مجھ سے ملاقات کر سکے گا

جوہری کا قول ہے کہ صمد یصمد صمدا قصد یقصد قصدا کے معنی پر آتا ہے اور صمد اس سردار کو کہتے ہیں جس کی طرف بوقتِ حاجات قصد کیا جائے اور بیت مصمّد (بالتشدید) بیتِ مقصود کے معنی میں آتا ہے اور اس کے معنی اس گھر کے ہیں جس کی طرف لوگ قصد کریں۔ خطابی کے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ صمد وُہ سردار ہوتا ہے جس کی طرف بوقتِ حاجات قصد کیا جائے کیونکہ اشتقاق اس کی شہادت دیتا ہے۔ صمد کا اصل قصد ہے جیسے یہ معنیٰ ادا کرنے مقصود ہوں کہ میں فلاں شخص کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو اقصد قصد فلان کی بجائے اصمد صمد فلان بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے صمد وُہ سردار ہے جس کی طرف امورِ

---

[1] قدیم عرب میں یہ دستور تھا کہ اپنی طبعی فیاضی کے اقتضاء سے لوگ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر آگ جلایا کرتے تھے تاکہ بھوکے لوگ آگ کی روشنی دیکھ کر ادھر کا رُخ کریں اور انھیں کھانا کھلایا جائے۔ اسی لحاظ سے شاعر نے یہ شعر بطور افتخار کہا ہے۔ مترجم

معاملات میں صمود (رجوع وارادہ) کیا جائے اور بوقتِ حاجات اس کا قصد کیا جائے قتادہ کا قول ہے کہ صمد کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جو اپنی مخلوقات کے بعد بھی باقی رہے۔ مجاہد و معمر کا قول ہے کہ صمد دائم (ہمیشہ) رہنے والے کو کہتے ہیں۔ خطابی اور ابو الفرج بن الجوزی نے اس بارے میں چار قول نقل کیے ہیں، دو تو یہی ہیں جو ابھی بیان ہوئے اور دو پہلے آچکے ہیں اور ان شاء اللہ ہم بیان کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ بقا و دوام اس کی صمدیت کے لوازم ہیں۔

مرۃ الہمدانی سے مروی ہے کہ صمد اس ذات کو کہا جاتا ہے جسے کہنگی اور فنا لاحق نہ ہو۔ انھی سے یہ بھی روایت ہے کہ صمد اس ذات کا نام ہے جس کے احکام و افعال کسی دوسرے شخص کی مرضی اور ارادے کے تابع نہ ہوں جس کے حکم پر کوئی نظر ثانی نہ کر سکے اور جس کی قضاء اٹل ہو۔ ابن عطاء کا قول ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو بننے اور بگڑنے سے بالا ہو۔ نیز انھی کا قول مروی ہے، کہ صمد اس ذات کو کہا جاتا ہے جس پر ان امور کا کوئی اثر نمایاں نہ ہو جو اس کی طرف سے ظہور پذیر ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ (ق) اور ہمیں کوئی تکان محسوس نہیں ہوئی۔

حسین بن الفضل کا قول ہے، کہ صمد اس ذاتِ ازلی کو کہا جاتا ہے، جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔ محمد بن علی الحکیم الترمذی فرماتے ہیں کہ صمد کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جو اول ہے لیکن عدد سے پاک ہے اس کی بقاء کی کوئی انتہا نہیں، اور وہ ستون اور سہارے کے بغیر قائم ہے، انھی کا قول ہے کہ صمد وہ ذات ہے، جس کے ادراک اور احاطہ سے آنکھیں قاصر ہوں جس پر افکار و خیالات حاوی نہ ہوں جس کی وسعت اقطار و اطراف کی قیود سے آزاد ہو۔ اور جس کے پاس ہر ایک چیز کا اندازہ و حساب موجود ہو۔ ایک قول یہ ہے کہ صمد اس ذات کو کہتے ہیں جو صور دل

کی صورت گری سے بالاتر ہو۔ نیز کہا گیا ہے کہ صمد اس ذات کا نام ہے جو تجزیہ و ترکیب سے پاک ہو۔ اس قول کے ساتھ بہت سے اہل کلام نے اتفاق کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صمد اس ہستی کا نام ہے جس کی کیفیت معلوم کرنے سے عقلیں مایوس ہو جائیں، علیٰ ہذا القیاس یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس ذات کا نام ہے جس کے اوصاف و محامد کی حقیقت معلوم نہ ہو سکے، نہ زبان اس کے بیان پر قادر ہو اور نہ عقل اس کی طرف اشارہ کر سکے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اسم ذات پر صادق آتا ہے جس کے متعلق اس کی مخلوق کو نام اور صفت کے سوا اور کوئی علم نہ ہو۔ جنید بغدادیؒ سے ایک قول مروی ہے کہ اسم صمد اس ہستی کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے دشمنوں کو اس کی پہچان کی کوئی راہ معلوم نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ بلحاظ اشتقاق یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ صمد وہ ہستی ہے جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ صمد سردار کو کہا جاتا ہے۔ البتہ پہلی صورت میں اشتقاق کی دلالت واضح تر ہے۔ کیونکہ پہلی صورت دوسری کی اصل ہے۔ لفظِ صمد لغت میں بھی اسی چیز پر بولا جاتا ہے جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔

یحییٰ بن ابی کثیر کا قول ہے کہ فرشتے صمد ہیں اور آدمی جوف۔ حدیث میں ہے کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کے متعلق کہا کہ وہ اجوف (کھوکھلا) ہے صمد نہیں ہے۔ جوہری کا قول کہ لغت میں مصمد کے معنی مصمت کے ہیں اور مصمت اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کھوکھلا پن نہ ہو۔ انہی کا قول ہے کہ "صماد" شیشی کے "عفاص"[1] کو کہتے ہیں اور صمد مضبوط اور بلند مکان کے لیے بولا جاتا ہے۔ ابوالنجم کا قول ہے ؎

یغادر الصمد کظھر الاجزل ،

بلند زمین کو پشتِ ناقہ کی مانند بنا دیتا ہے

---

[1] عفاص چمڑے کے ٹکڑے کو کہتے ہیں جو شیشی یا کسی برتن کے منہ پر باندھا جاتا ہے۔ مترجم

اس مادہ کے اصل معنی جمع وقوت کے ہیں۔ چنانچہ یصمد المال یجمع المال (مال جمع کرتا ہے) کے معنی میں آتا ہے۔

سیّد کی تفسیر

سیّد کا اصل سیود ہے۔ یا اور واؤ کا اجتماع ہوا اور ان میں سے پہلے حرف پر سکون ہے، اس لیے واؤ، یا میں بدل کر مدغم ہوگئی۔ علیٰ ہذا القیاس میت کا اصل میوت ہے۔ سواد (سیاہی) اور سودد (سرداری) کا مادہ بھی جمع پر دلالت کرتا ہے۔ سیاہ رنگ جامع بصارت ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول وسیدا وحصورا سے بھی اسی معنی کی توضیح ہوتی ہے سلف صالحین میں سے اکثر بزرگوں نے سیدا حلیما فرمایا ہے حسن، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطا، ابو الشعثا بن انس اور مقاتل سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابو روق بروایت ضحاک فرماتے ہیں کہ صمد خوش اخلاق کو کہتے ہیں۔ سالم نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ اس کے معنی پرہیزگار (تقی) کے ہیں اور جب تک کوئی شخص اپنے اندر اخلاقِ حسنہ اور ثبات جمع نہ کرے وہ لوگوں پر سیادت حاصل نہیں کر سکتا۔

عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو معاویہؓ سے زیادہ ذی سیادت نہیں پایا۔ ان سے کہا گیا کہ آیا ابوبکرؓ و عمرؓ بھی سیادت میں فائق تر نہیں تھے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ ان سے بہتر ضرور ہیں لیکن بلحاظ سیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد حلم تھی۔ چنانچہ کہا گیا ہے ؎

اذا شئت یوما ان تسود قبیلۃ
فبالحلم سد لا بالتسرع والشتم

"جب تو کسی قبیلہ پر سیادت حاصل کرنا چاہے تو جلد بازی اور بدگوئی سے نہیں بلکہ نرمی سے سردار بن۔"

چنانچہ سلف صالحین کی ایک جماعت نے سیّد کی تفسیر یہ کی ہے کہ سیّد وہ ہے جو دین میں اپنی قوم کا سردار ہو۔

ابن زید کا قول ہے کہ سید شریف کو کہتے ہیں۔ زجاج کا قول ہے، کہ سیّد اس کو کہتے ہیں جو نیکی کے اعتبار سے اپنی قوم میں سب سے بالاتر ہو۔ ابن انباری کا قول ہے، کہ سید اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نیکی کے کام میں پیشوا اور رئیس کا درجہ رکھتا ہو۔ ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ سید اس فرد کو کہتے ہیں جو اپنے پروردگار کے ہاں عزیز ہو۔ سعید ابن مسیب سے مروی ہے کہ سیّد فقیہ، عالم کو کہتے ہیں۔

سیّد و صمد میں معنوی مماثلت

شیشے یا بوتل کا منہ بند کرنے کے لیے جو چمڑا لگایا جاتا ہے وہ "صماد" کہلاتا ہے اور اس کا دوسرا نام "عفاص" ہے۔ جس چیز کو موجودہ عرف میں کارک کہا جاتا ہے اور جو بوتل کے منہ میں داخل کی جاتی ہے اسے "صمام" کہتے ہیں۔

"عفصت القارورة" کے معنی یہ ہیں کہ "قارورہ کے منہ پر چمڑا باندھا گیا۔

میں کہتا ہوں کہ صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لقطہ[۱] کے متعلق مروی ہے کہ اس کے عفاص (تھیلی) اور وکاء (بندھن) کو پہچانو اور عفاص سے وہ چیز مراد ہے جس میں درہم وغیرہ ہوں۔ مثلاً کپڑے کا ٹکڑا جس میں روپے باندھے جاتے ہیں اور وکا، اس دھاگے کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے اس کپڑے کا منہ باندھا جاتا ہے اور یہ عفاص قارورہ کی جنس سے ہوتا ہے۔ عفص، سیّد، صمد کے معانی باہم

---

[۱] لقطہ اس چیز کو کہتے ہیں جو راستہ میں پڑی ہوئی مل جائے۔ مترجم

پائے جاتے ہیں اور ان سب میں جمع اور قوت کے معنی پائے جاتے ہیں۔ "طعام عفص" یا "طعام فیہ عفوصۃ" اس کھانے کو کہتے ہیں جو قابض ہو اور اسی سے عفص ہے جس سے روشنائی بنائی جاتی ہے۔

جوہری کا قول یہ ہے کہ لفظ عفص مولد[1] ہے اور بدوؤں کی زبان میں یہ مستعمل نہیں ہے۔ لیکن اس میں کوئی حرج نہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ایسی چیز موجود ہی نہ تھی جس کا نام وُہ عفص رکھتے۔ تاہم اصول کلامِ عرب میں اس کا استعمال جاری ہے اور اسی طرح جو چیز بوتل کے منہ میں داخل ہو جاتی ہے اسے "صمام" (کارک) کہتے ہیں کیونکہ اس مادے میں جمع اور قوت کے معنی ہیں۔ جوہری کا قول ہے کہ بوتل کی "صمام" (کارک) اس چیز کو کہتے ہیں جس سے اس کا منہ بند ہو جاتے۔

"حجر اصم" اُس پتھر کو کہتے ہیں جو سخت اور ٹھوس ہو۔ "رجل اصم" اس آدمی کو کہتے ہیں جو کان بند ہونے کے باعث کوئی بات سن نہ سکے۔ "رجل صمت" اس شخص کو کہتے ہیں جو شجاع ہو۔ اور "صمت" سانپ کو بھی کہتے ہیں۔ "صمیم شے" اس شے کے خالص حصے کو کہتے ہیں جہاں کوئی ایسی اور چیز داخل نہ ہو سکے جو اس پر فائق و غالب ہو کر اسے ضعیف کر دے۔ چنانچہ "صمیم الحر" شدتِ گرمی کو اور "صمیم البرد" شدتِ سردی کو کہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ "فلان من صمیم قومہ" (فلاں شخص اپنی قوم میں شجاع و ممتاز ہے) صمصام اس شمشیر براں کا نام ہے جس کا منہ نہ مڑے۔ "الصمم فی السیر" تیز رو کو کہتے ہیں۔ "رجل صمم" فربہ و قوی ہیکل آدمی کو کہتے ہیں۔ بلحاظ اشتقاق اکبر صوم کا تعلق بھی اس لفظ سے ہے کیونکہ صوم (روزہ) امساک (بند رہنا) کو کہتے ہیں۔

---

[1] مولد اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی دوسری زبان سے معرب نہ ہو بلکہ عربی الاصل ہو لیکن کسی مناسبت کے باعث جدید مضمون میں مستعمل ہونے لگا ہو۔

ابو عبیدہ کا قول ہے کہ طعام کلام یا چلنے سے باز رہنا صوم یعنی روزہ کہلاتا ہے، کیونکہ امساک میں اجتماع ہوتا ہے اور صائم (روزہ دار) کے پیٹ میں بھی کوئی چیز داخل نہیں ہوتی اور جب گھوڑا گھاس چارے کے بغیر رہے تو کہا جاتا ہے صَامَ الْفَرَسُ۔ نابغہ کا قول ہے سے

خیل صیام وخیل غیر صائمۃ

تحت العجاج واخری تعلک اللجما

(کچھ گھوڑے تو گھاس چارہ چھوڑے بیٹھے ہیں، کچھ کھا رہے ہیں اور کچھ لگامیں چبا رہے ہیں۔ الخ۔

اسی طرح سد، سداد، سودد اور سواد ہیں اور اسی طرح لفظِ صمد میں جمع کے معنی ہیں اور جمع میں قوت ہوتی ہے کیونکہ جس چیز کے اجزاء باہم مجتمع ہوں اور ان میں کوئی خلل نہ ہو تو وہ اس چیز سے قوی تر ہوتی ہے جس میں خلو ہو" مضبوط اور مرتفع مکان کو اسی لیے صمد کہتے ہیں کہ اس میں مضبوطی، تماسک اور اجتماع اجزا ہوتا ہے"۔ "رجل صمد" وہ سردار ہوتا ہے جس کی طرف لوگ جانے کا ارادہ کریں۔ ایسے آدمی کو مصمود، مقصود لہ اور مقصود الیہ بھی کہتے ہیں اور لوگ اپنی حاجتیں اسی آدمی کے پاس لے کر جاتے ہیں جو انہیں پورا کرے اور لوگوں کی حاجتیں وہی شخص پوری کر سکتا ہے جو خود مجتمع، قوی اور ثابت قدم ہو۔ اور ایسا شخص سردار اور کریم کہلاتا ہے۔ اس کی ضد کو ہلوع وجزوع کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو لوگوں کی حاجات کی کثرت کے باعث پریشان ہو جاتا ہے، اس کی گرانباری کے نیچے دب جاتا ہے اور اس کے قولی اسے جواب دے جاتے ہیں، ایسا آدمی سردار صمد نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی طرف حاجتیں لے کر جائیں۔ سردار اس شخص کو کہتے ہیں جو صمد ہو، کیونکہ اس میں ایسے اوصاف ہوتے ہیں کہ لوگ اپنی ضروریات کے وقت اس کی طرف جاتے ہیں۔ ان کی

زبان میں سید کے معنے دور یا نزدیک کی طرح اضافی نہیں ہیں بلکہ وُہ ایک ایسی حقیقت ہے جو سیّد (سردار) کے ساتھ قائم ہے اور جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف آتے ہیں۔ سیّد، سوددا اور سواد سے مشتق ہے اور اشتقاقِ اکبر میں یہ لفظ سداد کی جنس سے ہے۔ کیونکہ اہلِ عرب حرفِ علت کی جگہ حرفِ مضاعف اور حرفِ مضاعف کی جگہ حرفِ علت استعمال کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تقضی البازی و تقضض لبازی کے ایک ہی معنی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کا استعمال مقبول تر ہے کیونکہ موخر الذکر میں ثقل واقع ہوتا ہے اور ساد اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کو ایسا درست کرے کہ اس میں خلو باقی نہ رہے۔"

سداد، قاروہ اور سداد ثغر اسی سے مشتق ہے اور سداد بھی اسی سے ہے جس کے معنی درست کے ہیں اور قول سدید (درست بات) بھی اسی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ واتقوا اللہ وقولوا قولا سدیدا۔ (خدا سے ڈرو، اور درست بات کہو)

روایات منظہر ہیں کہ بعض لوگوں نے اس کے معنی قصد حق (سچا ارادہ) ابنِ عباس رضی نے قصدِ صواب (درست ارادہ) قتادہ و مقاتل، عدل اور سدی نے مستقیم کیے ہیں۔ اور یہ سب اقوال صحیح ہیں۔ "قول سدید" مطابق و موافق قول کو کہتے ہیں۔ اور اگر وُہ خبر ہو تو وُہ صحیح اور مخبر کے قول کے مطابق ہو گی۔ اس میں کمی بیشی نہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ سداد کی تفسیر قصد سے اور قصد کی عدل سے ہوتی ہے۔

جوہری کا قول ہے کہ تسدید کے معنی سداد کی توفیق کے ہیں اور سداد قول اور عمل میں درستی و میانہ روی کا نام ہے۔ مسدد آدمی وُہ ہوتا ہے جو درستی اور اعتدال سے کام کرے۔ مسدد کے معنی مقوم کے ہیں۔ "سدد رمحہ" کے

معنی ہیں، اس نے اپنا نیزہ سیدھا کیا "امر سدید" اور "امر اسد" کے معنی بھی معتدل کام کے ہیں۔ استد الشئ کے معنی ہیں کہ وہ چیز سیدھی ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے

اعلمہ الرمایۃ کل یوم

فلما استد ساعدہ رمانی

"میں ہر روز اسے تیر اندازی سکھاتا ہوں، اور جب اس کا ہاتھ صاف ہو جاتا ہے تو مجھے ہی اپنا آماجگاہ بنا لیتا ہے۔"

بقول سعدی سے

کس نیا موخت علم تیر از من

کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

اس شعر میں "استد ساعدہ" کے معنی ہیں۔ اس کا بازو سیدھا ہو گیا۔ یعنی اسے تیر اندازی کی مہارت ہو گئی۔

اصمعی کہتا ہے کہ بعضوں نے "اشتد ساعدہ" کہا ہے۔ لیکن اس کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ سداد کو قصد سے جو تعبیر کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ قصد میں جمع اور قوت کے معنی ہیں اور قصد عدل کو کہتے ہیں اور سداد وصواب کے بھی یہی معنی ہیں اور عدل اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کمی بیشی نہ ہو اور اسی کو جامع و مطابق کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: علی اللہ قصد السبیل "قصد السبیل" سے مراد سبیل قصد یعنی عدل کا راستہ ہے اور آیہ شریفہ کے معنی یہ ہوتے کہ "عادل راہ اسی تک منتہی ہے" جس طرح ان علینا للھدیٰ سے مراد الھدیٰ الینا یعنی تمام ہدایتیں ہم تک منتہی ہوتی ہیں۔"

ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں جس قدر اقوال وارد ہوتے ہیں ان سب میں سے

یہ قول زیادہ صحیح ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قال ھذا صراط علی مستقیم۔ ۱۴:۳

اس سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے بلحاظ اشتقاق اوسط لفظ صدق بھی اسی لفظ سے مشتق ہے کیونکہ اس میں وہی حروف ہیں جو قصد میں ہیں۔ کسی بات میں سچا ہونے سے بھی مراد یہی ہے کہ وُہ بات خبر دینے والے کے قول کے مطابق ہوتی ہے اور سدید کے بھی یہی معنی ہیں جن کا ذکر آچکا ہے۔ صدق سخت نیزے کو کہتے ہیں اور اس کے معنی مستوی بھی کیے گئے ہیں اور مستوی وُہ ہوتا ہے جو معتدل اور سخت ہو اور اس میں خلل اور کجی نہ ہو۔ نیز صندوق جس کی جمع صنادیق ہے، اس سے مشتق ہے، کیونکہ جو کچھ اس میں رکھا جاتا ہے، وُہ اُسے جمع رکھتا ہے۔

اشتقاق کی تین قسمیں

باب اشتقاق میں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے مشتق کہا جائے تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ ان دونوں لفظوں میں لفظاً و معنًا مناسبت ہوتی ہے۔ اہل لغت ان دو کلموں میں سے جسے چاہیں مقدم مانیں۔ اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال ان میں سے ہر ایک کلمہ دوسرے کلمے سے مشتق ہوتا ہے، کیونکہ وُہ لفظًا اور معنًا اس کے مناسب ہے۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پانی اس پانی سے ہے، اور یہ کلام اس کلام سے ہے۔ چنانچہ فعل کو مصدر سے اور مصدر کو فعل سے مشتق کہنا دونوں قول صحیح ہیں یہ وُہ اشتقاق ہے جس پر صرف کی دلیل قائم ہو سکے۔

اشتقاق کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں میں سے ایک دوسرے کا اصل ہو، اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ ان میں سے ایک دوسرے کی نسبت پہلے استعمال

کیا گیا ہے تو اکثر مقامات میں اس پر دلیل نہیں قائم کی جا سکتی، اگر اس کے یہ معنی ہوں کہ ان دونوں میں سے ایک عقل میں دوسرے سے مقدم ہے، کیونکہ ایک مفرد اور دوسرا مرکب ہے۔ تو فعل مصدر سے مشتق ہے۔"

اشتقاق اصغر دو کلموں میں حروف اور ان کی ترکیب کی موافقت کو کہتے ہیں

اشتقاق اوسط اس وقت ہوتا ہے جب حروف میں تو اتفاق ہو لیکن ان کی ترتیب میں اتفاق نہ ہو۔

اشتقاق اکبر اس وقت صادق آتا ہے جب بعض حروف میں تو بعینہ موافقت ہو اور باقی حروف میں مطابقت جنسی ہو۔ مثلاً حزر، عزر اور ازر، تینوں میں قوت و شدت کے معنی پائے جاتے ہیں۔

ر اور ز میں تو اشتراک عینی ہے اور (ح)، (ع) اور (ا) اس لحاظ سے مشترک ہیں کہ ان کی جنس ایک ہے۔ یعنی یہ کہ وہ تینوں حروف حلقی ہیں۔ جب یہ کہا جائے کہ صمد کے معنی مصمت کے ہیں اور وہ اس لحاظ سے مصمت سے مشتق ہے تو یہ بات صحیح ہے، کیونکہ (د)، (ت) کی بہن ہے اور صمت خاموش کو کہتے ہیں، اور خاموشی بات چیت سے منہ بند رکھنے کو کہتے ہیں۔

ابو عبیدہ کا قول ہے کہ مصمت اس چیز کو کہتے ہیں جس کا جوف (کھوکھلا پن) نہ ہو۔ وقد اصمتہ انا (میں نے اسے صائم پایا) باب مصمت (بند دروازہ جس کے کھلنے کی راہ معلوم نہ ہو سکے) خیل مصمت (ایسے رنگ کے گھوڑے، کہ ان کے رنگ میں کسی دوسرے رنگ کا اختلاط نہ ہو) یہ سب مثالیں اصلی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔

ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حریر مصمت (یعنی خالص ریشم) حرام ہے مصمد اور مصمت اشتقاق اکبر میں متفق ہیں۔ د، ت سے بدل کر نہیں بنی۔ بلکہ د اس سے

اشتقاق اصغر کی مثال صدق اور صادق اشتقاق اوسط کی مثال صدق

قوی تر ہے اور صمد با لحاظ معنی صمت کی نسبت زیادہ کامل ہے اور جتنا کوئی حرف قوی ہوگا اس کے معنی بھی قوی تر ہوں گے۔

زبانِ عرب نہایت محکم اور متناسب واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ دیکھیے صمت اور صمد میں بھی ایک لطیف فرق ہے۔ "صمت با وجود امکان کے کلام سے باز رہنے کو کہتے ہیں۔ انسان اجوف ہے۔ اس کے منہ سے کلام صادر ہوتا ہے لیکن وُہ کبھی کبھی خاموش بھی ہو جاتا ہے۔ یہ خاموشی صمت کہلاتی ہے۔ بخلاف ازیں صمد کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس میں تفرق مطلقاً نہ ہو۔

صبر کے معنی!

اور لفظ صبر کے معنی کو بھی ان معانی سے مناسبت ہے کیونکہ صبر میں بھی جمع وامساک پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نفس کو [illegible] ہٹ سے روکنے پر صبر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ "صبر" (وُہ ٹھہر [illegible]) "صبرتہ انا" (میں نے اسے روکا)

[illegible] تعالیٰ فرماتا ہے "واصبر نفسک" (اور اپنے نفس کو تھام) خوراک کے [illegible] کو بھی "صبرۃ من الطعام" اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وُہ مجتمع اور ایک جگہ [illegible] ہوا ہوتا ہے۔ صبارۃ پتھر کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا صبر [illegible] س چیز کی تقدد تو [illegible] ہے۔ اور جزع اس کی ضد ہے۔ اس میں ٹکڑے ٹکڑے اور جدا جدا ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے "جزع لہ جزعۃ من المال" (یعنی اس کے لیے [illegible] ل کا ایک حصہ علیحدہ کیا) جزوعہ بکری کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

[illegible] ترعت من الشجر عودا (میں نے درخت سے لکڑی کاٹی) اور جزعت الوادی (میں نے وادی کی مسافت عرضی قطع کی) [illegible] معنوں میں مستعمل ہیں۔ جزع وادی کے پھیر کو بھی کہتے ہیں۔ یمن کی اس کوڑی [illegible] ی کہتے ہیں، جس میں سفید [illegible] اور سیاہی ہوتی ہے۔

جز ع البسر تجزیعاً اس وقت کہا جاتا ہے جب بسر (کھجور) کا نصف، یا دو تہائی حصہ پختہ ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ان الانسان خلق ھلوعا اذا مسہ الشر جزوعا و اذا مسہ الخیر منوعا" (المعارج، آیت ۱۹، ۲۰، ۲۱)۔

"انسان خلقت ہی سے پرلے درجے کا حریص واقع ہوا ہے تکلیف پہنچے، تو سر پیٹنے لگتا ہے اور اگر خیر و تنعم حاصل ہو جائے تو کسی کو فائدہ پہنچانے کا نام نہیں لیتا۔"

جوہری کا قول ہے کہ ہلع گھبراہٹ کی بد ترین صورت کے لیے بولا جاتا ہے بعض کا قول ہے کہ ہلع "شدید ترین حرص اور بد ترین گھبراہٹ کو کہتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

"شر ما فی امرء شح ھالع وجبن خالع" "مرد کی بد ترین خصلت سخت لالچ اور تنزل زا بزدلی ہے" "ناقۃ ھلواع" اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو پھرتیلی اور تیز رفتار ہو۔ "ذئب ھلع بلع" وہ بھیڑیا ہوتا ہے جو تیزی سے شکار کو ہڑپ کر جائے۔ "ہلع" کے معنی حرص اور "بلع" کے معنی نگلنے کے ہیں، اسی لیے سلف نے جو کچھ اس کی تفسیر میں کہا ہے وہ ان معنوں پر مشتمل ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ہلوع" اس شخص کو کہتے ہیں جو مصیبت کے وقت جزع فزع کرے اور اچھے دنوں میں بخل اختیار کرے۔ نیز انہی کا قول ہے کہ "ہلوع" اس شخص کو کہتے ہیں جو اس چیز کا لالچ کرے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔ سعید بن جبیر "ہلوع" کے معنی "شحیح" (لالچی) کرتے ہیں۔ عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہلوع، ضجور (فریاد کرنے والے) کو کہتے ہیں۔ جعفر نے اس کے معنی "حریص" حسن و ضحاک نے "بخیل" اور مجاہد نے "لالچی" کے کیے ہیں۔ ضحاک سے یہ قول بھی مروی ہے، کہ

بلوغ وہ شخص ہوتا ہے جو بیہر ہونے میں نہ آتے۔ مقاتل نے اس کے معنی تنگ دل اور عطاء نے جلد باز کے بھی کیے ہیں۔ اور یہ سب معانی ثبات، قوت، اجتماع، امساک اور صبر کے منافی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"لا یزال بنیانھم الذی بنو ریبة فی قلوبہم الا ان تقطع قلوبہم" (التوبہ، آیۃ ۱۱۰)	"انھوں نے جو عمارت قائم کر رکھی ہے اس کے باعث ان کے دلوں میں شک رہے گا۔ تا آنکہ اُن کے دل نہ ٹوٹ جائیں۔"

لفظ "احد" کا استعمال!

اور اس مقام پر مقصود یہ ہے کہ احد کا لفظ اعیان میں سے خدائے واحد کے سوا اور کسی چیز پر نہیں بولا جاتا۔ خدا کے سوا دوسرے مواقع پر بولا جائے تو یا تو وہ نفی کے مقام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ اہلِ لغت کہتے ہیں، "لا احد فی الدار" (گھر میں کوئی نہیں ہے)

"فما منکم من احد عنہ حاجزین"۔ (سورۃ الحاقہ)	"پس تم میں سے کوئی بھی ہم کو اس سے روک نہ سکتا۔"

اور اسی طرح:

"لستن کاحد من النساء" (احزاب)	"تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو"

اسی طرح اضافت کے موقع پر بھی لفظ احد کا استعمال آیا ہے ملاحظہ ہو:

"فابعثوا احدکم" (الکہف، آیۃ ۱۹)	"اپنوں میں سے کسی بھیجو۔"

اور :

"جعلنا لاحدھما جنتین"۔ (الکہف : آیت ۳۲) ۶۹	"ہم نے ان دونوں میں سے ایک کو دو باغ دے رکھے تھے"۔

"صمد" کا لفظ چونکہ مخلوق کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے، اس لیے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ صمد بلکہ یہ فرمایا اللہ الصمد اور اس بات کی وضاحت کر دی کہ الصمد ہونے کا مستحق وہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں، کیونکہ وُہ بدرجہ غایت وکمال اس کا مستوجب ہے اور مخلوق اگرچہ بعض وجوہ سے صمد ہو لیکن حقیقت صمدیت اس میں نہیں پائی جاتی کیونکہ وُہ مورِد تفرق وتجزیہ ہو سکتی ہے اور وُہ صمد ہونے کے باوجود دوسروں کی محتاج ہے اس لیے خدا کے سوا باقی تمام چیزیں ہر بات میں خدا کی محتاج ہیں اور اس کے سوا کوئی ایسی ہستی موجود نہیں ہے کہ ہر چیز اس کی طرف حاجتیں لے کر جائے اور وُہ کسی چیز کے آگے دامن احتیاج نہ پھیلائے۔

مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کے اجزاء علیحدہ کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں تفریق وتقسیم موجود ہے اور اس کا بعض حصہ دوسرے سے منفصل ہو سکتا ہے، اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ الصمد ہے۔ ان باتوں میں سے کوئی چیز اس پر وارد نہیں ہو سکتی بلکہ حقیقت صمدیت اور اس کا کمال صرف اسی کے لیے واجب و لازم ہے جس طرح وُہ ایک ہے اور اس کا دو ہونا غیر ممکن ہے۔ اسی طرح اس میں عدم صمدیت غیر ممکن ہے وُہ ایک ہے اور کسی صورت سے کوئی چیز اس کی مماثل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آخر سورت میں فرمایا :

"ولم یکن لہ کفوا احد"۔	"اور نہ کوئی اس کے برابر ہے"۔

یہاں احد کا لفظ نفی کے مقام پر مستعمل ہوا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز کسی بات میں بھی اس کے برابر نہیں ہے کیونکہ وُہ احد ہے۔

ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "انت سیدنا" (تو ہمارا سردار ہے) تو آپ نے فرمایا: "السید اللہ" (حقیقی سردار اللہ ہے)

اللہ تعالیٰ کا قول الاحد اور الصمد اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے، کیونکہ الصمد وہ ہوتا ہے، جس کا نہ تو جوف (پیٹ) ہو اور نہ احشاء (انتڑیاں وغیرہ) اس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، وہ پاک اور برتر ہے چنانچہ فرمایا:

"قل اغیر اللہ اتخذ ولیا فاطر السموت والارض وھو یطعم ولا یُطعم" (الانعام: آیت ۱۴)

"کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ولی و مددگار بناؤں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، وہ کھانا کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا"۔

اعمش رحمہ اللہ نے "یُطعَمُ" کی بجائے "یَطعَمُ" پڑھا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کھانا نہیں کھاتا"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ وما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین" (الذاریات: آیت ۵۶، ۵۷، ۵۸)

"اور میں نے جن وانس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے رزق کا طالب نہیں ہوں، اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ رازق تو اللہ تعالیٰ ہے"۔

ملائکہ خدا کی مخلوقات میں سے ہیں۔ جب وہ صمد ہیں اور کھاتے پیتے نہیں ہیں تو ان کے خالق جل جلالہ ہیں تو وہ غنا وکمال بطریق اولیٰ موجود ہونا چاہیئے۔

جو وہ اپنی بعض مخلوقات کو عطا کرتا ہے اس لیے بعض اسلاف کرام نے صمد کی تفسیر میں بیان فرمایا کہ جو نہ کھائے اور نہ پیئے اور صمد مصمد وُہ ہوتا ہے جس کا جوف نہ ہو اور اس میں کوئی وجود خارج نہ ہو، چنانچہ وُہ بچہ بھی نہیں جنتا۔ اسی لیے بعض نے کہا ہے کہ صمد وُہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہیں نکلتی۔

خروجِ کلام کی تصریح

اس سے مراد یہ نہیں کہ وُہ کلام نہیں کرتا، اگرچہ کلام کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے، کہ وُہ اس سے نکلا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

"ما تقرب العباد الی اللہ بشی افضل مما خرج منہ۔"

"بندوں کو خدا سے قریب کرنے والی کوئی چیز قرآن سے افضل نہیں جو اُس کی زبان سے نکلی ہے۔"

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کا قرآن سنا تو آپ رضی اللہ عنہ نے کہا "ان ھذا لم یخرج من اللہ" (یہ خدا کے منہ سے نہیں نکلا) متکلم کے منہ سے کلام کے نکلنے کے یہ معنی ہیں کہ وُہ بات کرتا ہے اور اس سے بات سنی جاتی ہے اور دوسرے آدمی تک پہنچ جاتی ہے، دوسرے میں پیدا نہیں ہوتی جیسا کہ جہمیہ کا قول ہے، یہ خروج اس معنی میں نہیں ہوتا کہ جو اشیاء متکلم کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ان میں سے کوئی چیز علیحدہ ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو مخلوقات کی صفات سے بھی بعید ہے کہ صفت اپنے محل کو چھوڑ کر غیر محل میں چلی جائے۔ چہ جائیکہ خالق جل جلالہ کی صفات کے ساتھ یہ کیفیت وارد ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے کلام کے متعلق فرمایا ہے:

"کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا" (الکہف)

"ان کے منہ سے یہ بہت بڑے گناہ کا کلمہ نکل رہا ہے۔ وُہ بالکل جھوٹ کہہ رہے ہیں!"

یہ کلمہ متکلم کے ساتھ قائم ہے اور اس سے سنا گیا ہے، اس کا منہ سے نکلنا ایسا نہیں ہے کہ کلام جو اس کی ذات کے ساتھ قائم تھا، اس سے علیحدہ ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہر چیز کا خروج اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ علم و کلام کا شان یہ ہے کہ جب عالم اور متکلم سے استفادہ کیا جاتا ہے تو علم و کلام اپنے محل سے گھٹتا نہیں، وہ ایک روشنی ہے جس سے ہر شخص ضیا اندوز ہوتا ہے اور روشنی علی حالہٖ قائم رہتی ہے۔ ذرا نہیں گھٹتی۔ اس لیے سلف کا یہ قول کہ الصمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہ نکلے، اس معنی میں صحیح ہے کہ اس سے کوئی چیز جدا نہیں ہوتی۔

چنانچہ کسی کا اس سے پیدا ہونا، یا اس کا کسی سے پیدا ہونا ممتنع ہے۔

ولادت کے معنی

ولادت، متولد اور ان الفاظ کے قبیل سے جو کچھ بھی ہے اس کے لیے دو اصلوں کا وجود لازمی ہے جو متولد عین یعنی قائم بالذات ہو۔ اس کیلیے ایک ایسا مادہ لابدی ہے، جس سے وہ خارج ہو اور جو عرض یعنی قائم بالغیر ہو، اس کے لیے ایک محل کا وجود لازمی ہے۔ جس کے ساتھ اس کا قیام وابستہ ہو۔

ان میں سے اول الذکر کی نفی تو احد سے ہو گئی، کیونکہ احد وہ ذات ہے، جس کا نظیر و کفو کوئی نہ ہو لہٰذا اس کے لیے صاحبہ (بیوی) کا ہونا بھی ممتنع ہے۔

اور تولد دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"انّٰی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ وخلق کل شیٔ وھو بکل شیٔ علیم"	"اس کا بچہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اسی نے ہر چیز پیدا کی، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"
الانعام - آیۃ ۱۰۱	

بچے کی نفی ایک تو اس طریق پر کی گئی کہ بچے کے لیے بیوی کا ہونا لازم ہے اور اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ نفی لازم نفی ملزوم پر دلالت کرتی ہے۔

دوسرے یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کا خالق ہے اور اس کے سوا جو چیز موجود ہے وُہ اس کی مخلوق ہے۔ مخلوق میں کوئی چیز ایسی موجود نہیں جو اس سے پیدا ہوئی ہو۔ دوسری بات کی نفی اس طرح کر دی گئی کہ اللہ الصمد ہے اور یہ متولد دو اصلوں سے ایک ایک جزو کے علیحدہ ہونے سے ترکیب پاتا ہے۔

چنانچہ حیوان اپنی ماں اور اپنے باپ کی اُس منی سے پیدا ہوتا ہے۔ جو ہنگام مواصلت دونوں سے علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ تولد دوسرے اصل کا محتاج ہے اور وُہ اس امر کا بھی محتاج ہے کہ اصلوں میں سے ایک چیز خارج ہو اور اللہ تعالیٰ کی شان سے یہ چیزیں ممتنع ہیں، کیونکہ وُہ احد (ایک) ہے اس کا کوئی برابری کرنے والا نہیں کہ اس کی بیوی یا نظیر بن سکے۔ وُہ صمد ہے۔ اس سے کوئی چیز خارج نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا احد اور صمد ہونا دونوں اس امر کے مانع ہیں کہ وُہ والد ہو اور یہی دونوں امر بطریق اولیٰ اس کے مولود (کسی سے پیدا شدہ ذات) ہونے کے مانع ہیں۔

حیوان میں توالد دو اصلوں سے واقع ہوتا ہے خواہ یہ دو اصل ولد کی جنس سے ہوں جس طرح کہ حیوان متولد ہوتا ہے۔

یا ولد کی جنس سے نہ ہوں مثلاً عام پیدا ہونے والی چیزیں، اسی طرح غیر حیوان میں بھی توالد دو اصلوں سے ہوتا ہے۔ آگ چقماق کے دو حصوں (زندین) سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دو چقماق لکڑی یا پتھر اور لوہے یا ان کے علاوہ اور چیزوں

کے بھی ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَالْمُورِيٰتِ قَدْحًا

"قسم ہے پتھر پر ٹاپیں مارنے سے آگ نکالنے والوں کی"

(سورۃ العادیات)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ، نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَمَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ"

(الواقعہ، آیت: ۷۱)

"یہ تم جو آگ جلاتے ہو، اسے تو دیکھتے ہی ہو۔ اس کا ایندھن جس درخت سے آتا ہے اسے تم نے پیدا کیا یا ہم نے؟ ہم نے آگ اس لیے بنائی ہے کہ ایک تو تم اُسے دیکھ کر نارِ جہنم کا احساس کرو اور دوسرے مسافر لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں"

نیز فرمایا:

"وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ۝ (یٰسین)

"ہمارے سامنے تو مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہاں ان ہڈیوں کو کون زندہ کریگا یہ تو بوسیدہ ہو چکی ہیں؟ تم کہو کہ ان ہڈیوں کو وُہ ہستی زندہ کرے گی جسنے پہلی مرتبہ انھیں پیدا کیا اور ہر مخلوق سے پوری طرح واقف ہے تمہارے لیے وہی سبز درخت سے آگ پیدا کرتا ہے۔ پھر تم اُس سے آگ جلاتے ہو"

متعدد مفسرین کا قول ہے کہ دو درخت ہوتے ہیں، ایک کا نام "مرخ" اور

دوسرے کا نام "عفار" ہے جو شخص ان سے آگ نکالنا چاہے، وہ ان دونوں سے مسواکوں کے برابر دو سر سبز ٹہنیاں کاٹ لیتا ہے، ان سے خواہ پانی کے قطرے گر رہے ہوں لیکن اگر مرخ کو عفار پر رگڑا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان دونوں میں سے آگ نکل آتی ہے ان میں سے اول الذکر درخت نر اور موخر الذکر مادہ کہلاتا ہے۔

عرب کہتے ہیں کہ ہر درخت میں آگ ہوتی ہے اور مرخ اور عفار کو سب پر امتیاز حاصل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عناب کے سوا ہر درخت میں آگ ہوتی ہے۔ فَاِذَا اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ۔ کا اشارہ چقماق کی طرف ہے۔

اہل لغت جوہری وغیرہ نے کہا ہے کہ زند (چقماق) اس چیز کو کہتے ہیں، جسے رگڑنے سے آگ نکالی جاتی ہے اور یہ اوپر کی چیز کا نام ہے نیچے کی چیز کو زندہ کہتے ہیں، اور اس میں سوراخ ہوتا ہے۔ یہ نیچے والا چقماق مادہ کہلاتا ہے یہ جمع ہو جائیں تو زندین (دو چقماق) کہلاتے ہیں۔

دونوں کو رگڑنے سے جو نرم اجزاء نکلتے ہیں جن سے آگ نکلتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ جس طرح مرد اور عورت کے مادہ سے بچہ تولد ہوتا ہے اسی طرح آگ بھی نر اور مادہ سے خارج ہونے والے مواد ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

مادہ کو نر سے رگڑنے اور اس سے ٹکرانے کی وجہ سے ان دونوں میں حرارت پیدا ہوتی ہے جس سے ان دونوں کے مواد تحلیل ہو کر آگ پیدا کرتے ہیں۔

[illegible] کہ جس مقام پر [illegible] گرتا ہے وہ رحم کی شکل کا ہوتا ہے اور [illegible] آگ کو [illegible] بنتا ہے، جسے [illegible] (صوفان) کہا جاتا ہے اور [illegible] کی بہ نسبت زیادہ سرعت کے ساتھ آگ پکڑ لیتا ہے اور جس طرح

بعض اوقات عورت کے رحم میں لوتھڑا نہیں بنتا۔ اسی طرح چقماق میں بھی لوتھڑا نہیں بنتا۔

اب دیکھیے کہ آگ زندین (چقماقوں) کی جنس میں نہیں ہے بلکہ اور سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے حیوان کا تولد پانی اور کیچڑ سے ہوتا ہے۔

حیوان متوالد و حیوان متولد

حیوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم متوالد حیوان کی ہے، مثلاً انسان چوپائے وغیرہ جو ماں اور باپ سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسری قسم متولد حیوانوں کی ہے، جو میوہ و سرکہ وغیرہ سے پیدا ہوتے ہیں یا مثلاً جوئیں جو جلدِ انسانی کی میل کچیل سے پیدا ہوتی ہیں، یا چوہے، پسو وغیرہ جو پانی اور مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس قسم کے دوسرے حیوان۔

حیوانات، نباتات، معدنیات، بارش اور چقماق وغیرہ سے پیدا ہونے والی آگ اور دیگر مخلوقاتِ الٰہی کے متعلق لوگوں کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا ان چیزوں کی جنسیں حادثﷲ ہوتی ہیں اور جس طرح منی سے خون بستہ اور خون بستہ سے لوتھڑا بنتا ہے، اسی طرح یہ چیزیں بھی ایک جنس سے دوسری جنس میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ یا صرف ان کے اعراض حادث ہوتے ہیں اور اعیان جو درحقیقت جواہر ہیں، اجتماع، افتراق، حرکت اور سکون کی صفاتِ حادثہ کے سوا قائم و باقی ہوتے ہیں۔

اس کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ اجسام ان جواہر منفردہ سے مرکب ہیں جن کے

ﷲ کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا اس کا حدوث کہلاتا ہے۔

اجزاء علیحدہ نہیں کیے جا سکتے۔ بہت سے اہلِ کلام کا یہی قول ہے

نظام سے مروی ہے کہ اجسام جواہر غیر متناہیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اجسام جواہر سے مرکب ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کو حادث نہیں کرتا جو اپنی ذات پر قائم ہو، اعراض یعنی اجتماع، افتراق، حرکت، سکون وغیرہ حادث ہوتے ہیں، ان میں سے جو لوگ احداث جواہر کے بھی قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ابتداءً حادث بنایا ہے لیکن اس کے بعد ان میں حدوث نہیں ہوتا۔ صرف ان کے اعراض میں حدوث ہوتا ہے۔

اکثر معتزلہ جہمیہ اور اشعریہ وغیرہ کا قول یہی ہے، اور ان لوگوں میں سے بعض اکابر کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا اجماع اور عقیدہ اسی قول پر ہے، حالانکہ سلف امت بلکہ جمہور امت میں سے کسی نے یہ قول پیش نہیں کیا اور بعض جمہور امت ہی نہیں بلکہ اہلِ کلام کی بعض جماعتوں نے بھی جوہر فرد اور اجسام کے جواہر سے مرکب ہونے سے انکار کیا ہے۔

ابنِ کلاب نے بھی جو ایک جماعت کا امام ہے جوہر فرد سے انکار کیا ہے۔ ابوبکر بن فورک نے مقالات ابنِ کلاب کے متعلق ایک کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس نے اس بات کا ذکر کیا ہے اور اشعری کے ساتھ ان کا جو اختلاف ہے، اس کے چہرے سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ ہشامیہ، ضراریہ اور بہت سے کرامیہ اور نجاریہ نے بھی جوہر فرد سے انکار کیا ہے۔

تماثل اجسام و جواہر منفردہ: جو لوگ کہتے ہیں کہ اجسام جواہر منفردہ سے مرکب ہیں، ان کا یہ قول مشہور ہے کہ جواہر متماثل ہیں۔ بلکہ وہ یا ان میں سے اکثر کہتے ہیں کہ اجسام بھی متماثل ہیں، کیونکہ وہ جواہر متماثلہ سے

مرکب ہیں اور اگر ان میں اختلاف ہے تو وُہ اختلاف اعراض کی وجہ سے ہے اور یہ صفات چونکہ عارض ہیں لازم نہیں ہیں۔ اس لیے وُہ تماثل کی نفی نہیں کرسکتیں، تماثل کی تعریف یہ ہے کہ دو متماثل اشیاء میں سے کسی ایک کے متعلق جو بات جائز ہو وُہ دوسری کے متعلق بھی جائز ہو، ایک کے لیے جو چیز واجب ہو، وُہ دوسری کے لیے بھی واجب ہو اور ایک پر جو چیز ممتنع ہو وُہ دوسری پر بھی ممتنع ہو۔ اب چونکہ اجسام جواہر سے مرکب ہیں، اس لیے اگر ایک جسم کے لیے کوئی حکم ثابت ہو جاتے تو لوگ تماثل کی بناء پر کہتے ہیں کہ یہ حکم جمیع اجسام کے لیے ثابت ہے۔

اکثر عقلاء اس سے انکار کرتے ہیں اور ان میں سے بعض بلند پایہ اور بلند خصال اصحاب نے ان دلیلوں کا ابطال بھی کیا ہے جو تماثل کے متعلق پیش کی گئی ہیں۔ چنانچہ رازی اور آمدی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی نسبت متعدد مقامات پر شرح بسط کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔

اشعری نے کتاب "الابانہ" میں تماثل اجسام کے قول کو معتزلہ کے ان اقوال میں شمار کیا ہے جو ان کے نزدیک غلط ہیں۔ یہ لوگ جہمیہ یا قدریہ کے اصول پر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض مشیت سے دو متماثل اجسام میں سے ایک کو بعض اعراض سے مختص کرتا ہے اور دوسرے کو نہیں کرتا۔ جنسوں کا بدل جانا محال ہے۔ کوئی جسم عرضًا و جنسًا دوسری جنس میں منقلب نہیں ہوسکتا، اگر یہ کہیں کہ اجسام مخلوق ہیں اور مخلوق دوسری جنس سے منقلب ہوتی ہے تو جنسوں کا انقلاب لازم آتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بچہ جو رحم سے پیدا ہوتا ہے، میوہ جو درخت سے حاصل ہوتا ہے، اور آگ جو چقماق سے نکلتی ہے، یہ سب چیزیں جواہر ہیں جو اس مادہ میں موجود تھے جن سے یہ چیزیں پیدا ہوئیں۔ اور یہ جواہر بعینہٖ باقی ہیں۔ صرف اجتماع، افتراق، حرکت اور سکون سے ان کے صفات میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

اثباتِ صانع کے دلائل

چنانچہ ابو عبداللہ الرازی نے اثبات صانع کے دلائل بیان کرتے ہوئے چار طریقے بیان کیے ہیں۔ ذاتوں کا امکان، ذاتوں کا حدوث، صفات کا امکان، اور صفات کا حدوث، پہلے تین طریقے ضعیف بلکہ باطل ہیں، کیونکہ جن ذاتوں کے حدوث یا امکان یا ان کے صفات کے امکان کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے، ان میں خالق و مخلوق کی تمیز نہیں کی گئی۔ اور ان میں جو دعاوی پیش کیے گئے ہیں، ان پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں کی گئی۔

چوتھا طریق حدوث اشیاء معلومۃ الحدوث ہے اور یہ طریق صحیح ہے قرآن نے یہی طریق اختیار کیا ہے لیکن ان لوگوں نے اس طریق میں بھی بدرجہ غایت کوتاہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے اصل (قدم عالم) کے مطابق حدوث ذات کی شہادت نہیں دی، بلکہ حدوث وصفات ہی پر اپنے سارے استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔

اور قرآن کریم کا طریق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے مخلوق ہے اور وُہ اللہ تعالیٰ کا نشان ہے۔ قرآن کریم میں براہین و آیات موجود ہیں۔ فلاسفہ و متکلمین ان کے ادراک سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ اور اگر کہیں حق وصواب نے ان کا ساتھ دیا بھی ہے تو وُہ ان دلائل کا محض ایک جزو ہے جو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر پیش کیے ہیں۔

کیفیت معاد

اس مقام پر ہمیں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جب ان لوگوں کے نزدیک ابتدائے مخلوقات کی بنیاد جوہر فرد ہے تو معاد (محشر) کی بنیاد بھی لامحالہ یہی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس مقام پر اُن کی دو جماعتیں بن گئیں۔

ایک جماعت کا قول ہے، کہ جواہر معدوم ہو جاتے ہیں اور پھر دوبارہ پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں اور پھر از سرِ نو ان کا اجتماع ہوتا ہے۔

اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ایک انسان کو ایک حیوان کھا لیتا ہے۔ اور پھر اس حیوان کو کوئی دوسرا انسان کھا لیتا ہے، اگر اس انسان کے اجزاء دوبارہ پیدا ہوں تو وہ اس کے اجزاء تو شمار نہ ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ انسان کے اجزاء ہمیشہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ پھر جو انسان دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس کی شکل وہ ہوتی ہے جس سے وہ بوقتِ مرگ متشکل تھا، اگر یہ بات تسلیم کر لی جاتے تو یہ لازم آتا ہے کہ معاد ضعیف صورت پر ہوگا، حالانکہ نصوص اس کے خلاف ہیں اور اگر نشور اس حالت میں نہ ہو بلکہ کسی اور حالت میں ہو تو پھر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ بعض اجسام دیگر اجسام سے بہتر نہ ہوں گے۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انسان میں بعض اجزاء ایسے ہوتے ہیں جن کی تحلیل نہیں ہوتی اور ان اجزاء میں اس حیوان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا جو دوسرے کا لقمہ تر بن گیا ہو۔ حالانکہ جمیع عقلاء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ انسان کا سارا بدن تحلیل ہوتا ہے، اور اس کا کوئی حصہ عمل تحلیل سے مستثنیٰ نہیں رہتا۔ ان لوگوں نے حقیقتِ معاد کے باب میں جو کچھ کہا اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معادِ ابدان کے متعلق فلاسفہ کے شبہات کو اور بھی تقویت پہنچ گئی، اور وہ انکارِ معاد کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ متکلمین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی جو یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ دوسرا بدن پیدا کرتا ہے اور رُوح لوٹ کر اس نئے جسم میں آجاتی ہے۔ اور مقصود بھی صرف رُوح کو عذاب دینا یا راحت پہنچانا ہوتا ہے بدن یہ ہو یا کوئی اور، اس کا مضائقہ نہیں۔

یہ قول بھی ان نصوص صریحہ کے مخالف ہے جن میں اسی بدن کا اعادہ مذکور

ہے۔ یہ عقیدہ رازی کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور اس کی اور اس جیسے دوسرے مصنفین کی کتابوں میں اصول دین کے بڑے بڑے مسائل کے متعلق صحیح قول موجود نہیں ہے جو عقل و نقل کے موافق یعنی شریعتِ نبویؐ اور عقائد سلف صالحین وائمہ کرام کے مطابق ہو۔ رازی اور اس جیسے دوسرے مصنفین کی تصانیف اصلی فلاسفہ اور بدعت طراز متکلمین کی بحثوں سے لبریز ہیں جنھوں نے خلق، بعث، مبدأ اور معاد کے مسائل میں جہمیہ و قدریہ کے اصول کی پیروی کی ہے، اور یہ دونوں طریقے فاسد ہیں کیونکہ ان کی بناء فاسد مقدمات پر ہے۔

سلف صالحین اور جمہور عقلاء کہتے ہیں کہ اجسام ایک حالت سے دوسری حالت میں منقلب ہوتے رہتے ہیں، وہ فلاسفہ اور اطباء سے بھی یہی منقول کرتے ہیں، اور سلف صالحین جمیع فقہاء اور جمہور کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو جس کا حدوث ظاہر ہے، تبدیل کرتا رہتا ہے، اور ایک جسم دوسرے جسم کی صورت اختیار کرتا رہتا ہے اس لیے فقہاء نے اس بات پر بحث کی ہے کہ تغیر حالت سے نجاست پاک ہو جاتی ہے یا نہیں۔ مثلاً سنڈاس کا راکھ میں اور خنزیر وغیرہ کا نمک میں حل ہو جانا کیا حکم رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ منی کو رحم میں خون بستہ کی صورت میں اور اس کے بعد لوتھڑے کی صورت میں تبدیل کرتا ہے۔ درخت سے رطوبتیں خارج کرکے ہوا اور پانی وغیرہ مواد کو ملا کر اپنی مشیئت و قدرت سے میوہ پیدا کرتا ہے۔ بیج کے ایک دانے کو چیر کر اس سے مواد نکالتا ہے۔ جن سے خوشہ اور درخت وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ جب کبھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی چیز کو پیدا کرتا ہے تو وہ اسی طرح پیدا کرتا ہے، آدم علیہ السلام کو کیچڑ سے پیدا کیا۔ کیچڑ کی اصلیت کو گوشت و استخواں وغیرہ اجزائے بدن کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ لوتھڑے کی صورت بدل کر ہڈی اور اس کے علاوہ دیگر اجزائے بدن بنائے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ	اور ہم نے انسان کو مٹی کے نچوڑ سے بنایا۔

طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ''۔ (پ۱۸ع۱)	''پھر ہم نے اسے بنا کر ایک محفوظ مقام پر ٹھہرایا پھر نطفے کو خون بستہ کی صورت دی اور خون بستہ سے لوتھڑا بنایا پھر ہم ہی نے لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں اور ان ہڈیوں کو گوشت کی پوشش عطا کی پھر ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا دیا۔ خدا بڑا برکت والا ہے، جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے۔ اے لوگو اس کے بعد تمہیں مرنا ہے اور پھر قیامت کے دن اٹھنا ہے''۔

چقماق کے بعض اجزاء آگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

''اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ''۔ (پ۲۳ع۴)	''وہ اللہ تعالیٰ جس نے تمہارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی''۔

خود ان اجزاء سے جو شجرِ اخضر سے نکلے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آگ بنائی ہے۔ یہ نہیں کہ شجرِ اخضر میں دراصل آگ موجود تھی۔ درخت میں دراصل کوئی میوہ موجود نہ تھا اور نہ عورت کے پیٹ میں فی الحقیقت کسی بچے کا وجود تھا، بلکہ یہ وجود ایک اور مادہ سے پیدا ہوا جو پہلی حالت سے تبدیل ہو کر اور بعض دیگر مواد سے مل کر ایک نئی چیز بن گیا جب یہ سب وجود کہنہ و بوسیدہ ہو جائے گا اور صرف ریڑھ کی ہڈی کے آخری حصے میں رمقِ حیات باقی ہوگی تو اس کو اسی طرح از سرِ نو پیدا کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ ابنِ آدم کا سارا وجود کہنہ ہو جائے گا، لیکن ریڑھ کی ہڈی کا آخری حصہ (عجب الذنب) زندہ رہے گا۔ ابنِ آدم اسی سے پیدا ہوا اور اسی سے اٹھایا جائے گا۔ انسان جب دوسری مرتبہ اٹھایا جائے گا، تو اس کی وہ نشأۃِ ثانیہ اس زندگی کی طرح نہ ہوگی، کیونکہ یہ ہستی فاسد ہے اور

وُہ فاسد نہیں۔ بلکہ باقی اور دائم ہوگی، اہلِ جنت سے فاسد فضلے بھی خارج نہ ہوں گے۔

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ اہل جنت نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے۔ نہ تھوکیں گے اور نہ ناک جھاڑیں گے صرف یہ ہوگا کہ کستوری کی طرح کا فضلہ ان سے جھڑے گا۔

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ برہنہ پاؤ عریاں اور بے ختنہ اٹھیں گے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔

"کما بدأنا اول خلق نعیدہ وعدا علینا انا کنا فاعلین" (پ ۱۷، ع ۷)	"جس طرح ہم نے پہلے مخلوقات کی ابتدا کی اسیطرح ہم اسے دوبارہ بھی پیدا کریں گے، یہ وعدہ ہمنے اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے اور اس کو ہم ضرور پورا کریں گے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ انسان دوبارہ پیدا ہونے کے وقت مخلوق اور غیر مختون ہونگے! حسن بصریؒ اور مجاہد نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے کہ جس طرح دنیا میں پیدا ہونے کے قبل تم کچھ نہیں تھے اور پیدا کر دیے گئے تھے، اسی طرح قیامت کے دن تم زندہ لوٹائے جاؤ گے۔

قتادہ کا قول ہے کہ مٹی سے انسان کی ابتداء ہوئی ہے، اور اسی کی طرف اس کو لوٹنا ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى" (پ ۱۶، ع ۱۲)	"ہم نے اسی سے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم تم کو دوبارہ بھیجیں گے اور اسی سے ایک مرتبہ اور تمہیں نکالیں گے۔"

نیز فرمایا:

"فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ	اُس میں زندہ رہوگے اور اس میں مروگے

ومنها تخرجون ۔" (پ ۸ ع ۹) | اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔"

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لوگوں کی نشاۃ ثانیہ کو کئی مقامات پر زمین کے مردہ ہو کر دوبارہ زندہ ہو جانے سے تشبیہ دی ہے۔

"وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۔"

(پ ۸ ، ع ۱۴)

"اور وہ اللہ تعالیٰ جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے حتیٰ کہ وہ بوجھل بادل کو لے اڑتی ہیں اور ہم اسے کسی مردہ علاقے کی طرف روانہ کر دیتے ہیں اور اس میں سے اس علاقے پر پانی نازل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہر طرح کے میوہ جات پیدا ہوتے ہیں ہم مردوں کو بھی اسی طرح زندہ کریں گے۔ یہ تمثیلات اس لیے بیان کی جاتی ہیں کہ تم نصیحت حاصل کرو گے۔"

"وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ

"اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہم نے ہر قسم کی اچھی رونیدگی اگا دی! اس لیے کہ جو بندہ ہماری طرف رجوع کرنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ باتیں سامان بصیرت و تذکر بن سکیں ہم نے آسمان سے مبارک پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ باغ اگاتے، اناج پیدا کیا کھجور کے بلند قامت درخت پیدا کیے جن کے گچھے خوب گتھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بندوں کیلیے یہ سب چیزیں روزی کا

الخروج“
(پ ۲۶، ع ۱۵)

باعث ہیں اور ہم نے اسی پانی کے ذریعہ سے مردہ علاقے کو زندہ کر دیا اور مردوں کا دوبارہ زندہ کرنا بھی اسی طرح ہو گا“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْــٴًـا وَ تَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ“

(پ ۱۷، ع ۸)

”اے لوگو اگر تمہیں دوبارہ پیدا ہونے میں شک ہے تو اس بات کی طرف توجہ کرو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے نطفہ، نطفہ سے خون بستہ اور خون بستہ سے پورا بنا ہوا اور ادھورا بنا ہوا لوتھڑا بنایا تاکہ ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت کا ثبوت پیش کریں اور ایک معین مدت تک ہم رحموں میں جو کچھ چاہتے ہیں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں پھر مہیا تک تربیت کرتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم میں سے بعض معمولی عمر سے پہلے مر جاتے ہیں اور بعض نہایت نکمی عمر (بڑھاپے) کی طرف لوٹا کر لائے جاتے ہیں کہ جاننے بوجھنے کے بعد پھر وقوف و شعور رخصت ہو جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ زمین بے حس ہوتی ہے لیکن جب ہم اس پر پانی نازل کرتے ہیں، تو وہ ابھرنے اور بڑھنے لگتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما سبزی اگاتی ہے۔ یہ سب باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ برحق ہے وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے“

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ" (پ ۲۲ ع ۱۴)

"اللہ تعالیٰ وُہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے اور وہ بادل کو پھیلاتی ہیں اور ہم اسے ایک مردہ علاقے کی طرف رُوانہ کر دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں انسانوں کا دوبارہ زندہ ہونا بھی ایسا ہی ہوگا"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جہاں اس بات کی خبر دیتا ہے کہ وُہ مخلوق کو دوبارہ پیدا کریگا اور بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا، اور ایک مرتبہ اور لوگوں کو زمین سے نکالے گا، وہاں یہ بھی بتلاتا ہے کہ معاد ہی مبدأ ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ" (پ ۲۱، ع ۷)

"اور وُہ اللہ تعالیٰ جو مخلوقات کی ابتداء کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا"

نیز وُہ خبر دیتا ہے کہ معاد مبدأ کی طرح ہے:

"وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا اَئِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ؕ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَیْبَ فِیْهِ" (پ ۱۵، ع ۱۱)

"اور کہتے ہیں کہ آیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو پھر از سرِ نو پیدا ہونگے؟ کیا وُہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس خدائے برتر نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر دیا وُہ ان کی طرح کے انسان بھی پیدا کر دینے پر قادر ہے اور اس نے انھیں دوبارہ پیدا کرنے کے لیے ایک میعاد بھی مقرر کر دی ہے"

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا

کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائینگے

"أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا، قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا، أَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ، قُلْ عَسَىٰ أَنْ يَكُونَ قَرِيبًا يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا"

(پ ۱۵، ع ۵)

تو اس صورت میں بھی ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا ایسی ہی کوئی اور مخلوق بن جاؤ جو تمہارے خیال کے مطابق بھی بہت ہی سخت ہو اور اسے زندہ کرنا دشوار ہو تم زندہ ہو کر رہو گے پھر کہیں گے کہ ایسی حالت میں ہمیں زندہ کون کرے گا انہیں کہہ دو کہ تمہیں وہ ذات دوبارہ پیدا کرے گی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا، پھر وہ سر ہلا کر کہیں گے کہ وہ وقت کب ہوگا، ان سے کہنا کہ ممکن ہے کہ وہ قریب ہو یہ وہ دن ہوگا کہ خدا تمہیں پکارے گا اور تم اس کی حمد بجا لاتے ہوئے جواب دو گے اور تمہارا خیال یہ ہوگا کہ قبر میں صرف تھوڑی دیر ہی ٹھہرے ہو۔"

پھر سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

"أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ"

(پ ۲۳ ع ۴)

"کیا جس خدا نے آسمان اور زمینیں بنا لیں، وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کی طرح کے انسان پیدا کر دے، ہاں ضرور قادر ہے اور وہ سب کے پیدا کرنے والا سب کے حالات جاننے والا ہے۔"

نیز فرمایا:

"أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ

کیا وہ اس بات کو نہیں دیکھتے کہ جس اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر دیا اور

يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى بَلٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"	انہیں پیدا کرنے سے اسے کوئی کان محسوس نہیں ہوتی اس بات پر قادر ہے کہ مُردوں کو زندہ کر دے بلاشبہ وُہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

نیز فرمایا:

"اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ"	"خیال تو کرو کہ عورتوں کے رحموں میں جو منی تم پہنچاتے ہو، کیا وُہ تم نے پیدا کی ہے یا ہم نے؟ ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کر دی ہے اور ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری صورتیں بدل ڈالیں اور تمہیں کسی اور صورت میں پیدا کر دیں جسے تم جانتے ہی نہیں ہو۔ اول بار کا پیدا ہونا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ پھر اس سے کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے؟"

ان کی مثل پیدا کرنے پر قادر ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى۔ (پ ۲۶ ع ۴)	"کیا وُہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور ان کو پیدا کرنے سے ان بھی محسوس نہیں کی وُہ مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

لوگوں میں اس امر کے متعلق نزاع واختلاف نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں دوسری مرتبہ ان کی امثال پیدا کرتا ہے، کیونکہ یہ ایک امر مشاہدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک قرن کے بعد دوسری قرن پیدا کرتا ہے۔ والدین سے بچہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس کو

نشأۃ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ لوگ اس نشأۃ کو جانتے ہیں اور اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کی ہے کہ دوسری نشأۃ پر قادر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ" (پ ۲۷ ع ۱۵)

"نشأۃ اولیٰ کو تو تم جانتے ہی ہو، تو پھر اس سے نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے؟"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ" (پ ۲۳ ع ۴)

"اور ہمارے لیے مثال بیان کی ہے، اور اپنی پیدائش کو فراموش کر دیا، کہنے لگا ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ اے رسولؐ! اس سے کہہ دے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا، جس نے پہلی مرتبہ انھیں پیدا کیا اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔"

پھر فرمایا:

"يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ" (پ ۱۷، ع ۸)

"اے لوگو! تمہیں دوبارہ اٹھنے کے متعلق شبہ ہے تو اس حقیقت کی طرف توجہ کرو کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پھر نطفے سے، پھر خون بستہ سے اور پھر لوتھڑے پیدا کیے ہوئے اور ادھورے پیدا کیے ہوئے، لوتھڑے سے بنایا۔ یہ مثال اس لیے بیان کی گئی ہے کہ ہم تمہارے سامنے دوبارہ اٹھنے کی حقیقت واضح کر دیں۔"

اور اسی لیے "علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فیما لا تعلمون" فرمایا[۱]

---

[۱] اس آیت کا ترجمہ صفحہ ۳۵ سطر ۱۰ میں دیکھیں۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِيمَا لَا تَعْلَمُونَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولٰى کی تفسیر حسن بن فضل بجلی اس طرح کرتے ہیں، "ہم تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے کے لیے اس جگہ سے پیدا کریں گے کہ تمہیں اس کا علم نہیں ہے اور جس طریق پر چاہیں گے، پیدا کریں گے نشأۃ اولیٰ کا تو تمہیں علم ہے کہ وہ کیونکر ماؤں کے پیٹوں میں واقع ہوتی ہے۔ نشأۃ ثانیہ ایسی نہ ہوگی، نشأت اولیٰ کے متعلق تو سب کو معلوم ہے کہ انسان اوّل اوّل نطفہ ہوتا ہے۔ پھر خون بستہ کی صورت اختیار کرتا ہے پھر کامل الخلقت لوتھڑا بنتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ یہ نطفہ مرد اور عورت کی منی کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے حیض کے خون سے غذا دیتا ہے جس سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اس پرورش کے ایام میں بچہ تین تاریکیوں میں بند رہتا ہے۔ ایک تاریکی وہ جھلی ہوتی ہے جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، دوسری تاریکی رحم کی، اور تیسری ماں کے پیٹ کی ہوتی ہے۔

نشأۃ ثانیہ میں لوگ عورت کے پیٹ میں نہ ہوں گے اور نہ خون سے غذا مہیا ہوگی۔ یہ بھی نہ ہوگا کہ کوئی انسان مرد اور عورت کا نطفہ ہو اور پھر وہ اس نطفہ سے خون بستہ کی صورت اختیار کرے۔ بلکہ نشأۃ ثانیہ مٹی سے ہوگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى (۲۰:۵۵)

"مٹی ہی سے ہم نے تم کو پیدا کیا، دوبارہ ہم تمہیں اسی میں لے جائیں گے اور دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں گے۔"

نیز فرمایا:

"فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ" (۷:۲۵)

"اس میں زندہ رہو گے، اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔"

نیز فرمایا:

"وَاللّٰهُ أَنْبَتَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ

اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے روئیدگی

نَبَاتًا ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا۔ (۹،۲۹)	کی طرح پیدا کیا۔ پھر تمہیں لوٹا کر اسی میں سے ایک مرتبہ اور تمہیں پیدا کرے گا۔

حدیث میں ہے کہ زمین پر مردوں کی منی کی طرح بارش ہوگی اور لوگ قبروں میں اس طرح پیدا ہوں گے جس طرح سبزی اگتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"كَذٰلِكَ الْخُرُوجُ" (ق)	"اسی طرح نکلنا ہوگا"
"كَذٰلِكَ النُّشُورُ" (فاطر)	"اسی طرح اٹھنا ہوگا"
"كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ" (۱۴،۱۸)	"ہم اسی طرح مردوں کو زندہ کرتے ہیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو"

تو معلوم ہوا کہ ان دو نشاتوں کی جنس ایک اور قسمیں دو ہیں۔ ایک لحاظ سے دونوں نشاتیں متفق، متماثل اور متشابہ ہیں اور دوسرے لحاظ سے ان میں تنوع اور فرق ہے یہی وجہ ہے کہ معاد کو مبدأ بھی کہا گیا۔ اور مبدأ کی مانند بھی کہا گیا، اس لحاظ سے کہ مبدأ و معاد دونوں متفق چیزیں ہیں، انہیں ایک چیز ہی سمجھنا چاہیے۔ اور اس لحاظ سے ان دونوں نشاتوں میں فرق ہے۔ معاد مبدأ کی مانند ہے اور جو چیز بھی لوٹائی جاتی ہے اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

معانی اعادہ پر بحث

اعادہ کے لفظ کا اقتضا یہ ہے کہ اس میں مبدأ اور معاد ہو، خواہ وہ اعادہ اجسام کا ہو یا اعراض کا، ان میں کوئی فرق نہیں۔ مثال کے طور پر نماز کا اعادہ لے لیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گزرے جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے اسے حکم دیا، کہ دوبارہ نماز پڑھو۔

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ اَعِدْ كَلَامَكَ (اپنے کلام کو دہراؤ) فُلَانٌ فَقَدْ أَعَادَ

کلام فلان بعینہٖ ۔ (فلاں شخص نے فلاں کے کلام کو بعینہ دہرایا) فلان یعید الدرس (فلاں شخص سبق کو دہرا رہا ہے) کلام وہی ہے اگرچہ دوسرے شخص کی آواز و حرکت پہلے کی آواز و حرکت نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات فرمایا کرتے تھے تو اسے تین مرتبہ دہرایا کرتے تھے اگرچہ اسے کسی حد تک مثل سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، لیکن عموماً ایسے مواقع پر مثل کا اطلاق نہیں ہوتا، حتیٰ کہ جو شخص کسی دوسرے کی بات نقل کرتا ہے، اس کے متعلق کہا جاتا ہے ھٰکَذَا قَالَ فُلَانٌ (فلاں شخص نے یہی کہا) اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی مثل کہا، اسی طرح فعل ھذا عوداً علی بدءٍ (ایک دفعہ کرنے کے بعد پھر یہ کام کیا) بئرِ بدی اور بئرِ عادی کے نام بھی اسی نسبت سے پڑے ہیں، اول الذکر وُہ ہے جس سے ابتداء کی جاتے اور موخر الذکر وُہ ہے جس پر اعادہ کیا جائے۔

بئر عادی کا نام قوم عاد کی نسبت سے پڑا ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات کا قول ہے۔ کہا جاتا ہے استعدتہ الشی فاعادہ (میں نے اس سے درخواست کی کہ وُہ یہ کام دوبارہ کرے تو اس نے وُہ کر دیا) عادت کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ عادہ، اعتادہ اور تعودہ۔ ان سب کے یہی معنی ہیں، کہ اس کی عادت بن گئی۔ وعود کلبہ الصید فتعودہ۔ (اور اس نے اپنے کتے کو شکار کی عادت ڈالی تو اس کو عادت ہوگئی۔

عادت، معاودت سے ہے اور معاودت کے معنے پہلے کام کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ بہادر آدمی کو معاود کہا جاتا ہے، کیونکہ وُہ بار بار جنگ کرتا ہے اور تھکنے میں نہیں آتا۔ عاودتہ الحمّٰی (اسے باری کا بخار آتا ہے) عاودہ بالمسئلہ (اس سے بار بار سوال کیا) جنگ وغیرہ میں کسی قوم کے تعاود کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہر فریق اپنے ساتھی کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے۔ عواد اس کھانے کو کہتے ہیں، جس میں سے کچھ ایک مرتبہ کھا لیا جائے، اور باقی کھانا دوبارہ سامنے

لایا جائے۔ اور عوادِ کے معنی ہیں واپس آ۔ جس طرح نزال بمعنی انزل (اتر جا) آتا ہے ان تمام مقامات میں اعادہ کا لفظ بہ اعتبار حقیقت استعمال کیا گیا، کیونکہ دوسری مرتبہ بھی حقیقت وہی ہے۔ جو پہلی مرتبہ تھی اگرچہ شخصیتیں متعدد ہوں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے۔ ھو مثلہ (وہ اس کی مثل ہے) اور ھذا ھو ھذا (یہ وہی ہے) اور یہ دونوں صحیح ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے اعتبار سے جو اس وجود سے مختص ہے، اس سے دو فاعلوں کے درمیان کی قدر مشترک مراد نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی دوسرے شخص کے کام کی مثل کوئی کام کرے گا تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اس کام کو دہرایا ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس نے اس کے مشابہ کام کیا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص کوئی ایسا فعل دوسری مرتبہ کرے جو وہ ایک مرتبہ کر چکا ہے تو کہا جائیگا کہ اس نے اپنے کام کا اعادہ کیا ہے اسی طرح جب کوئی شخص دوسرے شخص کے کلام کا اعادہ کرے گا تو کہا جائے گا، اس نے اس کا اعادہ کیا ہے، اور جو شخص اپنی طرف سے ویسا کلام پیدا کر کے کہے، اس کو اعادہ نہیں بلکہ مثل کہا جائے گا۔ کہا جاتا ہے۔ قرأ علی ھذا (اس نے یہ پڑھا) اعاد علی ھذا (اس نے اس کو دہرایا) ھذا یقرأ (یہ پڑھتا ہے یعنی درس دیتا ہے) ھذا یعید (یہ دہراتا ہے) اگر کوئی دوسرا مماثل کلام ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ وہ دہراتا ہے۔ جو شخص انگشتری یا کسی اور ڈھلی ہوئی چیز کو توڑ دے اُسے کہا جاتا ہے، اعدہ کما کان (اسے جیسی تھی ویسی ہی بنا دے) اگر کوئی شخص اس انگشتری کی طرح کوئی اور انگشتری بنا دے تو اس شخص کو معید (دوبارہ بنانے والا) اور انگشتری کو معاد (دوبارہ بنائی ہوئی) نہیں کہا جائے گا۔ اول الذکر کے متعلق کہا جائے گا، کہ یہ بعینہ پہلی ہے اور ثانی الذکر کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ ہر لحاظ سے پہلی کی مثل ہے۔ اسی طرح جو شخص مکان گرا دے اس سے کہا جائے کہ اسے دوبارہ ویسا ہی بنا دے تو اسے مثل نہیں کہا جائے گا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ بعینہ پہلا مکان ہے جو دوبارہ بنایا گیا ہے لیکن اگر اس

مکان کی مثل ایک اور مکان بنا دیا جائے تو کہا جاتے گا کہ یہ پہلے مکان کی مثل ہے اسی طرح کی تمام عبارتیں اس امر پر دال ہیں کہ من وجہ معاد بعینہ مبدأ ہے، اور من وجہ وُہ مبدأ کی مثل ہے۔

اس تفصیل وتشریح سے اس باب میں ذیل کے اعتراضات قطعًا زائل ہو جاتے ہیں:

۱۔ اعادہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہی زمانہ بھی دوبارہ آجائے۔

۲۔ اعادہ عقلاً ممتنع ہے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ پہلی چیز کی مثل لائی جائے

بعض متکلمین کہتے ہیں کہ اعادہ ہرگز خلافِ عقل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس باب میں جس اعادے کی خبر دی ہے وُہ اعادہ معقولہ ہے اور یہی اعادہ ہے جو مشرکین ومسلمین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے مستفاد ہوا اور یہی ہے جس پر لفظِ اعادہ دلالت کرتا ہے اور معاد بعینہ اول ہوتا ہے، اگرچہ لوازم اعادہ اور لوازم ابتداء میں فرق ہو۔ یہ فرق اس امر میں مانع نہیں ہے کہ اول کا اعادہ ہوا، کیونکہ بعض لوگوں کا دعوٰی ہے کہ جسم ثانی جسمِ اول سے ہر لحاظ سے مختلف ہوگا۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نشأۃ ثانیہ ہر لحاظ سے نشاۃ اولیٰ کی طرح ہوگی۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو ایسی حالت میں پیدا کیا، کہ وُہ کچھ بھی نہ تھا، اسی طرح اس کو جب دوبارہ پیدا کرے گا تو اسی وقت جب وُہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں جو انسان مٹی بن جاتا ہے اور اس مٹی سے سبزی اگتی ہے اور اس سبزی کو کوئی دوسرا انسان کھا لیتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس اور جس انسان کو دوسرا انسان یا حیوان کھا لیتا ہے اور اس حیوان کو کوئی دوسرا انسان کھا لیتا ہے، ان میں سے ہر ایک معدوم ہو گیا۔ پہلا انسان بھی مٹی بن گیا اور دوسرا بھی اور یہی حالت پیدا ہونے سے قبل تھی۔ پھر ان دونوں انسانوں کو دوبارہ مٹی سے پیدا کیا جائے گا۔ ان کی ریڑھ کی

ہڈی کا آخری حصہ باقی ہوگا، اسی سے ہر ایک پیدا کیا گیا ہے اور اسی سے اٹھایا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس کا سارا جسم معدوم ہو گیا۔ اب اس مادے سے جس کی حالت بدل چکی ہے دوبارہ پیدا کیا جائے گا، ایک قبر میں ہزار میتوں کی حالت بدل جائے اور وہ مٹی ہو جائیں، جب بھی وہ دوبارہ پیدا کیے جائیں گے اور اس قبر سے اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو ایسی حالت میں اٹھائے گا کہ وہ بالکل نیست ہو چکے ہوں گے۔ جس طرح پہلی مرتبہ وہ عدم محض سے پیدا کیے گئے تھے۔ اور ان ہزار انسانوں کے مٹی ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں اسی قبر سے اٹھائے گا اور اسے اس امر کی ہرگز ضرورت نہیں پڑے گی کہ بار اول کی طرح پہلے نطفہ، پھر خون بستہ اور پھر لوتھڑا پیدا کیا جائے بلکہ ان کی نشأۃ ان اشیائے خورد و نوش کے ساتھ ہوگی جو اس کے جسموں میں بطریق استحالہ[۱] شامل ہو چکی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جس صورت میں کہ ایک انسان نے دوسرے انسان کو کھا لیا ہو، یا ایسے حیوان کو کھا لیا ہو جس نے کسی دوسرے انسان کو کھایا ہو تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو استحالہ کے ایک طریق سے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا کہ پہلے نطفہ پیدا کیا جائے پھر خون بستہ بنایا جائے۔ اور اس سے لوتھڑا ہی ہو۔ پھر اسے حیض کے خون سے غذا بہم پہنچائی جائے اور ماں کے دودھ اور دیگر اشیائے خورد و نوش سے اس کی پرورش کی جائے۔ یہ خیال غلط ہے کہ اعادہ کے لیے ان غذاؤں کا اعادہ بھی ضروری ہے جو مستحیل ہو کر ان کے بدنوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ اس وقت جب انسان نے انسان کو کھا لیا تو دوسری تمام غذاؤں کی طرح یہ اس کی خوراک بن گئی اور ایسی غذاؤں کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ غذائیں جب معدے میں جاتی ہیں، تو وہ انہیں توڑ پھوڑ کر ثرید بنا دیتا ہے جو "کلوس" کہلاتی ہے اور اس کے بعد

---

[۱] کسی جسم کا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونا استحالہ کہلاتا ہے۔ مثلاً نطفہ سے علقہ، علقہ سے مضغہ اور مضغہ سے بچہ اور بچے سے بوڑھا انسان بن جاتا ہے۔ (مترجم)

اور زیادہ گھل کر غذائیں نرم ہو جاتی اور کیموس کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر کیموس پک کر خون بنتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس خون کو سارے بدن میں تقسیم کرتا ہے، بدن کا ہر حصّہ اپنا اپنا حصّہ بانٹ لیتا ہے اور خون کی حالت بدل جاتی ہے، وُہ جزُوِ بدن بن کر ہڈی، گوشت اور رگوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی اس رزق کی حالت ہے۔ جو بدءِ خلق کے وقت نطفہ، علقہ (خون بستہ) اور مضغہ (لوتھڑا) کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اس امر کا محتاج نہیں کہ کسی انسان کو دوبارہ پیدا کرنے کے لیے نطفہ، علقہ اور مضغہ کی صورت دے۔ اسی طرح اسے اس بات کی بھی ضرورت نہیں کہ وُہ لوگوں کی غذاؤں کو بھی میووں اور گوشت کی صورت میں دوبارہ پیدا کرے اور پھر ان سے کیلوس، کیموس، خون، استخوان، گوشت اور رگیں بنائے بلکہ یہ بدن ایک اور حالت میں دوبارہ پیدا ہو گا، جو موجودہ پیدائش کی طرح نہ ہو گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ "ہم تمہیں دوبارہ اس صورت میں پیدا کریں گے جو تمہیں معلوم نہیں"۔

پہلی نشأت کے وقت جس قدر استحالات واقع ہوئے ہیں۔ نشأتِ ثانیہ کے لیے ان میں سے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ وجوہ مذکورہ بالا سے اس اعتراض کا جواب بھی مل گیا کہ بدن کے اجزاء ہمیشہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں، کیونکہ بدن کا تحلل اس بات سے زیادہ عجیب نہیں ہے کہ نطفہ سے علقہ اور علقہ سے مضغہ بنایا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی حقیقت دوسرے سے مختلف ہے اور متحلل جسم کے دوسرے اجزاء پہلے اجزاء سے مشابہ و متماثل ہوتے ہیں۔ جب دوبارہ پیدا کرنے کے وقت جسم کو ایک حقیقت سے دوسری حقیقت میں تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں تو اس انقلاب کی کیا ضرورت ہے جو تحلل کے باعث واقع ہوتا ہے ایک شخص دوسرے شخص کو ایک مرتبہ حالتِ شباب میں دیکھتا ہے اور پھر اس صورت میں دیکھتا ہے

کہ وُہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس استحالہ (تغیر حالت) کے باوجود وُہ معلوم کر لیتا ہے، کہ یہ وہی شخص ہے جسے اس نے جوانی کی حالت میں دیکھا تھا۔ تمام حیوانات و نباتات کی یہی حالت ہے۔ ایک مدت تک ایک شخص ایک درخت سے غائب ہو جاتا ہے، اس کے بعد جب آکر دیکھتا ہے تو پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی پہلا درخت ہے، حالانکہ تحلل و استحالہ تمام حیوانات و نباتات میں بھی اسی طرح ہوتا رہتا ہے جس طرح بدنِ انسانی میں واقع ہوتا ہے۔ ایک انسان عاقل کو یہ سمجھنے کے لیے کہ یہ وہی پہلا درخت ہے اور یہ وُہی گھوڑا ہے جو چند سال قبل اس کے پاس تھا اور یہ وہی انسان ہے جسے بیس سال ہوئے اس نے دیکھا تھا اس بات کی ضرورت نہیں کہ وُہ اصلی اجزاء کو باقی رکھنے پر قادر ہو جو تحلیل نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات کسی کے دل میں کھٹکتی تک نہیں، اس بات کی پہچان اور تمیز بھی نہیں ہو سکتی کہ یہ اجزاء وہی ہیں یا اور ہیں۔ و ربسا اوقات یہ چیزیں چھوٹی ہوتی ہیں اور مرورِ زمانہ پر بہت بڑی ہو جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود عقلائے صرف یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے۔ بلکہ ان تمام درختوں، گھوڑوں اور انسانوں کی طرف اشارہ کر کے بتا دیتے ہیں جنھیں انھوں نے کسی گزشتہ زمانہ میں دیکھا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ چیزیں اس لحاظ سے فلاں چیزیں ہیں کہ نفسِ ناطقہ ایک ہے جیسا کہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ دوسرا بدن پہلے بدن کا عین نہیں ہے، بلکہ مقصود صرف نفس نعمت یا عذاب چکھنا ہے اور بدن جو بھی ہو، اس میں یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی باطل اور قرآن و سنت اور اجماع سلف صالحین کے مخالف ہے اور اعادہ کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں، وُہ بھی اس توجیہ کے خلاف ہیں۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تمام عقلاء کہہ دیتے ہیں کہ یہ گھوڑا وہی ہے اور یہ درخت وہی ہے جو کئی برس پہلے تھا۔ حالانکہ وُہ جانتے ہیں کہ نباتات کا نفسِ ناطقہ ہوتا ہی

نہیں جو اس سے جُدا ہو جائے اور اپنی ذات پر قائم ہو۔ حیوان و انسان کے متعلق بھی وُہ یہی کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دلوں میں یہ خیال تک نہیں گزرتا کہ "یہ اور وہی" کا مشارٌ الیہ نفسِ ناطقہ ہے تو معلوم ہوا کہ عقلاء کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ استحالہ کے باوجود معاد کے وقت جسم وہی ہو گا جو مبدأ کے وقت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوبارہ پیدا شدہ جسم ان اعمال کی گواہی دے گا جو انسان نے دنیا میں کیے ہوں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔" (۳۶ : ۶۵)	"آج ہم اُن کے لبوں پر مہر لگا دیں گے اور اُن کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور جو کچھ وُہ کرتے رہے ہیں، اس کے متعلق ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔"

نیز فرمایا:

"حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔" (۴۱ : ۲۰-۲۱)	"اتنے میں وُہ سب دوزخ کے پاس آ جمع ہوں گے۔ ان کے کان، ان کی آنکھیں اور انکے گوشت پوست انکے اعمال پر گواہی دے رہے ہوں گے۔ اور وُہ اپنے گوشت پوست سے کہیں گے کہ تم نے ہم پر گواہی کیوں دی؟ تو وُہ جواب دینگے کہ اسی اللہ تعالیٰ نے ہم سے باتیں کرائیں جس نے ہر چیز کو ناطق بنایا ہے۔"

یہ سب جانتے ہیں کہ اگر انسان کوئی بات کہے، یا کوئی کام کرے یا کسی اور شخص کو کوئی کام کرتا دیکھے، یا کوئی بات کرتا سنے اور پھر تیس سال کے بعد اپنے قول و فعل کی شہادت دے اور وُہ ایسا اقرار ہو جس کے بموجب اس کا مواخذہ ہو یا اپنے سوا

کسی اور چیز یعنی مال و دولت پر گواہی دے اور اس کے ذریعے سے حقوق کا اقرار کرے تو اس کی شہادت مقبول ہوگی، خواہ اس طویل مدت میں اس کے بدن کی حالت متغیر ہی کیوں نہ ہو گئی ہو۔ کوئی عقلمند آدمی یہ نہیں کہتا کہ یہ گواہی مشہود علیہ کی مثل یا اس کے غیر پر دی گئی ہے۔ اگر مشہود علیہ حیوان یا نبات ہو اور گواہی دینے والے نے کہہ دیا کہ یہ حیوان فلاں شخص نے فلاں شخص سے لیا تھا اور یہ درخت فلاں شخص نے فلاں شخص کے سپرد کیا تھا تو استحالہ کے باوجود یہ شہادت معقول ہوگی اور جب استحالہ غیر مؤثر ہے تو یہ اعتراض محض جہل کا نتیجہ ہے کہ دوبارہ زندگی کے وقت جسم کی حالت مرنے کے وقت کی سی ہوگی، یا وہ جسم موٹا یا دُبلا وغیرہ ہوگا۔ کیونکہ اس نشاۃ ثانیہ کی صورت اس صورت کی مماثل نہ ہوگی جو موجودہ زندگی کی ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ صفات ہی فنا ہو جائیں گی، کیونکہ وہاں نہ تو جسم کی حالت تبدیل ہوگی، نہ کوئی پاخانہ وغیرہ پھرے گا، نہ کھانے پینے سے سیری ہوگی اور نہ کوئی موٹا یا دُبلا ہوگا۔ خصوصاً جنت میں داخل ہونے کے وقت جب ہر انسان اپنے باپ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی صورت میں داخل ہوگا، اہل جنت نہ بول و براز کریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ ناک جھاڑیں گے یہ نشاۃ متضاد خلطوں سے تو ہوگی نہیں کہ اس کا کچھ حصہ دوسرے حصے سے الگ ہو جاتے جیسا کہ اس زندگی میں ہوتا ہے، ان کا کھانا پینا مستحیل (تغیر پذیر) نہ ہوگا، کیونکہ وہ اس دُنیا کے کھانے پینے کی طرح مٹی، پانی اور ہوا سے بنا ہوا نہ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بستی سے گزرنے والے شخص[1] کا کھانا اور پینا سو برس تک سلامت رکھا، اور اس میں کسی طرح کا تسنہ اور تغیر واقع نہیں ہوا تھا، اس سے سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں اپنی قدرت کی طرف توجہ دلائی۔

جب اللہ تعالیٰ اس عالمِ کون و فساد میں طعام (کھجور، انگور وغیرہ) اور پانی وغیرہ

[1] اس بستی اور شخص کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ مشہور روایت کے مطابق اول الذکر القدس، اور موخر الذکر عزیر علیہ السلام ہیں۔ (مترجم)

کو سوسال تک بغیر تغیر کے باقی رکھنے پر قادر ہے تو وُہ اس بات پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے، کہ آئندہ زندگی میں کھانے پینے کی چیزوں کو ایسا بنا دے کہ وُہ تغیر پذیر نہ ہوں۔ اور ان امور کی تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔

چقماق کی آگ کس مادے سے بنتی ہے؟

اس مقام پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ تولد کے لیے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ دو چقماقوں کے درمیان جو ہوا ہوتی ہے اسی کی حالت گرمی کے باعث بدل جاتی ہے اور وُہ آگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے چقماقوں سے کوئی ایسا مادہ خارج نہیں ہوتا جو آگ میں منقلب ہو جاتا ہو۔ کیونکہ اگر رگڑ کے باعث چقماقوں سے کوئی مادہ خارج نہ ہو تو آگ نہیں نکلتی اور مجرد رگڑ سے آگ نہیں نکلتی۔ بلکہ دو چقماقوں میں سے نیچے کی چیز مثلاً صوفان اور حراق پر چنگاری پیدا کی جاتی ہے۔ اور اس پر آگ گرتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ گرنے والی چیز ہے جو بوجھل ہو۔ اگر چقماق کے لوہے اور پتھر کا کوئی ثقیل حصّہ خارج نہ ہو تو آگ نیچے نہیں گر سکتی۔ اگر صرف ہوا منقلب ہو کر آگ بن جاتی تو وُہ نیچے نہ اُترتی۔ کیونکہ ہوا کا خاصہ صعود (اُوپر کو جانا) ہے۔ نہ کہ ہبوط (نیچے اترنا) لیکن جب چقماق سے نکلنے والا مادہ آگ میں تبدیل ہو چکتا ہے تو پاس کی ہوا بھی آگ میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور یہ آگ یا تو دھوئیں کی صورت میں ہوتی ہے یا شعلے کی صورت میں۔

جمیع متولدات (پیدا ہونے والی چیزیں) دو اصلوں سے پیدا کی گئی ہیں جسطرح آدم علیہ السلام مٹی اور پانی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ورنہ صرف مٹی سے جس کے ساتھ پانی ملا ہوا نہ ہو، کوئی جاندار چیز یا سبزی پیدا نہیں ہو سکتی۔ سبزی بھی ساری کی ساری دو اصلوں سے پیدا ہوتی ہے۔ مسیح علیہ السلام بھی مریمؑ اور جبرئیلؑ کی پھونک سے پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا"

(۲۸: ۲۰)

"اور مریم بنت عمران جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی اور ہم نے اس کے پیٹ میں اپنی قدرت سے ایک رُوح پھونک دی۔"

نیز فرمایا:۔

"وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا"

(۱۷: ۶)

"جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی، پس ہم نے اس میں اپنی قدرت کی ایک رُوح پھونک دی۔"

پھر فرمایا:

"فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا۔ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا"

(۱۶: ۵)

"تو ہم نے مریم علیہا السلام کی طرف جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور وُہ ایک پورے آدمی کی شکل میں ان کے سامنے کھڑے ہو گئے، آپ کہنے لگیں کہ میں تجھ سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا ترس ہے تو میرے سامنے سے ہٹ جا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، میں صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا آیا ہوں، اس لیے کہ تجھے ایک پاکیزہ بچہ دوں۔"

مفسرین کا بیان ہے کہ جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم ؑ کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری جو مقامِ ولادت تک پہنچ گئی۔

تولد مسیحؑ کے دو اصل

اس مقام پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام دو اصلوں سے پیدا ہوئے ہیں، ایک نفخِ جبریل سے اور دوسرے اپنی ماں مریمؑ سے۔ اور یہ وُہ نفخ (پھونک) نہیں ہے،

جو چار مہینے گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ جبکہ بچہ لوتھڑے کی صورت میں ہوتا ہے، کیونکہ یہ نفخ ایسے بدن میں واقع ہوتا ہے جو پیدا ہو چکا ہو۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے جب نفخ کیا تھا تو مسیح بالکل پیدا نہیں ہوئے تھے اور نہ مریمؑ حاملہ ہوئی تھیں، بلکہ وُہ نفخ کے بعد حاملہ ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس دعوے کی دلیل ہے:

"قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (الی قولہ) فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا۔" (۱۹:۱۶)

"جبریلؑ نے کہا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں، تاکہ میں تجھے ایک پاکیزہ بچّہ دوں۔ چنانچہ وُہ حاملہ ہوگئیں اور اس حمل کو لیکر وُہ کسی دُور کے مقام پر چلی گئیں۔"

جب جبریلؑ نے پھونکا تو حضرت مریمؑ کو حمل ہوگیا، اسی لیے حضرت مسیح علیہ السلام کو اس نفخ کے اعتبار سے "رُوْحٌ مِّنْهُ" کا خطاب ملا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وُہ قاصد جو اس کی رُوح ہے یعنی جبریل علیہ السلام ہی وُہ رُوح ہیں جس نے حضرت مریمؑ سے خطاب کیا، اور کہا تھا "اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا"

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

"وَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا" (۶۶:۱۲)

"ہم نے اس میں اپنی رُوح پھونکی۔"

اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام اسی رُوح میں سے ایک رُوح ہیں۔ اس لیے وُہ اس اعتبار سے رُوْحٌ مِّنَ اللّٰہِ ہوئے اور مِنْ رُّوْحِنَا میں مِن ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ جب دو اصل باہم ملتے ہیں تو اُن دونوں کے درمیان ایک مادہ ہوتا ہے جو منقلب ہو جاتا ہے اور یہ انقلاب اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ان دو اصلوں میں سے ایک دوسرے سے رگڑا جاتا ہے۔ اندریں حالت

یہ ضروری ہے کہ اس مادے کے اجزا میں کمی واقع ہو۔

تولد نار کے دو اصل

جب چقماق کا لوہا چقماق کے پتھر پر رگڑا جاتا ہے یا درخت درخت سے رگڑ کھاتا ہے تو اس رگڑ سے ایک حرکت پیدا ہوتی ہے، جس کے باعث ان دونوں کے بعض اجزاء کی حالت متغیر ہو جاتی ہے اور ان دونوں کے درمیان جو ہوا ہوتی ہے۔ وُہ گرم ہو کر آگ بن جاتی ہے اور جب ایک چقماق دوسرے پر رگڑا جاتا ہے تو ان میں سے ایک کی قوت رگڑ کے باعث کم ہو جاتی ہے۔ اور آگ ان دو اصلوں سے مستحیل ہو کر پیدا ہوتی ہے، ایک ہوا سے اور دوسرے ان اجزاء سے جو دو چقماقوں کی باہم رگڑ سے خارج ہوتے ہیں سورج اور آگ وغیرہ روشنی بخش چیز کی شعاع اپنی مقابل کی کسی چیز پر منعکس ہوتی ہے تو روشنی حاصل ہوتی ہے۔

لفظ "نور" (روشنی) اور "ضوء" (روشنی) کا اطلاق بعض اوقات ایک جسم قائم بنفسہٖ پر ہوتا ہے۔ مثلاً وُہ آگ جو سر چراغ پر ہوتی ہے۔ اور یہ اس مادے کے بغیر حاصل نہیں ہوتی جو منقلب ہو کر آگ بنتا ہے، مثلاً لکڑی اور تیل۔

ہوا بھی آگ میں مستحیل ہو جاتی ہے اور یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ جس مادے سے آگ کا شعلہ پیدا ہو، اس میں یا چقماقوں میں کمی واقع ہو۔ کبھی نور ضیاء، شعاع سے وُہ شعاع مراد لی جاتی ہے جو آفتاب یا آگ سے زمین اور دیواروں پر پڑتی ہے۔ یہ روشنی عرض ہے قائم بنفسہٖ نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک محل کی ضرورت ہے جس کے ساتھ وُہ قائم ہو اور جو اس کے قابل ہو۔ شعاع کے لیے ایک روشنی بخش جسم کا وجود لابدی ہے اور ایک ایسی چیز کا ہونا بھی ضروری ہے جو اس روشنی بخش چیز کے مقابل ہو تا کہ اس پر شعاع منعکس ہو سکے۔ چراغ سے حاصل ہونے والی آگ کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ جب وُہ آگ میں رکھی جاتی ہے

یا اس میں آگ رکھی جاتی ہے تو اول اول آگ ، مادے یعنی تیل یا لکڑی کو حل کرتی ہے پھر محیط کی ہوا گرم ہو کر مبدل بآتش ہو جاتی ہے اور یہ تبدیلی مادے کے نقصان کے بعد واقع ہوتی ہے اور یہی صورت اس ہوا کی ہے جو آگ میں حرکت پیدا کرتی ہے ۔ مثلاً ہوا چلتی ہے تو لکڑی میں شعلے پیدا ہوتے ہیں ۔ لوہار کی پھکنی کا عمل بھی یہی ہوتا ہے محل آتش یعنی لکڑی کوئلہ وغیرہ میں آگ بننے کی اور تیز ہوا میں آگ کو جنبش دے کر اس کے مناسب مقام پر پہنچانے کی استعداد ہوتی ہے ۔ اس لیے پھکنی وغیرہ کی ہوا آگ کو بھڑکاتی رہتی ہے ۔ بعض اوقات آگ کے پاس کی ہوا کی حالت بھی بدل جاتی ہے ۔ لہیب (شعلہ) دراصل ہوا ہوتی ہے جو آگ میں منقلب ہو جاتی ہے ۔ جس طرح چراغ کے فتیلہ میں لہیب ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب آگ بجھ جاتی ہے تو دھواں پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو آگ سے ملی ہوئی ہوا ہوتی ہے ۔ جس طرح بھاپ پانی سے ملی ہوئی ہوا ہوتی ہے اور غبار مٹی سے ملی ہوئی ہوا ہوتی ہے ۔ کبھی بھاپ کو بھی دھوئیں سے موسوم کیا جاتا ہے ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔

ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ ۔ (۲۴ : ۱۶)	پھر وُہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وُہ دھواں تھا ۔

مفسرین نے "دُخانٌ" کی تفسیر پانی کے بخارات کی ہے ۔ آثار مرویہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کے بخار سے آسمان بنائے ہیں اور وُہ "دخان" (دھواں) ہوتا ہے ۔ اور "دخان" اس ہوا کو کہتے ہیں جس سے کوئی گرم چیز ملی ہو ۔ اگر اس میں پانی نہ ہو تو یہ صرف دُھواں کہلاتا ہے اور کبھی اس میں پانی ہوتا ہے ۔ اس صورت میں اسے دخان بمعنی "بخار" کہا جاتا ہے اور یہ ہنڈیا کے بخار کی طرح ہوتا ہے ۔ بعض اوقات وُہ دخان (دھواں) بھی "بخار" کہلاتا ہے ۔ جس میں پانی نہیں ہوتا ۔ مثلاً جو شخص خوشبو کے لیے کوئی چیز سلگائے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اس نے تبخر" کیا یعنی خوشبودار دھواں پیدا کیا ۔

جوہری کا قول ہے کہ پانی کا بخار وہ ہوتا ہے جو اس سے دھوئیں کی صورت میں بلند ہوتا ہے۔ اور "بخور" اس چیز کو کہتے ہیں، جس کو سلگانے سے خوشبودار دھواں پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن ہوا، آگ اُسی وقت بنتی ہے جس وقت لکڑی اور تیل وغیرہ مادہ جس سے آگ بنتی ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ حیوان کی طرح آگ بھی مادے کے سوا پیدا نہیں ہوتی۔

واحد الاصل مخلوق پر تولد کا اطلاق نہیں ہو سکتا

بتانا یہ مقصود ہے کہ قائم وجودوں میں سے جس چیز کے متعلق بھی "تولد" کا لفظ استعمال کیا جائے گا، یہ ضروری ہے کہ وُہ اصلوں سے بنی ہو اور دونوں میں سے ایک ایک حصہ جدا ہو کر بنی ہو جب کھانے اور پینے سے سیر ہونے یا رُوح نکلنے وغیرہ اعراض کے متعلق کہا جائے کہ وُہ متولد ہیں تو جن امور کے متعلق یہ لفظ استعمال کیا جائے گا، وُہ سب دو اصلوں سے ہوں گے۔ لیکن عرض محل کا محتاج ہوتا ہے، اس مادے کا محتاج نہیں ہوتا جو عرض میں منقلب ہو۔ اس کے خلاف اجسام موادسے پیدا ہوتے ہیں، جو دوسری نوع میں منقلب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً پانی سے خون بستہ، پھر لوتھڑا اور پھر جاندار چیز پیدا ہوتی ہے۔ نباتات بھی اسی طرح حالت بدلتی ہیں۔ اور جو مخلوق ایک اصل سے ہو، وُہ اگرچہ مادے سے پیدا ہوتی ہو، لیکن متولد نہیں کہلاتی۔ مثلاً حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئیں، اگرچہ وُہ اس مادے سے پیدا ہوئیں جو آدم علیہ السلام سے لیا گیا۔ لیکن اس واقعہ کو تولد نہیں کہا جائے گا۔ یہ کوئی نہیں کہے گا کہ آدم علیہ السلام نے حوّا کو جنا، یا وُہ حوا کے باپ ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم سے پیدا کیا۔ جس طرح آدم کو کیچڑ سے پیدا کیا۔ مسیح علیہ السلام کے متعلق البتہ کہا جاتا ہے کہ مریم علیہا السلام نے انھیں جنا اور مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے بیٹے ہیں، کیونکہ مسیح علیہ السلام مریم علیہا السلام کے جزو تھے۔ اور وُہ مریمؑ کے

پیٹ میں رُوح پھونکنے کے بعد پیدا کئے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَرْيَمَ ابْنَةَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ۔ (۶۶: ۱۲)

اور مریم بنت عمران جس نے اپنے ناموس کی حفاظت کی تو ہم نے اس کے پیٹ میں اپنی قدرت سے رُوح پھونک دی اور وُہ اپنے رب کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کرتی رہی اور وُہ فرمانبردار بندوں میں سے تھیں۔

دوسری آیت یوں ہے:

فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (۲۱: ۹۱)

تو ہم نے ان میں اپنی قدرت سے رُوح پھونکی اور انھیں اور ان کے بیٹے کو دُنیا جہان کے لوگوں میں سے ایک نشان بنا دیا۔

اور حوا علیہا السلام کو تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے مادہ سے اسی طرح پیدا کیا، جس طرح آدم علیہ السلام کو مادۂ ارضی سے پیدا کیا۔ پانی اور مٹی سے صورت بنائی گئی اور ہوا نے اُسے خشک کر کے بجتی ہوئی مٹی بنا دیا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاتا کہ "آدمؑ نے حوّا کو جنا" اور نہ آدم کو مٹی نے جنا اور مسیح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں مریمؑ نے جنا۔ یہ تولد دو اصلوں سے تھا، ایک اصل مریم اور دوسری نفخ جبریل۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا۔ قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا۔

تو ہم نے انکی طرف جبریل علیہ السلام کو بھیجا اور وُہ انکے سامنے ایک پورے آدمی کی صورت میں آکھڑے ہوئے اور مریم، کہنے لگیں اگر تم پرہیز گار ہو تو میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ جبریلؑ نے کہا میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا آیا ہوں تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ بچہ دوں۔ وُہ

قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا۔ (۱۶ : ۵)	بولیں میرے ہاں لڑکا کیونکر ہو سکتا ہے مجھے تو کسی بشر نے چھوا بھی نہیں اور میں بدکار بھی کبھی نہیں ہی، جبرئیل نے کہا جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی ہوگا، تمہارا رب کہتا ہے کہ تمہارے ہاں بے باپ کے لڑکا پیدا کرنا ہم پر آسان ہے اور اس کے پیدا کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہم اسکو لوگوں کے لیے ایک نشان بنائیں اور دنیا میں اپنی رحمت کا ذریعہ قرار دیں اور یہ بات فیصل ہو چکی ہے، پس مریم کو حمل ہوگیا اور وہ اسے لیکر ایک دور کے مکان میں چلی گئیں علیحدہ بیٹھ گئیں۔

نفخ کے بعد حضرت مریم علیہا السلام کو حمل ہوا، مدت تک نفخ کے بغیر حمل نہ ہوا تھا۔ پھر اس حمل میں روح حیات پھونکی گئی، حمل کے لیے نفخ اور روح حیات کے لیے نفخ میں فرق ہے تو معلوم ہوا کہ قائم بنفسہٖ وجودوں میں سے کسی وجود سے جب کوئی چیز پیدا ہوگی اور وہ متولد کہلائے گی تو لابدی ہے کہ والد سے کچھ مادہ خارج ہو اور دو اصلوں سے تولد ہوا ہو، اللہ تعالیٰ الصمد ہے اس لیے یہ امر محال ہے کہ اس سے کوئی چیز خارج ہو اور اس کی کوئی بیوی نہیں، اس کا بچہ پیدا ہونا محال ہے۔ شعاع کا تولد، سوچنے سے علم کا تولد، کھانے سے سیری کا تولد اور حرکت سے حرارت کا تولد وغیرہ وجودوں کے تولد نہیں ہیں۔ اعراض کے تولد ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے لیے محل کی اور دو اصلوں کی ضرورت ہے، اس لیے نصاریٰ کے اس قول سے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے، یہ لازم آتا ہے کہ وہ حضرت مریمؑ کو خدا کی بیوی قرار دیں اور وہ جس طرح خدا کے لیے ایک بیٹے کا وجود قرار دیتے ہیں، اسی طرح اس کی بیوی بناتے ہیں، وہ جس معنی میں خدا کے لیے بیٹا موجود ہونے کے قول کی تفسیر کریں، اسی معنی میں بیوی کا موجود ہونا بھی لازم ہو جاتا ہے اور دلائل سے

ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بیوی سے منزہ ہے۔ انہی دلائل سے لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے بھی منزہ ہے تو جب وُہ خُدا کے لیے ایسے اوصاف بیان کرتے ہیں جن سے متصف ہونا اس کی شان سے بعید تر ہے۔ تو ان کے قول کے مطابق خدا کا ان اوصاف سے متصف ہونا لازم آئے گا۔ جن سے متصف ہونا اس کی شان سے کمتر بعید ہے۔ اور یہ بحث شرح وبسط کے ساتھ "الرد علی النصاریٰ" میں آچکی ہے۔

اس سے کسی قدر واضح ہو جاتا ہے کہ:

لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ۔	نہ اس نے کوئی بیٹا جنا اور نہ اسے کسی نے جنا۔

اور:

اَلَاۤ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ۔ (۹۱،۳۷)	خبردار وہ جھوٹ کہتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا جنا ہے۔ اور وہ بالکل جھوٹے ہیں۔

اور:

وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الۡجِنَّ وَخَلَقَهُمۡ وَخَرَقُوۡا لَهٗ بَنِيۡنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ۔	اور جنوں میں سے اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور جہالت سے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراشتے ہیں، وُہ ان اوصاف سے پاک و برتر ہے جو وُہ بیان کرتے ہیں۔ وُہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنیوالا ہے اس کا بچہ کیونکر ہو سکتا ہے اسکی تو بیوی ہی کوئی نہیں اسی نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وُہ ہر چیز سے اچھی طرح واقف ہے۔

ان آیات بینات میں اللہ تعالیٰ نے جن اوصاف سے اپنے آپ کو منزہ قرار دیا اور اپنے متعلق جن امور کی نفی فرمائی ہے وُہ ان تمام انواع پر حاوی ہے، جو اس باب میں بعض قوموں سے مذکور ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ "اتخاذِ ولد" (بیٹا بنانا) کی نفی سے تمام قسم کے اتخاذات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔ (۵:۶۱)	اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور دوست ہیں۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ پھر اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کی پاداش میں تمہیں عذاب کیوں دیتا ہے دراصل تم بھی دیگر مخلوق کی طرح بشر ہو (اللہ) جسے چاہتا ہے بخشتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ آسمانوں اور زمینوں اور انکے مابین کی ساری چیزوں کی ملکیت اسی کیلئے ہے اور سب کو اسی کی طرف لوٹکر جانا ہے۔

سدّی یہود و نصاریٰ کا یہ قول بیان کرتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تیری اولاد میری اولین اولاد ہے۔ میں اسے آگ میں داخل کروں گا اور وُہ چالیس دن تک اس میں رہے گی۔ حتیٰ کہ آگ اس کا دامن اعمال پاک کردے گی اور اس کے گناہوں اور خطاؤں کو نگل جائے گی۔ پھر ندا دی جائے گی کہ بنی اسرائیل میں سے ہر ایک مختون کو (آگ سے) نکال دو" اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے کہ:

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ	اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں، اور اس

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلٰهٍ

(۱۸: ۵)

کے ساتھ کوئی اور معبود شریک نہیں۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ۔

(۱۵: ۱۲)

اور کہہ دو اے رسولؐ! کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو اولاد سے بے نیاز ہے اور مملکتِ دارین کا بلاشرکتِ غیرے بادشاہ ہے، اور وہ کمزور نہیں کہ اس کا کوئی مددگار ہو۔

پھر فرمایا:

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا۔ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيرًا۔

(۱۸: ۱۶)

بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تاکہ وہ تمام جہان کے لوگوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔ آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا وہی مالک ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں۔ ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں اس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا، اور اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُونَ۔ يَعْلَمُ مَا

اور کہتے ہیں کہ رحمٰن کی اولاد بھی ہے حالانکہ وہ پاک ہے، اس کا فرزند کوئی نہیں، البتہ فرشتے اس کے معزز بندے ہیں۔ کسی بات میں وہ اس سے پیش دستی نہیں

بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ۔ وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ۔

(۲۱:۱۷)

کرتے اور ان کا ہر فعل اس کے حکم کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اگلے پچھلے سارے حالات جانتا ہے۔ وہ پسندیدہ لوگوں کے سوا کسی کی سفارش نہیں کرتے اور اس کے رعب جلال سے خائف رہتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی یہ کہے کہ خدا انہیں بلکہ میں معبود ہوں تو ہم اسکو جہنم کی سزا دینگے اور ہم ظالموں کو اسیطرح بدلہ دیتے ہیں

اور فرمایا:

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ۔ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا۔

(۱۳:۱۴)

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ دو معبود نہ بناؤ معبود ایک ہی ہے، اس لیے مجھ ہی سے ڈرو۔ آسمانوں اور زمینوں کے مابین جو کچھ ہے سب اُسی کے لیے ہے۔ اُسی کی فرماں برداری لازم ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا۔

(۱۳:۱۴)

اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال سے وہ بتوں کا حصّہ نکالتے ہیں، حالانکہ وہ اُن کی اصلی حقیقت سے بھی واقف نہیں ہیں۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور اپنے لیے من مانی چیز (یعنی بیٹے)

نیز فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا - اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا - وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا -

(۴:۱۵)

خدا کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا، ورنہ تم قابل ملامت اور راندۂ درگاہ ہوکر جہنم میں پھینک دیے جاؤ گے۔ کیا تمہارے رب نے تمہیں بیٹوں کے لیے خاص کیا اور خود بیٹیاں لیں۔ (یعنی فرشتے) یہ تو تم سخت بری بات کہتے ہو ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے طرز بیان استعمال کیے ہیں تاکہ وہ سمجھیں مگر اس سے ان کی نفرت بڑھتی ہی گئی۔ اے رسولؐ کہدے کہ اگر ان کے قول کے مطابق خدا کے ساتھ اور معبود بھی شریک ہوتے تو انھوں نے صاحب عرش تک پہنچنے کا راستہ کبھی کا ڈھونڈ نکالا ہوتا۔

اور فرمایا:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ - اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ - اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ

اے رسولؐ! ان کفار مکہ سے پوچھو کہ کیا خدا کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے؟ یا ہم نے فرشتوں کو عورت ذات بنایا اور یہ دیکھ رہے تھے؛ یا اپنے دل سے تہمتیں تراشتے ہیں کہ خدا صاحب اولاد ہے یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ کیا بیٹوں کے مقابلہ میں خدا نے بیٹیاں پسند کیں؟ تم کو کیا ہو گیا کہ ایسے بیہودہ حکم لگاتے ہو۔ کیا تمہارے دماغ میں عقل نہیں ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی کھلی سند ہے؟ تم سچے ہو تو اپنی سند پیش کرو۔

إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ إِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ إِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۔ فَإِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ۔ إِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ۔

(۹:۲۳)

ان لوگوں نے خدا میں اور جنات میں ناطہ ٹھیرایا ہے، حالانکہ جنات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وُہ بھی حاضر کیے جائیں گے۔ خدا کی نسبت جیسی باتیں یہ بناتے ہیں، خدا ان سے بالکل پاک ہے۔ البتہ اللہ کے خاص بندے نہ لغو عقیدے رکھتے ہیں اور نہ اُن کو عذاب ہوگا۔ سوتم اور وُہ جنات جن کی تم پرستش کرتے ہو، خدا سے ضد باندھ کر محض اسی کو بہکا سکتے ہو جو جہنم میں جانے والا ہے۔

اور فرمایا:

أَفَرَأَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ إِنْ يَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدٰى ۔

(۵:۲۷)

کیا تم نے لات و عزیٰ اور ایک اور تیسرے بت منات پر کبھی غور بھی کیا ہے کہ ان میں کیا قدرت ہے؟ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ اگر ایسا ہو تو یہ بڑی ہی نامنصفانہ تقسیم ہے۔ یہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیے ہیں خدا نے تو ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں فرمائی۔ یہ لوگ صرف اٹکل اور نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں اور طرہ یہ ہے کہ انکے پروردگار کیطرف سے انکے پاس ہدایت بھی آچکی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۵۳:۲۷)

جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں، وہی تو فرشتوں کو نام دھرتے ہیں کہ وہ عورتیں ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا۔ (۴۳:۱۵)

انھوں نے خدا کے بعض بندوں کو اس کا جزو (یعنی اولاد) قرار دے رکھا

بعض مفسرین "جُزْءًا" کی تفسیر "نَصِيْبًا" (حصہ) اور "بَعْضًا" کرتے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے "جَعَلُوْا لِلّٰهِ نَصِيْبًا مِّنَ الْوُلْدِ" (انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ایک حصہ قرار دیا)

قتادہ و مقاتل سے مروی ہے کہ "جُزْءًا" کے معنی "عدلًا" (برابری کرنے والا) ہیں۔ اور دونوں قول صحیح ہیں۔ سو وہ اس کے لیے اولاد قرار دیتے ہیں اور اولاد اپنے باپ کے مشابہ ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ۔ (۴۳:۱۷)

جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جس کی تہمت وہ خدائے رحمٰن پر لگاتا ہے تو مارے رنج کے اس کے چہرے پر سیاہی دوڑ جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی لڑکیوں کی بشارت مراد ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں ہے وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى (۱۶:۵۸) آیا ہے۔ سو انھوں نے عورت کو رحمٰن کی مثل قرار دیا۔ اور اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزو ٹھہرایا، کیونکہ بچہ اپنے والد کا جزو ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّمَا فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّيْ"

(فاطمہؓ میری لختِ جگر ہے) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهُ بَنِيْنَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔
(۷ : ۱۸)

مشرکوں نے جنات خدا کے شریک بنا ڈالے حالانکہ خدا ہی نے اُن کو پیدا کیا ہے اور انھوں نے بے جانے بوجھے خدا کے بیٹے بیٹیاں تراش لیں۔

کلبی کا قول ہے کہ یہ آیت زنادقہ کے حق میں نازل ہوئی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور ابلیس باہم شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آدمیوں، جانوروں، مواشی اور نور کا خالق ہے اور ابلیس درندوں، سانپوں، بچھوؤں اور ظلمت کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ "انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ قائم کر رکھا ہے"۔ انہی کے متعلق ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ "ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں" وہی کہتے ہیں۔

اور ملائکہ کا نام جن بھی ہے۔ کیونکہ وُہ نظر سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ مجاہد و قتادہ کا قول ہے کہ "زنادقہ کے نزدیک ملائکہ کے ایک قبیلے کا نام جن ہے۔ ابلیس اسی قبیلے میں سے ہے۔ اور یہ قبیلہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیوں پر مشتمل ہے"۔

کلبی کا قول ہے کہ "یہ مردود و ملعون لوگ یہ بھی کہتے ہیں، کہ ملائکہ جن سے پیدا ہوتے ہیں"۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "وَخَرَقُوا لَهُ بَنِيْنَ وَبَنَاتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ" کی آیت کفارِ عرب کے متعلق ہے، جو کہتے تھے، کہ ملائکہ اور اصنام اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور یہود کہتے تھے، کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

عیسائیت کی تردید

اہل عرب میں سے جو لوگ یہ کہتے تھے، کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ ان کی اور ان کے اس قول کی نفی، کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قبیلے میں شادی کی اور اس شادی سے ملائکہ پیدا ہوئے اس امر سے کی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی اور جزو کا ہونا محال ہے۔ کیونکہ وہ "صمد" ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ | اور اس کی کوئی بیوی نہیں۔

اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ولادت کے لیے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے۔ اور اس باب میں اعیان (اجسام) کا تولد، جنھیں جوہر کہا جاتا ہے اور اعراض و صفات کا تولد برابر ہے بلکہ اعیان کا تولد تو اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک والد سے ایک حصّہ علیحدہ نہ ہو۔ سو جب اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی کا ہونا ممتنع ہے تو اس کے لیے اولاد کا ہونا بھی ممتنع ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے نہ ملائکہ میں سے نہ جنوں میں سے۔ اور نہ انسانوں میں سے۔ ان لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا، کہ خدا کی بیوی ہے، اس لیے یہ امر ان کے خلاف حجت ہے۔

اور بعض کفار عرب سے جو یہ عقیدہ مروی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قبیلے میں شادی کی" اوّل تو یہ روایت ہی محل نظر ہے اور اگر ایسا کہا بھی گیا ہے تو اس کا انتفاء بہت سے وجوہ سے معلوم ہو چکا ہے۔ نصاریٰ کا مسیح علیہ السلام کو اور یہود کا عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا بھی اسی طرح وجوہ کثیرہ سے باطل قرار دیا جا چکا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی نفی دو صورتوں سے کی ہے۔

صفۃ اللہ سے مراد ابن اللہ نہیں لی جا سکتی

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عوام نصاریٰ

کے اقوال منضبط نہیں ہیں۔ ان کے علماء کے کلام اور کتابوں میں موجود ہے کہ اقنوم کلمہ نے جسے وہ بیٹے سے موسوم کرتے ہیں، مسیح کا جامہ پہنا، یعنی اس نے مسیح کو اپنی زرہ بنایا، جس طرح انسان قمیص پہنتا ہے، اسی طرح لاہوت نے ناسوت کا جامہ پہنا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور روح القدس ایک خدا ہے۔ کہا گیا ہے کہ وہ پروردگار کو موجود، حی اور علیم سمجھتے ہیں۔ موجود سے باپ، علم سے بیٹا اور حیات سے روح القدس مراد لیتے ہیں۔ یہ بہت سے عیسائیوں کا قول ہے۔ بعض عیسائیوں کا قول ہے کہ پروردگار ہی موجود، عالم اور قادر ہے، اور علم ہی کلمہ ہے۔ جس نے جامہ مسیحیت پہنا ہے اور قدرت روح القدس ہے۔ اس بات پر تمام عیسائیوں کا اتفاق ہے کہ جامہ مسیحیت پہننے والا اقنوم کلمہ ہی ہے۔ اور وہی بیٹا ہے۔ البتہ تدرع (جامہ پہننا) میں اختلاف ہے کہ آیا وہ ایک جوہر ہے یا دو؟ اور کیا وہ ایک نسبت ہے یا دو نسبتیں ہیں۔ حلول و اتحاد کے متعلق بھی ان کے اقوال مضطرب ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اقوال نصاریٰ میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ ان کا انضباط متعذر ہے کیونکہ ان کا قول نہ تو کسی منزل کتاب اور مرسل نبی سے ماخوذ ہے اور نہ وہ معقول عقلاء کے موافق ہے۔ یعقوبی کہتے ہیں کہ "وہ ایک جوہر، ایک طبیعت اور ایک اقنوم بن گیا ہے۔ جس طرح دودھ میں پانی ہوتا ہے۔" نسطوری کہتے ہیں کہ "وہ دو جوہر، دو طبیعتیں اور دو مشیئتیں ہیں، لیکن لاہوت (خدا) نے ناسوت (انسان) میں اس طرح حلول کیا، جس طرح پانی برتن میں حلول کرتا ہے۔" ملکانی کہتے ہیں کہ "وہ دونوں جوہر واحد ہیں، اس کی دو مشیئتیں، دو طبیعتیں یا دو فعل ہیں، جس طرح لوہے میں آگ ہوتی ہے۔" بعض لوگوں کی رائے ہے کہ:

"لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ"

(جو لوگ مسیح ابن مریم کو خدا مانتے ہیں وہ کافر ہیں) میں یعقوبی عیسائی مراد ہیں اور

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (پ ۱۰ - ع ۱۱) (اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے) میں ملکانی مراد ہیں۔ اور "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ" (پ ۶، ع ۱۲)
(جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے، وہ کافر ہو گئے) میں نسطوریوں کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تین اقوال جو نصاریٰ کے تین فرقوں سے منسوب ہیں، وہ سب کہتے ہیں کہ وہی اللہ ہے، اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کا بیٹا ہے۔ "امانت" میں جس پر وہ سب متفق ہیں، اسی طرح درج ہے۔ کہتے ہیں کہ "سچے خدا سے ایک سچا خدا پیدا ہوا ہے۔" "ثالث ثلثہ" (تین میں کا ایک) کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ۔ (پ ۷، ع ۶)

اور جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے عیسےٰ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا، مجھے اور میری ماں کو خدا کے علاوہ دو معبود بناؤ؟ تو عیسےٰ علیہ السلام عرض کریں گے، کہ الٰہی تو پاک ہے مجھ سے کیونکر ہو سکتا ہے، کہ میں ایسی بات کہوں، جس کے کہنے کا مجھے حق حاصل نہیں۔

ابو الفرج ابن جوزی لکھتے ہیں کہ مفسرین نے "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ" کے معنی یہ کیے ہیں، کہ نصاریٰ کے نزدیک معبودیت اللہ تعالیٰ عیسےٰؑ اور مریمؑ میں مشترک ہے۔ ان میں سے ہر ایک معبود ہے۔ ابن جوزی نے زجاج کے حوالے سے لکھا ہے، کہ "غلو" ظلم میں حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق نصاریٰ نے جو غلو کیا ہے، وہ ان کے اس قول سے ظاہر ہے کہ "عیسےٰؑ ہی اللہ ہے" بعض نے کہا کہ "وہ خدا کا بیٹا ہے"

اور بعض نے کہا، کہ "وُہ تین معبودوں میں سے ایک ہے" اس بات پر وُہ علمائے نصارٰی جو "ابن اللہ" کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ "کلمہ بیٹا ہے" اور تینوں فرقے متفق ہیں اور ان کے قول کی لغویت بہت سے عقلی وجوہ کی بناء پر روشن و آشکارا ہے، ایک یہ کہ انبیاء کے کلام میں سے کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت کو خواہ وُہ کلام ہو یا غیر کلام ہو، بیٹے سے موسوم کیا گیا ہو۔ پس ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی صفت کو بیٹے سے موسوم کرنا کلام انبیاء کی کھلی ہوئی تحریف کے مترادف ہے انھوں نے مسیح سے جو یہ قول نقل کیا ہے کہ "باپ، بیٹے اور رُوح القدس کے نام سے لوگوں کا قصد کرو" تو اس میں مسیح علیہ السلام کی مراد بیٹے سے "صفۃ اللہ" یعنی "کلمہ" نہ تھی اور نہ "رُوح القدس" سے مراد اس کی حیات تھی۔ کیونکہ کلام انبیاء سے اس طرح کے معنی کا کوئی منشا ظاہر نہیں ہوتا۔ جیساکہ "ردِ نصارٰی"[1] میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ کلمہ جسے ابن (بیٹا) سے موسوم کیا جاتا ہے، دو صورتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو یہ خدا کی صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے، یا ایک جوہر ہے جو خود بخود قائم ہے۔ اگر وُہ خدا کی صفت ہو تو ان کا مذہب حسب ذیل وجوہ سے باطل ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ صفت معبود نہیں ہو سکتی، جو رزق دیتا ہے، پیدا کرتا ہے، زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے۔ اور مسیح ان کے نزدیک ایسا معبود ہے جو پیدا کرتا، روزی دیتا، زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ سو جب وُہ چیز معبود نہ ہوئی جس کا اس نے جامہ پہنا تو مسیح خود بطریق اولیٰ غیر معبود ٹھہرے۔

---

[1] حضرت مصنف کی یہ کتاب "الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح" کے نام سے چار جلدوں میں چھپ گئی ہے اور ردِ نصارٰی کے باب میں آج تک مسلّم طور پر بہترین اور جامع ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ (مترجم)

۲۔ صفت موصوف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس سے جُدا نہیں ہوتی۔ اگر وُہ (نصاریٰ) کہیں کہ مسیح پر اللہ کا کلام نازل ہوا اور وُہ یہ بھی کہیں کہ وُہ کلمہ وغیرہ ہے تو یہ بات مسیح علیہ السلام اور سارے انبیاء کے درمیان مشترک ہے۔

۳۔ صفت موصوف کی معیت کے بغیر کسی چیز سے متحد و متدرع (جامہ پہننے والی) نہیں ہوتی، اور اگر ایسا ہو تو باپ خود مسیح بن جائے اور نصاریٰ اس بات پر متفق ہیں، کہ مسیح باپ نہیں ہے۔ لہٰذا ان کا قول متناقض ہوا۔ مسیح کو معبود بھی قرار دیتے ہیں۔ جو پیدا کرتا اور روزی دیتا ہے اور اُسے باپ بھی نہیں کہتے جو معبود ہے۔ اور کہتے ہیں کہ معبود ایک ہے۔ ان کے بعض متکلمین مثلاً یحییٰ ابن عدی نے اسے اس مرد کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو طبیب بھی ہو، حاسب بھی ہو اور کاتب بھی ہو، اور اس پر ان میں سے ہر ایک صفت کا اطلاق ہوتا ہے۔ بے شک یہ بات سچ ہے۔ لیکن ان کا قول اس کی نظیر نہیں ہے۔ جب آپ کہیں کہ پروردگار موجود ہے، زندہ ہے، جاننے والا ہے، اور ان میں سے ہر ایک صفت کا اطلاق اس کی ذات پر ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اگر متحد کوئی ایسی ذات ہے جو متصف بالصفات ہے تو ساری صفات اس کے تابع ہوں گی۔ چنانچہ جب زید، طبیب، حاسب اور کاتب کا جامہ پہن لے تو یہ تمام صفات اُس کے ساتھ قائم ہوا (ہوں) گی، اور اگر جامہ پہننے والی چیز (متدرع) ایک صفت ہو اور دوسری صفت نہ ہو تو اس پر وہی اعتراض عائد ہوگا کہ صفت نے اپنے موصوف کی معیت کے بغیر اتحاد و تدرع کر لیا اور اگر یہ کہیں کہ مسیح ایک ذات ہے جس کے ساتھ ایک صفت ہے، اور دوسری نہیں تو افتراق صفتین لازم آتا ہے اور یہ محال ہے، کیونکہ جو صفات ایک موصوف کے ساتھ قائم ہوں اور اس کے لیے ضروری ہوں، وُہ متفرق نہیں ہو سکتیں مخلوق کی صفات میں تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صفت باقی رہے اور دوسری نہ رہے۔ لیکن صفات باری تعالیٰ میں یہ بات نہیں آسکتی۔

۱۳- مسیح خود نہ تو "کلمۃ اللہ" ہے اور نہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت ہے بلکہ وُہ مخلوق ہے جو کلمۃ اللہ سے پیدا ہوئی، اور اس کا نام "کلمہ" اس لیے رکھا گیا، کہ اس کی تخلیق رسم معتاد کے مطابق نہیں ہوئی تھی، بلکہ "کن" سے ہوئی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔	عیسیٰ خدا کے نزدیک آدم کی طرح ہے جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا پھر اُس سے کہا کہ "بن جا" سو وہ بن گیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ذٰلِکَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْہِ یَمْتَرُوْنَ مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحَانَہٗ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔	یہ ہے عیسٰی ابن مریم کی حقیقت اور یہی سچی بات جس میں وُہ جھگڑا کرتے ہیں، خدا کی شان سے بعید ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ وُہ پاک ہے جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وُہ اتنا ہی فرما دیتا ہے کہ "ہو جا" تو وُہ بات ہو جاتی ہے۔

اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ وُہ خود تورات انجیل اور خدا کے سارے کلام کی طرح کلام اللہ ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ خدا کا کلام یا اس کی کوئی صفت خالق، پروردگار اور معبود نہیں ہو سکتی۔ سو جب نصاریٰ نے یہ کہا کہ "مسیح خالق ہے" تو وُہ ایک تو اس لحاظ سے ضالین (گمراہ) پائے کہ انھوں نے اس صفت کو خالق قرار دیا، اور ایک اس لحاظ سے کہ انھوں نے مسیح ہی کو صفت قرار دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مسیح "کلمۃ اللہ" سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کا یہ قول باطل ہے کہ معبود تین ہیں اور صفات تین ہیں حلول

اتحاد کا عقیدہ بھی باطل ہے۔ ان وجوہ اور دیگر دلائل سے ان کے قول کا بطلان بالکل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر وُہ یہ کہتے کہ پروردگار کی صفات اس کے ساتھ قائم ہیں اور اتحاد وحلول کا ذکر نہ کرتے تو یہ عقیدہ جمہور مسلمین کے عقیدہ کے مطابق تھا جو صفات ثابت کرتے ہیں اور اگر وُہ یہ کہیں کہ صفات ایسے وجود اعیان ہیں جو خود بخود قائم ہیں تو یہ ہٹ دھرمی ہے۔ وُہ دو متناقض باتوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ صفات کو تین کے عدد میں محدود کرنا بھی باطل ہے۔ کیونکہ پروردگار کی صفات اس سے زیادہ ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ موجود ہے زندہ ہے، علیم ہے، قدیر ہے۔ لیکن ان کے نزدیک اقانیم صرف تین ہیں جنھیں وُہ صفات قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کبھی تو ان صفات کی تفسیر وجود اور زندگی اور علم سے اور کبھی وجود اور قدرت اور علم سے کرتے ہیں۔ ان کے اقوال میں بیحد اضطراب ہے۔ کیونکہ ان کا قول فی نفسہٖ باطل ہے۔ اور کسی ذی عقل کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر دس نصارٰی جمع ہو جائیں تو ان میں گیارہ اقوال پر باہم اختلاف ہوگا۔ نیز خُدا کے کلمات کثیر ولا متناہی ہیں۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔

پ ۱۶: ع ۳

اے رسولؐ! کہدے کہ اگر میرے پروردگار کے کلمات قلمبند کرنے کیلیے سمندر سیاہی بنا دیے جائیں تو میرے پروردگار کے کلمات ختم ہونے سے قبل سمندر ختم ہو جائیں، اور اگر ہم ان سمندروں کی مثل اور سمندر بھی لا رکھتے جب بھی وُہ کلمات ختم ہونے نہ پاتے۔

یہ جمہور مسلمین وغیر مسلمین کا عقیدہ ہے۔ امت کے سلف صالحین کا بھی یہی عقیدہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی مشیئت سے ہمیشہ باتیں کرتا رہتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ وُہ ہمیشہ کلام پر قادر رہتا ہے لیکن اپنی مشیئت سے ایسا کلام کرتا

ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم اور از خود حادث ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا کلام مخلوق فی غیرہ ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے معنی ایک چیز کے ہیں جو قدیم الوجود ہے۔ ان لوگوں میں سے بعض کا قول یہ بھی ہے کہ "کلام معناً شے واحد ہونے کے باوجود امور متنا ہیہ کا نام ہے" اور انھی میں سے بعض کا قول یہ ہے کہ "کلام ایک حقیقت ہے لیکن اس کی عبارات متعدد ہیں"

ان لوگوں کے نزدیک یہ امر ممتنع ہے، کہ یہ حقیقت خدا کے سوا قائم ہو۔ البتہ وُہ پیدا شدہ عبارات خدا کے سوا قائم سمجھتے ہیں۔ اور یہ محال ہے کہ ان عبارات میں سے کوئی چیز مسیح ہو۔ سو ان لوگوں اور جمہور کے قول کے مطابق یہ امر کہ "مسیح، کلام اللہ" نہیں ہے، اس سے زیادہ ممتنع نہیں ہے، کیونکہ خدا کے کلمات بہت ہیں اور مسیح وُہ سب تو کہاں، ان سب سے پیدا کیا ہوا بھی نہیں ہے، بلکہ وُہ ان میں سے صرف ایک کلمے سے پیدا ہوا ہے اور وُہ اس کلمہ کا عین نہیں ہے۔ کیونکہ کلمہ صفات میں سے ایک صفت ہے اور مسیح ایک وجود ہے جو اپنی ذات کے ساتھ قائم ہے پھر ان پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ "تمہارا علم اور کلمے کو ولد اور ابن (بیٹا) سے موسوم کرنا باتفاق علماء و عقلاء باطل ہے اور یہ کسی نبی سے منقول نہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ علم اور کلام چونکہ اس ذات سے اسی طرح پیدا (متولّد) ہوتے ہیں جس طرح ایک عالم آدمی کے نفس سے پیدا ہوتے ہیں۔ پس اس کی ذات سے علم، حکمت اور کلام کے تولّد کے باعث کلمہ کا نام بیٹا رکھا گیا ہے۔ یہ نظریہ بھی کئی وجوہ سے باطل ہے۔

ہماری صفات حادث ہیں جو ہمارے تعلم، غور و فکر اور نظر و استدلال سے بدلتی رہتی ہیں، لیکن خدا کا کلمہ اور اس کا علم قدیم اور اس کی ذات کے ساتھ لازم ہے۔ سو اس کو تولّد کہنا منع ہے۔ اس سے یہ دعوےٰ لازم آتے گا کہ ہر ایسی صفت جو اپنے

موصوف کے ساتھ لازم ہو، وہ اس موصوف سے پیدا شدہ (متولد) ہوتی ہے اور صفت لازمہ اپنے موصوف کا بیٹا کہلاتی ہے، اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ عقل اور لغات کے لحاظ سے یہ دعوٰے بالکل باطل ہے۔ انسان کی حیات، اس کی باتوں، اور دیگر صفات لازمہ کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ اس کے ابن ہیں اور اس سے متولد ہیں۔ نیز اگر یہ مان لیا جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ خدا کی حیات اور اس کی قدرت بھی اس کے بیٹے ہیں، ورنہ بتایا جائے کہ علم کے تولد اور حیات اور قدرت وغیرہ صفات کے تولد میں کیا فرق ہے۔

۲۔ اگر یہ تولد جواہر اور اعیان کے تولد کے باب سے ہے تو اس کے لیے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے اور اصل ہے ایک جزو کا خروج لابدی ہے۔ رہا ہمارا علم اور ہمارا قول، تو یہ عین (وجود) نہیں ہے جو قائم بنفسہ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی صفت ہو جو موصوف کے ساتھ وابستہ ہو اور ایسا عرض ہو جو ایک محل میں قائم ہو۔ مثلاً ہمارا علم اور ہمارا کلام، تو یہ بھی دو اصلوں ہی سے متولد ہوتا ہے اور اس کے لیے ایک ایسا محل لابدی ہے جس میں اس کا تولد ہو اور ہم میں علم اور کلام صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں کہ اس سے پہلے چند اسباب و مقدمات معرضِ وجود میں آئیں۔ اور فرع کے لیے اصل نہیں۔ اور علم و کلام ایسے محل میں حاصل ہوتے ہیں، جہاں وہ اس سے پہلے نہیں ہوتے۔ اگر آپ کہیں کہ پروردگار کا علم بھی اسی طرح ہے تو یہ لازم آئے گا کہ وہ کسی وقت اشیاء کا عالم نہیں بھی ہوتا، اور اس کے بعد وہ عالم بنتا ہے اور پہلے اس کی ذات متکلم نہیں تھی۔ اور بعد میں متکلم بنی ہے۔ یہ بات جمہور مسلمین و نصاریٰ اور دیگر اہل ملل کے نزدیک کفر ہے۔ مزید برآں یہ بات عقل کے بھی صریح خلاف ہے، کیونکہ جو ذات عالم نہ ہو، اس کا عالم بننا اس وقت تک ممتنع ہے جب تک وہ کسی دوسرے عالم سے استعانت نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ امر ممتنع ہے کہ وہ اپنی مخلوقات سے علم سیکھے علیٰ ہذا القیاس

جو ذات کلام سے عاجز ہو، اس کے لیے بھی کسی ایسی ذات سے مدد لیے بغیر متکلم بننا محال ہے، جو اس کو کلام پر قادر بنا سکے۔ اور یہ بات بھی کسی کی قدرت میں نہیں ہے، کہ وُہ اپنے سارے علوم کو (تولّدًا) پیدا کرے، لیکن بعض علوم اس میں تخلیقًا پیدا کیے جاتے ہیں جن کو وُہ چار و ناچار حاصل کرتا ہے، اور جب ان امور پر غور و فکر کرتا ہے تو اُسے اور علوم بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا بنی آدم میں سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ انسان اپنے سارے علوم کو (تولدًا) پیدا کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک انسان غیر متکلم ہونے کے بعد بطور خود بات چیت کرنا سیکھتا ہے، بلکہ ہر چیز کو وہی ناطق و متکلم بناتا ہے جو خود نطق پر قادر ہے۔

۲۔ اگر وُہ نصاریٰ یہ کہیں کہ پروردگار اپنے علم اور اپنے کلام کا بعض حصّہ خود پیدا کرتا ہے تو ان کا اس علم کو جو کلمہ ہے، مطلق "ابن" (بیٹا) سے موسوم کرنا باطل ٹھہرتا ہے، اور لفظ "ابن" کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے "بعض علم" یا اس کے "بعض کلام" پر ہو جاتا ہے، حالانکہ ان کا دعوےٰ یہ ہے کہ مسیح "کلمہ" ہے اور وُہ مطلقًا اقنوم علم ہے، اور یہ سارا اس سے متولد نہیں۔ اور باتفاق عقلاً یہ سب "ابن" سے موسوم نہیں ہو سکتا۔

۳۔ عالم کے علم اور کلام کو اس کے ولد (بیٹا) سے موسوم کرنا مشہور لغات میں سے کسی میں نہیں پایا گیا۔ اور عقلاً تو یہ بات باطل ہی ہے کیونکہ اس کا علم اور اس کا کلام اسی طرح ہے جس طرح اس کی قدرت اور اس کا علم ہے، پس اگر یہ جائز ہو تو یہ بھی جائز ہو گا کہ انسان کی ساری صفات حادثہ اس سے متولد ہیں، اور ان کو بیٹوں سے موسوم کرنا صحیح ہے۔

تولّد علم سے استدلال

متکلمین قدریہ میں سے جس نے یہ کہا ہے کہ جو علم غور و نظر کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وُہ انسان سے متولد ہوتا ہے۔ تو یہ بات ایسی ہی ہے جیسے اس کا یہ قول ہے کہ بھوک اور پیاس

سے سیر ہونا کھانے اور پینے سے پیدا (متولد) ہُوا ہے۔ پھر جس طرح وُہ بھوک اور پیاس سے سیر ہونے کو اس کا بیٹا نہیں کہتا۔ اسی طرح اسے یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ علم اس کا ابن اور ولد ہے۔ کیونکہ یہ ان اعراض ومعانی کے تولد کے باعث ہے جو انسان کے ساتھ قائم ہیں۔ اور یہ اس کے بیٹے اور اولاد نہیں کہلاتے۔ کسی نے بطور استعارہ یہ کہہ دیا ہے کہ وُہ اس کے فکر کے بیٹے بنات فکرہٖ ہیں لیکن یہ اسی طرح، جس طرح بنات الطریق (رستے کی بیٹیاں اور "ابن السبیل" (رستے کا بیٹا) کہا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد "مسافر" لیا جاتا ہے۔ پانی کے پرندے کو "پانی کا بیٹا" کہا جاتا ہے، اور یہ تسمیہ مقید ہے اور مشہور ہے کہ ان سے مراد وُہ نہیں ہے جو "اب" (باپ) اور "ابن" (بیٹا) والد اور ولد سے سمجھا جاتا ہے۔ انبیاء کے کلام میں بھی یہ بات کہیں نہیں پائی جاتی کہ خدا کی صفات میں سے کسی کو "ابن" سے موسوم کیا گیا ہو۔ جس نے کلامِ انبیاء میں سے کسی حصے کو اس صورت پر محمول کیا ہے، اس نے ان پر جھوٹ باندھا ہے۔ اس بات کا اقرار علمائے نصاریٰ نے بھی کیا ہے۔ ان کے پاس جو تحریرات موجود ہیں، ان میں جو "مسیح" اور "اسرائیل" وغیرہما کے متعلق "ابن" کا لفظ استعمال ہوا ہے تو وُہ صفاتِ خالق میں سے کسی چیز کا نام نہیں، بلکہ مخلوق کا نام ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ وُہ "مکرم ومعظم" تھے۔

۴۔ اس تقدیر پر سوال پیدا ہوتا ہے، کہ جو بات مسیحؑ کو حاصل ہوئی، اگر وُہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور اپنے کلام سے سکھائی، تو یہ بات تمام انبیاء میں مشترک ہے۔ پھر اس بناء پر مسیحؑ کی تخصیص کی کونسی وجہ موجود ہے کہ اسے خدا کا بیٹا کہا جائے اگر بات یہ ہو کہ علم اور کلام معبود ہیں جو مسیح کے ساتھ متحد ہو گئے، تو علم وکلام کو ایسا جوہر ماننا جائے گا جو قائم بنفسہٖ ہو۔ پس اگر وُہ باپ ہوا تو مسیح ہی باپ ہو گا اور اگر علم وکلام کوئی اور جوہر ہوئے تو معبود دو ہوں گے، جو خود بخود قائم (بنفسہٖ) ہوں

سگے۔ ان میں سے ہر ایک صورت صراحتہً ان کے قول کے بطلان وفساد پر دلالت کرتی ہے۔

۵ - ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ جس حقیقت کے ساتھ مسیح مختص ہے۔ وُہ اس کا باپ کے بغیر پیدا ہونا ہے۔ چونکہ نوعِ بشر میں سے اس کا باپ کوئی نہیں اس لیے نصارٰی نے پروردگار عالم کو اس کا باپ بنا دیا۔ نصارٰی نجران نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر مسیحؑ خدا کا بیٹا نہیں ہے تو بتائیں کہ اس کا باپ کون ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ نصارٰی حقیقی بنوّت (بیٹا ہونا) کے مدعی ہیں۔ اور ان کے علماء کے کلام کا جو ذکر آیا ہے، وُہ محض مذہب کی تاویل ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ اس دعوے کی وُہ لغویت، مہملیت اور برائی زائل ہو جائے جس سے عقلِ انسانی متنفر و بیزار ہے۔ ورنہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی اور کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ پس معلوم ہوا کہ نصارٰی نے اُسے خُدا کا بیٹا قرار دیا اور دعوٰے کیا کہ اللہ تعالٰی نے مریم کو حاملہ کیا، اور خدا ہی مسیح کا باپ ہے، اور یہ بات اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک خدا کا کوئی حصہ مریم میں نازل نہ ہو۔ حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالٰی "صمد" ہے۔

عیسائیوں کا قول بعض مشرکین عرب کے قول کے مماثل ہے کہ "اللہ تعالٰی نے جنوں کے ہاں شادی کی اور اس سے ملائکہ پیدا ہوئے" اور جب وُہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے عیسٰیؑ کو بطور برگزیدگی بیٹا بنایا تو ایک فعلی حقیقت ہے اور ان شاء اللہ ہم اس کو باطل ثابت کریں گے۔ اللہ تعالٰی کے قول وَرُوحٌ مِّنْهُ (۴: ۱۷۱) اور روح خدا کی طرف سے) یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالٰی کا کچھ حصہ عیسٰی بن گیا، بلکہ "من" ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمایا،

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي	اور مسخر کیا اس نے تمہارے لیے ان سب

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ (پ ۲۵ ع ۱۸)	چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں، سب اس کی طرف سے ہیں۔

اور فرمایا،

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ (پ ۱۴ ع ۱۳)	اور جو نعمت تمہارے پاس ہے، وہ خدا کی طرف سے ہے۔

جس چیز کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے یا کہا جائے کہ "وہ چیز اس سے ہے" تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں، اگر وہ ایسا وجود ہو جو خود بخود قائم ہو تو وہ خدا کا مملوک ہوگا اور "من" ابتدائے غایت کے لیے ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا۔ (پ ۱۶ ع ۵)	سو ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا۔

اور مسیح علیہ السلام کے متعلق "وَرُوْحٌ مِّنْهُ" فرمایا، اور اگر وہ صفت ہو جو خود بخود قائم نہیں ہوتی۔ تو یہ اس کی صفت ہوگی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے "کلام اللہ" (خدا کا کلام) اور "علم اللہ" (خدا کا علم) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (پ ۱۴ ع ۲)	اتارا ہے اسے پاک روح یعنی حضرت جبریل علیہ السلام نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ۔

اور فرمایا،

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ پ ع ۱	اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن بھی فی الحقیقت میرے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے۔

مصادر کے الفاظ مفعولوں کے مایۂ تعبیر ہوتے ہیں، "مامور بہ" کو "امر" سے "مقدور" کو "قدرت" سے "مرحوم بہ" کو "رحمت" سے، اور "مخلوق بالکلمہ" کو "کلمہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سو جب مسیح کے متعلق یہ کہا جائے، کہ وُہ "کلمۃ اللہ" ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ "وُہ اللہ کے کلمہ سے پیدا کیا گیا ہے" پھر یہ کہ وُہ طریق معتاد پر نہیں، بلکہ "کن" کہہ کر پیدا کیا گیا ہے۔ ورنہ عیسیٰؑ ایک بشر ہے جو خود بخود قائم ہے۔ وُہ صفت کلام نہیں ہے جو متکلم کے ساتھ قائم ہو۔

امر اللہ کی تشریح

علیٰ ہذا القیاس جب مخلوق کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وُہ "امر اللہ" ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے امر سے پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (۱۶ : ۱)	خدا کا حکم یعنی روزِ آخرت آکر رہے گا تم اس کے لیے جلدی نہ کرو۔
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ۔ (۱۱ : ۸۲)	سو جب ہمارا امر یعنی عذاب آیا توہم نے اسے زیر و زبر کر دیا اور اس پر کھرنجے کے پتھر برسائے۔

سو یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ "احد" اور "صمد" ہے۔ اس کی تقسیم و تجزی غیر ممکن ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کا کچھ حصّہ اُس کے غیر میں تبدیل ہو جائے خواہ اس حصے کا نام رُوح ہو۔ یا کچھ اور۔ اس کا حکم ایک ہی ہے، اس لیے نصاریٰ کا یہ وہم باطل ہے کہ "عیسےٰؑ خدا کا بیٹا ہے" اور یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ وُہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ قوم نصاریٰ اس

طرح گمراہ ہوگئی کہ ہم سے پہلے ایک لغت تھی، جو لفظ "رب" (پروردگار) کو "اب (باپ) سے اور "عبد مربی" (تربیت یافتہ بندہ) کو جو پروردگار سے تربیت پاتا اور اس کی خدمت کرتا ہو۔ "ابن" (بیٹا) سے تعبیر کرتی تھی۔ چنانچہ مسیح نے کہا کہ "لوگو! باپ، بیٹے اور رُوح القدس کا قصد کرو"، یہ کہہ کر مسیح نے لوگوں کو حکم دیا، کہ وُہ خدا پر ایمان لائیں، اس کے بندے اور رسول یعنی مسیح کو مانیں اور رُوح القدس یعنی جبرئیل پر بھی ایمان لائیں۔ یہ نام خدا کے اور اس کے ملکی رسول (جبریل) اور بشری رسول (عیسےٰؑ) کے لیے مخصوص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔ (۱۷:۱۷)	اللہ تعالیٰ فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیغمبر انتخاب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں یہ خبر دی ہے کہ اس نے مسیحؑ کو رُوح القدس کی تائید عطاء فرمائی۔

رُوح القدس کی تعبیرات

رُوح القدس، جمہور مفسرین کے نزدیک حضرت جبرئیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ وَقَفَّیْنَا مِنْ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (۱:۱۱)	اور البتہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے پیغمبر بھیجے۔ اور ہم نے عیسےٰ ابن مریم کو کھلے کھلے معجزے دیے اور پاک روح یعنی جبریلؑ کے ذریعے سے ہم نے اس کی تائید کی۔

جمہور مفسرین کے نزدیک "روح القدس" حضرت جبریلؑ ہیں، ابن عباسؓ،

قتادہ، ضحاک، سدی وغیرہ کا قول یہی ہے، اور اس قول کی دلیل یہ ہے :-

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ (۱۶:۲)	اور جب ہم کسی آیت کی جگہ دوسری آیت بدل کر لاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے منزلات کی حکمت و مصلحت سے خوب واقف ہوتا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ تو افترا پرداز ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر خود بے علم ہیں۔ اے رسول ان سے کہو کہ اسے روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو مضبوط کرے اور یہ مسلمانوں کے لیے ہدایت و بشارت ہے۔

ضحاک نے ابن عباس سے روایت کی ہے، کہ "روح القدس" ایک "اسم" ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے"۔ عبدالرحمٰن ابن زید بن اسلم سے مروی ہے کہ "وہ انجیل ہے"۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۲۸:۳)	یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان نقش کر دیا اور اپنی روح سے ان کی تائید کی۔
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا، مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ (۶:۲۵)	اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح وحی کی تجھے تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کس حقیقت کا نام ہے؟ لیکن ہم نے اس روح یعنی قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، راہِ ہدایت دکھاتے ہیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ (۲:۱۴)

وُہ اپنے حکم سے فرشتوں کو وحی دے کر اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہتا ہے بھیجتا ہے۔

سو اللہ تعالیٰ جو چیز اپنے انبیاء کے قلوب میں نازل کرتا ہے اور جو ایمان خاص سے اُن کے دلوں کو زندہ کرتی ہے اس کا نام اس بزرگ و برتر ذات نے "رُوح" رکھا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی تائید بھی کرتا ہے تو پھر مرسلین اور مسیح جیسے اولوالعزم بندوں کی تائید کیوں نہ کرتا اور مسیح علیہ السلام تو جمہور انبیاء و رسل کی نسبت اس تائید کے زیادہ مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (۱۰۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بلند کیے اور عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے کھلے کھلے معجزے دیے اور پاک رُوح کے ساتھ اس کی تائید کی۔

زجاج نے اس تائید کی تین صورتیں بیان کیں، ایک یہ کہ اُس نے اپنے امر اور اپنے دین کے اظہار کے لیے مسیحؑ کی تائید کی۔ دوسرے یہ کہ جب بنی اسرائیل نے مسیحؑ کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے بچانے میں مدد کی۔ تیسرے یہ کہ مسیحؑ کے جمیع حالات میں اس کی تائید فرمائی۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ "ابن" کا لفظ ان کی نسبت میں مسیحؑ کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں اسرائیل سے بھی کہا ہے کہ تو

میرا اولین بیٹا ہے۔ اور مسیح فرمایا کرتے تھے: "میرا باپ اور تمہارا باپ" اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو سارے لوگوں کا باپ بناتے تھے اور جس طرح اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی کہتے تھے۔ سو معلوم ہوا کہ مسیح کو اس باب میں کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے لیکن نصاریٰ تو یہ کہتے ہیں کہ مسیح خدا کا طبعی بیٹا ہے اور دوسرا جو شخص بھی ہے، وہ اس کا وضعی بیٹا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس یہ فرق قائم کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مزید برآں مسیح کو طبعی بیٹا قرار دینے سے بعض محالات عقلی سمعی لازم آتے ہیں جن سے اس قول کا بطلان بالصراحت معلوم ہو جاتا ہے۔

عقیدۂ "قدمِ عالم" کی تردید

فلاسفہ کہتے ہیں کہ عالم قدیم ہے، اور وہ علت موجبہ بذاتہٖ، اس طرح صادر ہوا ہے، کہ پہلے ایک عقل صادر ہوئی، حتیٰ کہ دس عقلیں اور نو نفس ظہور میں آ گئے۔ یہ لوگ عقل کو نر اور نفس کو مادہ کا قائم مقام قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا قول عقلاً و شرعاً مشرکین عرب اور اہل کتاب کے قول سے بھی زیادہ فاسد ہے۔ اس قول کے فساد و بطلان پر قرآن کی دلالت زیادہ بلیغ و صریح ہے اور اس کے کئی وجوہ ہیں۔

یہ لوگ قدم افلاک کے قائل ہیں اور کہتے ہیں، کہ یہ روحانیت (عقول و النفس) بھی قدیم ہیں جنھیں وہ ثابت کرتے ہیں، اور مجردات، مفارقات اور جواہر عقلیہ سے موسوم کرتے ہیں۔ اور اسے قدیم ازلی مانتے ہیں، اور جو چیز قدیم ازلی ہو وہ کسی صورت سے مفعول نہیں ہو سکتی، اور مفعول وہی چیز ہو سکتی ہے جو حادث ہو، اور یہ قضیہ جمہور عقلاء کے نزدیک بداہت کا حکم رکھتا ہے۔ پہلے زمانے اور پچھلے زمانے کے فلاسفہ اور ساری قومیں اسی عقیدے پر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام امتیں، ہر ممکن کو خواہ وہ موجود ہو یا غیر موجود، حادث قرار دیتی ہیں۔

متاخرین کی ایک جماعت مثلاً "ابن سینا" اور ان کے ہم خیال لوگوں کا یہ

دعویٰ ہے کہ ایسے ممکن کا وجود بھی ہے جو قدیم معلول ہو۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلک قدیم ہے اور ایک علت قدیم کا معلول ہے۔ قدیم فلاسفہ میں سے بعض کہتے ہیں کہ فلک حادث ہے اور جمہور فلاسفہ قدیم اسی طرف گئے ہیں۔ یہ اور نیز ارسطو سے پہلے کے فلاسفہ اہل مذاہب کے موافق ہیں۔ ارسطو اور اس کے ہم خیال جو فلک کو قدیم مانتے ہیں، کہتے ہیں کہ فلک کے لیے علت فاعلہ نہیں، بلکہ علت غائیہ[1] ہے جس سے فلک بطور اشتباہ منسوب ہے اور عقول ونفوس وغیرہ ثابت کرتے ہیں۔ وُہ فلک کی جنس سے ہیں اور یہ سب خود بخود قدیم اور واجب الوجود ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے علتِ غائیہ ہے، اور یہ لوگ متاخرین کی نسبت زیادہ کافر ہیں۔ ان لوگوں کا قول متاخرین کے قول سے مختلف ہے۔

۲۔ یہ کہتے ہیں کہ پروردگار ایک ہے، اور ایک سے صرف ایک چیز صادر ہو سکتی ہے۔ پروردگار کے ایک ہونے سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس کے لیے ہرگز کوئی صفت ثبوتیہ (صفت قدیمہ) نہیں ہے اور نہ اس میں متعدد معنی سمجھے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے انکے نزدیک ترکیب لازم آتی ہے۔ اسی لیے وُہ کہتے ہیں، کہ وُہ فاعل اور قابل (فعل) نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فعل، انفعال، دو متغائر صفات ہیں۔ ان سے تعدد صفت اور تعدد صفت سے ترکیب لازم آتی ہے بایں ہمہ۔ وُہ خود خدا کو عاقل، معقول، عقل، عاشق، معشوق، عشق، لذیذ، ملتذ (لذت گیر) اور لذت وغیرہ متعدد حقیقتیں

---

[1] علت فاعلہ، وُہ علت ہے جو اپنے معلول کو پیدا کرے اور اس کے لیئے تقدم لازمی ہے مثلاً خدا کائنات کی علت فاعلہ ہے، علت غائیہ وُہ ہوتی ہے جو اپنے معلول کو پیدا نہیں کرتی اور نہ اس میں سے معلول کا صدور ہوتا ہے بلکہ اشتباہ وُہ معلول کی علت مانی جاتی ہے مثلاً پانی کا گھڑا معلول ہے اور انسان کی پیاس اس کی علت، لیکن ظاہر ہے کہ انسان کی پیاس گھڑے کی خالق و فاعل نہیں، اس لیے یہ علت فاعلہ نہیں بلکہ غائیہ کہلائے گی۔ (مترجم)

مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ان صفات میں سے ہر ایک صفت کی حیثیت دوسری ہے اور صفت ہی موصوف اور علم ہے۔ وہی قدرت اور وہی ارادہ اور علم ہے، وہی اور وہی قادر ہے۔ اور متاخرین میں سے بعض کہتے ہیں کہ علم ہی معلوم ہے۔ جب کوئی عقلمند ان کے اقوال پر کما حقہ غور کرتا ہے، تو جس ایک کو وُہ ثابت کرتے اس کا وجود ذہنوں میں تو متصور ہو سکتا ہے، لیکن اعیان میں ثابت نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مقام پر اس کے متعلق بسط و شرح کے ساتھ بحث ہو چکی ہے۔

توحید و صفات کے متعلق جو کچھ وُہ کہتے ہیں، اور ترکیب کے متعلق جو ان کو لاحق ہُوا ہے۔ اس کا بطلان کئی وجوہ سے واضح کیا جا چکا ہے۔ اور یہ صورت ہو تو جس اصل پر انھوں نے اس قول کی بنیاد رکھی ہے کہ ایک چیز سے ایک چیز صادر ہو سکتی ہے۔ وہی باطل ٹھہرتی ہے۔

۳۔ ان کا یہ قول بھی نہایت فاسد ہے کہ ایک بسیط سے اشیاء صادر ہوں جن میں کثرت و حدوث عام ہو۔

۴۔ عالم میں کوئی واحد و بسیط وجود معلوم نہیں ہوا جس سے ایک سے زیادہ تو کیا وجود بھی صادر ہو سکے۔ سو اس دعوٰے کلیہ کا بھی مطلقًا کوئی ثبوت نہیں۔

۵۔ وُہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ایک وجود صادر ہوا اور اس سے عقل اور اور فلک صادر ہوئے۔

اگر ایک سے صرف ایک کے صدور کا کلمہ صحیح ہے تو اس ایک سے بھی صرف صادر ہو سکتا ہے، پس یہ ماننا پڑے گا کہ جہاں میں جو کچھ موجود ہے واحدِ ہی کے طریق پر ظہور پذیر ہُوا ہے، اور یہ ہٹ دھرمی ہے، اور اگر یہ مانا کہ صادرِ اول میں کسی طرح کی کثرت موجود ہے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ اوّل (خدا) ایسی چیز صادر ہوئی ہے جو من کل الوجوہ ایک نہیں ہے بلکہ اس میں کثرت ہے

سوا) سے غیرِ واحد (صادر ہوا۔ اس لیے متاخرین فلاسفہ کا قول مضطرب ہو گیا۔ ابوالبرکات صاحب "معتبر" نے اس قول کو باطل قرار دیا اور اس کی سخت تردید کی ہے۔ ابن رشد الحفید کا دعوٰی ہے کہ فلک اور اس میں جو کچھ مخلوق ہے، وُہ اوّل (خدا) سے صادر ہوتے ہیں، اور وزیر الملاحدہ[۵] "طوسی" کا قول بھی قریباً یہی ہے، وُہ اللہ کو ثانی کی اور ثانی کو ثالث کی شرط قرار دیتا ہے۔ البتہ اس گمراہی میں سارے متفق ہیں کہ جواہر خود بخود قائم اور پروردگار کے ساتھ ازلی ہیں اور کہتے ہیں کہ وُہ ہمیشہ خدا کے ساتھ تھے اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گے، لیکن یہ بھی مانتے ہیں کہ ایک وقت تھا جب یہ جواہر موجود نہ تھے۔" طوسی" نے فلک کو بھی قدیم اور ازلی قرار دیا ہے۔ اور یہی ایک بات عقل کے صریح خلاف ہے اور شریعت رسل سے کفر کے لیے کافی ہے، چہ جائیکہ اس کے ساتھ اس کے دیگر اقوال بھی شامل کیے جائیں جو عقل و نقل کے صریح مخالف ہیں۔

۶۔ دُنیا میں جس قدر چیزیں معلوم ہیں وُہ دو سے صادر ہوئی ہیں۔ تنہا ایک چیز سے کچھ صادر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کا ذکر متولدات اعیان و اعراض کے باب میں آچکا ہے۔ گرم چیز سے گرمی کا، سرد چیز سے سردی کا اور سورج سے شعاع کا صدور ہوتا ہے لیکن یہ اعراض کا صدُور ہوتا ہے، اور اس کے باوجود اس کے لیے دو اصلوں کا ہونا ضروری ہے۔ اعیان کا کسی دوسری چیز سے صادر ہونا تو ولادت معروفہ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اصل کی ایک جزء علیحدہ ہو کر نئی چیز متولد ہو، اور یہ لوگ اس امر کے مدعی ہیں کہ عقول، نفوس اور افلاک اس طرح کے صدور، تولد، اور معلومیت کا نتیجہ ہیں اور یہ سب چیزیں جواہر ہیں جو خود بخود قائم ہیں اور ایک جوہر بسیط سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ ایسا قول ہے کہ صدُور و تولد کے باب میں جس قدر اقوال

---

[۵] حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے ملحدوں کے علاوہ دینی غیرت حمیت کا بھی ایک نہایت عظیم الشان پیکر تھے۔ نصیر الدین طوسی چونکہ ہلاکو خاں کے مشیر خاص تھے اس لیے حضرت مصنف ان کو وزیر الملاحدہ لکھتے ہیں (مترجم)

منقول ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس درجہ باطل نہیں، کیونکہ اس میں ایک جوہر سے متعدد جواہر کے صدور کا دعویٰ کیا گیا ہے اور یہ بات عقل کے خلاف ہے۔ نیز اس میں اصل سے کسی حصّے کی علیحدگی وانفصال کے بغیر ہی صدور مانا گیا ہے۔ اور یہ بھی غیر معقول ہے۔ ان کے پاس لے دے کر دلائل کا اگر ذخیرہ ہے تو یہ ہے کہ وہ اس صدور کو سورج کی شعاع اور ہاتھ کی حرکت سے انگشتری کی حرکت وغیرہ اعراض کے حدوث سے تشبیہ دیتے ہیں، حالانکہ یہ تمثیل باطل ہے، کیونکہ یہ علت فاعلہ نہیں ہے، بلکہ محض شرط ہے اور وہاں بھی صادر ہونے والی چیز ایک اصل سے نہیں، بلکہ دو اصلوں سے صادر ہوتی ہے۔ نیز صادر عرض ہے، نہ کہ جوہر جو خود بخود قائم ہو۔

پس معلوم ہوا کہ جس تولد عقلی کا وہ دعوےٰ کرتے ہیں، وہ تولد و صدور کے باب میں بعید ترین امور میں سے ہے۔ یہ قول نصاریٰ اور مشرکین عرب کے قول سے بھی زیادہ لغو ہے۔ موخرالذکر جماعتیں تو خدا کی مفعولات (مخلوقات) کو بمنزلہ ایک صفت ازلی کے قرار دیتی ہیں، جو اس کی ذات کے لیے لازم ہے۔ اور ہم ذکر کر چکے ہیں، کہ ان کو خدا سے متولد کہنا ممتنع ہے، اس کے باوجود وہ ان لوگوں سے زیادہ کافر ہیں، کیونکہ وہ عقول، نفوس اور کواکب کو معبود مانتے ہیں، ان میں سے اہلِ مذہب بہتر ہیں، ان میں سے بعض ملکی ہیں جو کہتے ہیں کہ ملائکہ کسی چیز سے متولد ہیں، اہلِ عرب اور عوام نصاریٰ بھی ان فلاسفہ ملاحدہ سے بہتر ہیں، کیونکہ اول الذکر ولادت حسّی ثابت کرتے ہیں۔ خدا کا "صمد" ہونا اُن کے قول کو باطل قرار دیتا ہے، لیکن ان کے ثبوت میں معقولیت کا کچھ شائبہ تو ہے۔ اور فلاسفہ تو تولد عقلی کا دعوےٰ کرتے ہیں جو من کل الوجوہ باطل ہے اور نصاریٰ کے اس دعوےٰ سے بھی زیادہ مردود ہے کہ کلمہ ذات سے متولد ہے۔ سو ان کا دعوےٰ موخرالذکر کے دعوےٰ کی نسبت زیادہ مستحق تردید ہے۔ کیونکہ جب امرِ محال کا امتناع خارج میں مسلّم ہو تو خارج میں اس کا موجود ہونا متصور ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ خارج میں اس کا وجود

نہیں، اور یہ ممکن ہے کہ جب بعض اعتبارات سے اس کی کوئی نظیر موجود ہو تو اس کے لیے وجود خارجی فرض کیا جائے۔ جس سے اس کو تشبیہ دی جاتے۔ مثلاً جب خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود شریک فرض کیا جاتے اور مان لیا جائے کہ خدا کا کوئی بیٹا بیٹی ہے تو اسے بندوں میں سے اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی جائے گی جو صاحب اولاد ہو اور جس کا بندوں ہی میں سے کوئی شریک ہو۔

اس کے بعد بیان کیا جائے گا کہ ان امور کا اللہ تعالیٰ سے منسوب ہونا ممتنع ہے۔ سو محالات میں سے جو محال مشابہت موجود سے بعید تر ہوگا۔ وُہ زیادہ محال ہوگا اور جس ولادت کا دعوےٰ نصاریٰ نے اور پھر ان فلاسفہ نے کیا ہے وُہ اس ولادت کی نسبت جس کے مدعی عرب کے بعض مشرکین، عوام نصاریٰ اور یہود ہیں، ولادت معلومہ کی مشابہت سے بعید تر ہے اس لیے یہ ولادت عقلی اس ولادت حسی کی نسبت محال تر ہے کیونکہ ولادت حسیہ ان وجودوں میں جو خود بخود قائم ہوں، عقل کے موافق ہے اور ولادت عقلیہ ایسی صورت میں قطعاً خلاف عقل ہے، علاوہ ازیں وُہ لوگ (نصاریٰ اور مشرکین عرب) ولادت دو اصلوں سے ثابت کرتے ہیں اور یہ ولادت عقل کے مطابق ہے اور یہ لوگ فلاسفہ ایک اصل سے ولادت مانتے ہیں۔ وُہ نصاریٰ و مشرکین عرب) کہتے ہیں کہ ولادت اس وقت ہوتی ہے جب ایک حصہ علیحدہ ہو اور یہ معقول بات ہے اور یہ (فلاسفہ) کہتے ہیں کہ ولادت اس کے بغیر ہوتی ہے اور یہ بات عقل کے خلاف ہے وہ (نصاریٰ و مشرکین عرب) اعیان سے اعیان کی ولادت کے اصول پر ولادت ثابت کرتے ہیں اور یہ (فلاسفہ) اعیان سے اعراض کی ولادت کے اصول پر دلالت ثابت کرتے ہیں۔ سو معلوم ہوا کہ ان لوگوں (نصاریٰ و مشرکین عرب) کا قول عقل سے قریب تر ہے اگرچہ وُہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی خرابی بیان کر دی ہے اور اس کو ناپسند فرمایا ہے۔ اور ان (فلاسفہ وغیرہ) کا قول زیادہ مستحق بطلان ہے۔ اس کی وہی مثال ہے کہ ایک شخص خُدا کے علاوہ کسی مخلوق کو شفیع اور معبود بناتا ہے وُہ کافر ہے لیکن جو شخص کسی چیز کو خدا کے علاوہ قدیم قرار دے کر اُس کی عبادت کرتا اور کہتا ہے

شفیع بناتا ہے وہ کفر کا زیادہ مستحق ہے۔ اور جس نے معاد (قیامت) کا انکار بھی کیا، اور ساتھ ہی عالم کو حادث مانا، کافر تو خدا نے اسے بھی فرمایا ہے، لیکن جو شخص معاد کا بھی منکر ہو اور اس عالم کو بھی قدیم مانے وہ عنداللہ اکفر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنی امت کو اہل فارس اور نصارائے روم کی مشابہت سے منع فرمایا وہاں آپؐ نے مشرکین یونان اور مشرکین ہند کی مشابہت سے زیادہ شدت کے ساتھ منع فرمایا۔

کفارِ عرب و مشرکینِ یونان و ہند و تاتار کا مقابلہ

علیٰ ہٰذا القیاس بعض مسلمانوں میں یہود و نصاریٰ اور اہلِ فارس و روم کی جو مشابہت سرایت کر گئی وہ اللہ اور رسول کے نزدیک مذموم ہے۔ لیکن جن مسلمانوں میں اہلِ یونان، اہلِ ہند اور مشرکین تاتار کی رسوم دخل حاصل کر چکی ہیں، وہ بطریقِ اولیٰ مذموم ہیں، کیونکہ اہلِ کتاب اور اہلِ فارس و روم کی نسبت موخر الذکر لوگ اسلام سے زیادہ بعید ہیں، جن اقوام کفر و شرک سے اواخر مسلمین کو سابقہ پڑا ہے وہ ان اقوام سے بدتر ہیں، جن سے اوائل مسلمین کو مقابلہ درپیش تھا، کیونکہ مسلمین سلف علم اور دین کے لحاظ سے فائق تھے، سو جب کفار کا مقابلہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا تھا جو اُن سے علم اور دین میں افضل تھے تو وہ مسلمانوں سے لامحالہ مغلوب ہو جاتے تھے، متاخرینِ اسلام بھی اس امر کے باوجود کہ وہ اپنے اسلاف کی نسبت ناقص تر تھے، ان لوگوں سے گوے سبقت لے جایا کرتے تھے، لیکن جب پچھلے زمانے کے مسلمانوں میں بدعات کی کثرت ہو گئی تو کفار نے چاروں طرف سے یورش شروع کر دی اور ان کے دین میں وساوس والتباسات پیدا کر دیے، اسی لیے ان لوگوں کے نزدیک دوسرے کفار کی نسبت فلاسفہ کا شبہ زیادہ بڑا تھا، جس طرح اہلِ زمان کے لیے کفارِ تاتار کے خلاف جنگ کرنا ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ دشوار تھا جو ان سے قبل

گزر چکے تھے، کیونکہ اس وقت ان کو کفار تاتار کی تلواروں اور زبانوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ اور ایمان کی کمی نے علم اور جہاد میں ضعف پیدا کر رکھا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی بعض اہل عرب کی یہ حالت تھی۔

مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیئت و قدرت سے زمین او آسمان پیدا کیے، بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ چیزیں چھ دن میں پیدا کی گئیں، اس کے خلاف دلدادگان تفلسف کہتے ہیں کہ چھ دن میں پیدا کرنا تو درکنار، خدا نے کائنات کو نیست سے ہست کیا ہی نہیں۔ پھر بطورِ تلبیس دین مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ عالم حادث ہے، اور اس امر سے مراد یہ لیتے ہیں کہ وُہ علت قدیمہ کا معلول ہے یعنی یہ کہ وُہ خُدا سے متولد ہے، لیکن یہ بات بالکل بے معنی اور خلافِ عقل ہے۔

نیز اہل کتاب اور مشرکین عرب ملائکہ کا اقرار تو کرتے ہیں اگرچہ ان میں سے بہت سے لوگ ملائکہ اور شیاطین کو ایک قسم میں داخل کرتے ہیں، ان میں سے جو خدا کی بندگی سے سرتابی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ گرا دیتا ہے اور وُہ شیطان بن جاتا ہے یہ لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ ابلیس جنوں کا باپ تھا، اور جن نکاح کرتے بچے جنتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ یہ نصاریٰ ان باتوں سے انکار تو کرتے ہیں، لیکن کافر ہونے کے باوجود فلاسفہ سے بہتر ہیں۔

جن کے نزدیک ملائکہ کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اور جو صرف عقول و نفوس کو یا ان اعراض کو مانتے ہیں جو اجسام کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً قوائے صالحہ کو وُہ ملائکہ سمجھتے ہیں۔ جمہور نصاریٰ اور اہل عرب اور اکثر اہل کتاب جنوں کی ہستی مانتے ہیں لیکن فلاسفہ انہیں نہیں مانتے، اور قوائے فاسدہ ہی کو شیاطین قرار دیتے ہیں مشرکینِ عرب اور اہل کتاب خدا سے دعائیں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں، کہ وُہ اُن کی دُعا کو سنتا اور قبول کرتا ہے، لیکن فلاسفہ کے نزدیک خدا جزئیاتِ عالم سے بالکل بے خبر

اور کسی کی دعا سننے یا قبول کرنے سے بالکل عاجز ہے، اور وُہ جہاں میں کچھ بھی پیدا نہیں کرتا، ان کے نزدیک سبب حدوث (پیدائش کائنات) فلک کی حرکات ہیں۔ ان کی رائے میں دُعا اس لیے موثر ہوتی ہے کہ وُہ عالم کے ہیولیٰ میں نفس ناطقہ کا تصرف ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک صحیح حدیث مروی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے گالی دی، حالانکہ اسے یہ مناسب نہیں، اور آدمؑ کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا ہے، حالانکہ یہ اس کے لیے مناسب نہ تھا۔ گالی اُس نے مجھے یوں دی ہے کہ وُہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے لیے بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں "احد" اور "صمد" ہوں، نہ میں کسی کا بیٹا ہوں، نہ میرا کوئی بیٹا ہے، اور نہ کوئی میرا مقابل ہے اور یہ کہہ کر انہاں نے میری تکذیب کی ہے کہ خُدا مجھے پہلے کی طرح دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ مجھ پر دوبارہ پیدا کرنا پہلے پیدا کرنے کی نسبت مشکل تر نہیں" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَقُولُ الإِنسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا۔ (۱۶ : ۸)

اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا، تو زندہ ہو کر دوبارہ لایا جاؤں گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ۔

اور کہتے ہیں کہ رحمان کے ہاں اولاد ہے تم نے بہت بڑی بات نکالی۔ قریب ہے، کہ اس بات سے آسمان ٹوٹ پڑیں۔

اگرچہ یہ نصوص یقینی طور پر کفارِ عرب کے متعلق ہیں، لیکن یہ فلاسفہ کو بطریق اولیٰ حاوی ہیں، کیونکہ وُہ دوبارہ پیدا کرنے کے ساتھ ابتدائی تخلیق کے بھی منکر ہیں، وُہ یہ نہیں مانتے کہ ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے اور آدم علیہ السلام

اول البشر ہیں۔ کفار عرب نے اللہ تعالیٰ سے بیٹا منسوب کیا تو یہ خدا کو گالی دینے کے مترادف قرار دیا گیا۔ لیکن فلاسفہ کے نزدیک سارا فلک خدا کا لازم اور اس کا معلول ہے، اور وہ فلک کا لزوم خدا کے ساتھ اتنا راسخ دقوی مانتے ہیں، جتنا اولاد کو والد کے ساتھ نہیں ہوتا۔ والد کو بچہ جننے کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے نزدیک لزوم فلک میں خدا کی مشیئت و قدرت کو کچھ بھی دخل نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا اپنے آپ سے فلک کے لزوم کو ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ سو جو تولد وہ ثابت کرتے ہیں وہ اس تولد سے زیادہ کامل ہے۔ جو لوگوں میں موجود ہے، وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اپنا بیٹا بنایا ہے کیونکہ ان کے نزدیک وہ عالم کی کسی چیز میں تغیر و تبدل پر قادر ہی نہیں ہے، بلکہ عالم اس کے ساتھ لازم ہے اور لزوم کی حقیقت یہ ہے، کہ خدا نے کچھ نہیں کیا، بلکہ وہ خود موجود ہی نہیں اور اگرچہ وہ خدا کو علت و معلول سے موسوم کرتے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ اسے کسی صورت میں بھی نہیں مانتے۔

ان کے قول میں نصاریٰ کے قول کی نسبت بہت بڑا تناقض اور فساد موجود ہے متکلمین کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ علت و معلول سے فلاسفہ کی مراد وہی ہوتی ہے جو دوسرے لوگوں کی والد اور ولد سے ہوتی ہے، اس لیے دونوں یکساں طور پر مذمت کے مستحق ہیں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔

دوسرے لوگ فلاسفہ کی نسبت بہتر ہیں، ان لوگوں میں سے جو لوگ اسلام سے قریب ترین ہیں، مثلاً ابن رشید الحفید، اگر ان کے قول کی بھی تحقیق کی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ پروردگار کو وجود عالم کا فاعل نہیں، بلکہ اُس کی شرط مانتے ہیں اور ملاحدہ صوفیہ جنھیں تحقیق کا دعوے ہے اور فلاسفہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں، ان کا عقیدہ بھی اسی طرح ہے۔ چنانچہ ابن عربی اور ابن سبعین کا قول یہ ہے کہ یہ عالم، موجود، واجب اور ازلی ہے، وہ خود بخود پیدا ہوا ہے، کوئی اس کا صانع نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وجود ایک ہے

اور اُن کی مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا خالق نہیں جس نے دوسری چیز پیدا کی ہو، قیامت نبوتوں کے متعلق ان کا کلام یہود و نصاریٰ اور بُت پرستوں کے کلام کی نسبت بدتر ہے کیونکہ فلاسفۂ عالم میں بلا تخصیص ہر بُت کی عبادت کو جائز رکھتے ہیں۔

جسمِ باری پر بحث

متکلمینِ جدید میں سے بعض کہتے ہیں، کہ رب تعالیٰ کا جسم ہے اور بعض اس بات کی نفی کرتے ہیں۔ اول الذکر جماعت ہشام بن الحکم اور محمّد بن کرام وغیرہما اور اُن کے موافقین پر مشتمل ہے اور دوسری جماعت جہم بن صفوان، ابو الہذیل العلاف اور اُن کے ہم خیالوں پر حاوی ہے۔ دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے قول کے اثبات کے لیے سورۂ "اخلاص" سے استدلال کیا ہے۔

جو لوگ جسمِ باری کے قائل ہیں وُہ کہتے ہیں کہ خدا "صمد" ہے اور صمد کا جوف نہیں ہوتا۔ اور یہ بات صمت (ٹھوس) اجسام ہی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں جوف (خلوِ باطن) نہیں ہوتا۔ پہاڑ اور چٹانیں اور پتھر کے مصنوعی ستون ان اجسام کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کو بھی "صمد" کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ خُدا سے کوئی چیز نکل سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی چیز داخل ہو سکتی ہے، وُہ کھاتا پیتا بھی نہیں اور نہ اس قبیل کی دوسری حوائج اُسے لاحق ہوتی ہیں، اور ایسے حوائج و امور کی نفی صرف اسی وجود کے متعلق سمجھی جا سکتی ہے جو جسم ہو، اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ "صمد" کی اصل اجتماع ہے۔ "تصمیدِ مال" (مال جمع کرنا) اسی سے ہے، اور یہ بات صرف جسم مجتمع میں معقول ہو سکتی ہے۔

جو لوگ عقیدۂ جسمِ باری کی نفی کرتے ہیں، وُہ کہتے ہیں کہ "صمد" وُہ چیز ہے جس کے اجزاء الگ الگ نہ ہو سکیں۔ اور عالم میں ہر جسم کے اجزاء الگ الگ جا سکتے ہیں۔ پھر وُہ یہ کہتے ہیں کہ "احد" وُہ ہے جو تجزی و انقسام قبول نہ کرے

عام ہیں ہر جسم میں تفرق، تجزی اور انقسام ہو سکتا ہے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ جب آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا جسیم ہے تو لا محالہ وہ جواہر منفردہ اور مادہ اور صورت سے مرکب ہو گا، اور جو چیز کسی دوسری چیز سے مرکب و مولف ہو، وہ اُس کی طرف محتاج ہوتی ہے، حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ "صمد" ہے اور صمد ماسوا سے غنی ہوتا ہے، سو مرکب "صمد" نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صحیح ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اجزاء سے مرکب و مولف ماننا اور اسے تجزی، انقسام اور انفصال کا مورد تسلیم کرنا شرعًا وعقلاً باطل ہے۔ یہ اس کے صمد ہونے کے منافی ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اجزائے متفرقہ تھا اور پھر جمع ہو گیا ہے، یا یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ سے اجزائے مجتمع تھا، لیکن ان میں سے بعض اجزاء کا دوسرے اجزاء سے جدا ہونا ممکن ہے۔ جیسا انسان اور دیگر اجسام میں ہوتا ہے، دونوں برابر ہیں۔ انسان اگرچہ ہمیشہ سے مجتمع الاجزاء ہے لیکن ان میں سے بعض کا دوسرے اجزاء سے جُدا ہو جانا ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے منزّہ ہے، اسی لیے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ "کمالِ صمدیت" اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے ورنہ یوں تو وہ چیزیں بھی "صمد" کہلا سکتی ہیں جن کا بعض حصّہ فنا یا معدوم ہو سکتا ہے اور جو چیز عدم کو قبول کرے وہ بذاتہٖ واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔ اور نہ قدیم ازلی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس کا قدیم ہونا واجب ہو اس کا معدوم ہونا ممتنع ہے، اور اسی طرح اس کی وہ صفات بھی ممتنع العدم ہیں جن سے وہ ہمیشہ متصف رہا ہے۔ یہ صفات اُسی کی ذات کے لوازم میں سے ہیں۔ لازم اس وقت تک معدوم نہیں ہو سکتا جب تک ملزوم معدوم نہ ہو۔

سلف صالحین میں سے بعض کا یہ قول ہے کہ "صمد" وہ ہے جو دائم ہو،

اور اپنی مخلوقات کے بعد باقی رہے، کیونکہ یہ بات لوازم صمدیت میں سے ہے۔ اس لیے کہ جب وُہ عدم کو قبول کر لے تو اس کی صمدیت اس کے ساتھ لازم نہیں رہ سکتی۔ بلکہ اس کا صمد نہ ہونا بھی جائز ہو گا اور وُہ صمد نہ ہو گا، اس سے صمدیت کی نفی صرف اس وقت ہو سکتی ہے کہ اس کے لیے عدم کو جائز رکھا جائے، اور یہ محال ہے۔ صمدیت اس کے لیے اسی وقت واجب ہو سکتی ہے کہ وُہ اس کے لیے لازم ہو، اور یہ بات اس کے عدم کے منافی ہے۔ اور صمدیت اس کے لیے واجب ہے۔ یہ بات نہیں ہوئی کہ اللہ تقدس و تعالےٰ پہلے صمد نہ تھا، اور بعد میں صمد ہو گیا، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وُہ متفرق تھا اور پھر جمع ہو گیا، اور وُہ مفعول (مخلوق) حادث اور مصنوع ہے۔ یہ صفت اس کی مخلوقات کی ہے، خالق قدیم ہے، اُس کا کسی صورت میں معدوم یا مخلوق یا غیر کا محتاج ہونا بالکل ممتنع ہے۔ اس میں سے کوئی بات اس کی شان کے شایاں نہیں ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ وُہ ہمیشہ صمد رہے گا۔ یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وُہ متفرق تھا اور بعد میں جمع ہو گیا اور نہ یہ کہنا جائز ہے کہ اس کا متفرق ہو جانا جائز ہے، بلکہ یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس سے کوئی چیز نکل سکتی ہے یا اس میں کوئی چیز داخل ہو سکتی ہے۔

اس بات پر قدیم و جدید مسلمانوں کی ساری جماعتیں متفق ہیں، اگرچہ اس کے خلاف بعض جہال کے غیر منضبط اقوال موجود ہیں۔ لیکن ان اقوال کی اہمیت اُن اقوال سے زیادہ نہیں ہے جو خدا کو مولود اور والد قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی جماعتوں میں یہ اقوال معروف نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض کفار نے اور بعض متفلسفین نے جو اسلام کی طرف منسوب ہیں، اس سے بھی بدتر اقوال پیش کیے ہیں اور وُہ تولّد کے قائل ہیں۔

صفات باری تعالیٰ پر بحث | خدا کی صفات کا قائم رہنا اور یہ کہ وُہ

قیامت میں دکھائی دے گا اور قرآن وغیرہ کے ذریعے وُہ باتیں کرتا ہے اور اس کا کلام غیر مخلوق ہے۔ یہ سب باتیں صحابہ وتابعین ائمہ مسلمین اور اہل سنت وجماعت کی ساری جماعتوں کے مذہب میں داخل ہیں۔ جہمیہ، معتزلہ، بہت سے فلاسفہ اور باطنیہ ان عقائد کے خلاف ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اثبات صفات کے لیے جسم کا ہونا واجب ہے اور جسم تو ہے نہیں، اس لیے اس کے واسطے صفات کیسے ثابت ہو سکتی ہیں ؟ وُہ کہتے ہیں کہ صفات ان اعراض کو کہتے ہیں جو ایک جسم کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، جن کا حلیہ ان کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پھر کہتے ہیں کہ "رویت" معائنہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور معائنہ اُسی وقت ہو سکتا ہے، جب مرئی کسی خاص سمت میں ہو، اور کوئی چیز کسی سمت میں اس وقت ہو سکتی ہے، جب وُہ جسم ہو اور کلام خُدا کی طرف صرف اسی صورت میں مضاف ہو سکتا ہے جب کلام مخلوق ہو اور اللہ تعالیٰ سے الگ ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ مناظرہ کرتے ہُوئے ان لوگوں نے یہی معانی پیش کیے تھے۔ نفی تجسیم سے خلق قرآن پر استدلال کرنے والوں میں سے ابو عیسٰے، محمد بن عیسٰی برغوث بھی تھے۔ جو حسین نجار کے شاگرد اور اکابر اہل کلام میں سے تھے۔ ابن ابی داؤد، امام احمد کے مقابلے کے لیے بصرہ و بغداد وغیرہ کے جس قدر متکلمین جمع کر کے لا سکا، لایا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "خلق قرآن" کا عقیدہ معتزلہ کے ساتھ مخصوص نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، کیونکہ ان متکلمین میں سے اکثر معتزلی نہیں تھے۔ بشر مریسی بھی معتزلی نہیں تھے۔ ان متکلمین میں نجاریہ فرقے کے آدمی بھی تھے اور برغوث انہی میں سے تھے۔ فرقہ ضراریہ کے متکلمین بھی تھے جو ضرار بن عمرو کے متبعین میں سے تھے۔ حفص الفرد جنھوں نے امام شافعیؒ کے ساتھ مناظرہ کیا، اسی فرقے سے

تعلق رکھتے تھے۔ مرجئہ فرقہ کے متکلمین میں سے بشر مریسی زیادہ ممتاز تھے۔ان فرقوں کے علاوہ جہمیہ اور معتزلہ بھی "خلق قرآن" کے زبردست حامی تھے۔ابن ابی داؤد معتزلی نہیں تھے بلکہ جہمی تھے اور صفات کی نفی کرتے تھے۔معتزلہ کی نسبت جہمیہ فرقے میں صفات کی نفی کرنے والے زیادہ عام ہیں۔چنانچہ برغوث نے یوں استدلال کیا ہے کہ اگر خدا کلام کرتا اور کلام اس کے ساتھ قائم ہوتا تو خدا جسم ہوتا لیکن خدا کا جسم نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل اور اُن جیسے دوسرے علمائے سلف اس بات کو خوب جانتے تھے کہ متکلمین مبتدعین نے جسم باری اور اسی طرح کے دیگر الفاظ اس لیے نکالے ہیں کہ ان کی نفی کے ذریعے سے اُن باتوں کی نفی کریں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ثابت کیا ہے، یا اگر ان کا اثبات کریں تو صرف اس لیے کہ اس اثبات کے ذریعے سے ان امور کو ثابت کریں جن کی نفی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے کر دی ہے۔

پہلا طریقہ جہمیہ، معتزلہ وغیرہ کا ہے جو جسم کی نفی کرتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی نیت تنزیہ باری ہے اور فی الحقیقت ان کا مقصود یہ ہے کہ قیامت کو اللہ تعالیٰ دکھائی نہ دے گا، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن یا کسی دوسری کتاب کے ذریعے سے تکلم نہیں فرمایا۔بلکہ اس نے کلام دوسرے میں پیدا کیا، اس کا علم بھی نہیں ہے جو اُس کے ساتھ قائم ہو، اور نہ قدرت اور حیات وغیرہ صفات ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا دلگداز خطبہ

امام احمد نے ایک خطبے میں جو جہمیہ و زنادقہ کے رد میں مرتب کیا تھا فرمایا:

"سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس نے ہر زمانے میں رسولوں کی عدم موجودگی میں اہلِ علم کی ایک جماعت باقی رکھی جو گمراہوں کی ہدایت کی طرف

دعوت دیتی اور ان کی طرف سے جو تکلیف پہنچے، اُسے برداشت کرتی ہے۔ کتاب اللہ کے ذریعے سے مُردوں کو زندہ کرتی اور اندھوں کو اس کے نور کے ذریعے بینا کرتی ہے ابلیس نے بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا، لیکن اُن لوگوں نے انھیں زندہ کر دیا، بیشمار لوگ دشتِ ضلالت میں ٹامک ٹوئیے لگا رہے تھے جنھیں ہدایت کی ان مشعلوں نے صحیح راہ دکھادی۔ لوگوں پر وُہ بہت بڑے احسان کی یادگار چھوڑ گئے ہیں لیکن لوگوں کی درشتی و بدسلوکی کا بہت بُرا اثر اپنے دلوں پر سہے گئے ہیں۔ یہ لوگ گمراہوں کی تحریف کی تردید کرتے اہلِ باطل کی چوری و بددیانتی کا راز طشت از بام کرتے اور ان جاہلوں کی تاویلاتِ باطلہ کا سدِباب کرتے ہیں جو بدعت کے علمبردار اور فتنہ کے پھیلانے والے ہوتے ہیں۔ کتاب کے متعلق ان میں اختلاف ہے، لیکن مخالفتِ کتاب پر وُہ مجتمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں اور اس کی ذات اور اس کی کتاب کے متعلق بغیر علم کے بے تکی باتیں بناتے رہتے ہیں۔ متشابہ کلام میں بحث اور کرید کرتے اور جاہل لوگوں کو دھوکا دے کر انھیں شبہ میں ڈالتے ہیں۔ فنعوذ باللہ من فتن الضالین۔"

دوسرا طریقہ ہشام اور اس کے تبعین کا ہے، ان کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے اس بات کا اثبات کیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو منزہ قرار دیا ہے یعنی یہ کہ معاذ اللہ، خدائے تعالیٰ میں نقائص ہیں اور وُہ مخلوقات سے مماثل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے ان لوگوں کو زبیار۔ اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کے طرز پر جواب دیا اور اعتصام باللہ کی تاکید فرمائی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا	اے ایمان والو! خدا سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرتے دم تک مسلمان رہو، اور اللہ کے دین پر مضبوطی کے ساتھ اور اکٹھے ہو کر قائم

اور فرمایا:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۔ وَاللهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

لوگ ایک امت تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا جو انعاماتِ الٰہی کی بشارت دیتے اور خدا کے عذاب سے ڈراتے رہے۔ ان انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سچی کتاب بھی بھیجی، تاکہ جن باتوں میں لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں وُہ ان کا فیصلہ کرے، اور اس میں اختلاف ان لوگوں کے سوا اور کرتا ہی کون ہے جن کو وُہ کتاب دی گئی ہے اور اختلاف بھی اس وقت کرتے ہیں کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی ہیں۔ یہ اختلاف باہمی ضد کے باعث ہے سو اللہ تعالیٰ نے ایماندار لوگوں کو ہدایت دے دی اور اپنے حکم سے انکے اختلاف رفع کر دیئے وہ بزرگ و برتر جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت فرما دیتا ہے۔

(سورۃ بقرہ)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الٓمّٓصٓ ۔ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا

اے رسولؐ! تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی گئی ہے تاکہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو عذاب سے ڈراؤ، اور یہ مومنوں کے لیے نصیحت ہو۔ اے مومنو! تمہارے رب کی طرف سے جو بات تمہاری طرف نازل ہوا اس کا اتباع کرو اور خدا کے سوا کسی

مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۸ : ۸)

مددگار کی پیروی نہ کرو، تم لوگ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا۔ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى۔ (۱۶ : ۱۶)

سو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو شخص اس کا اتباع کرے گا وُہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ شقی۔ لیکن جس نے میری نصیحت سے اعراض کیا، اُس کی زندگی تنگی میں گزرے گی اور قیامت کو ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وُہ کہے گا کہ اے میرے رب تو نے مجھے کیوں اندھا اٹھایا، میں تو اچھا بھلا دیکھنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس طرح ہماری آیات تیرے پاس آئیں اور تو نے انہیں پس پشت ڈال دیا اسی طرح آج تیری بھی پروا نہ کی جائے گی۔

نیز فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (۵ : ۵)

اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو۔ رسول اللہ کی اطاعت کرو نیز تم میں سے جو حاکم ہو، اس کی اطاعت کرو سو اگر کسی بات میں تمہارے درمیان تنازعہ پیدا ہو جائے، تو اگر تم خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس تنازعہ کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ یہ سب سے عمدہ اور بہتر طریق تاویل ہے۔

اور فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ، إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (۴۹: ۱-۲)

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے بڑھ بڑھ کر باتیں بنایا کرو اور اللہ تعالٰے سے ڈرتے رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کی سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اے مومنو! جس طرح تم آپس میں بلند آواز سے بولا کرتے ہو، اس طرح رسول کے سامنے بلند آواز سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال رائیگاں جائیں، اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اور فرمایا:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا، وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا

اے رسولؐ! کیا تم نے ان کی طرف خیال نہیں کیا جو بزعم خود ان تمام چیزوں پر ایمان لا چکے ہیں جو تم پر یا تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں لیکن ان کے ارادے یہ ہیں کہ طاغوت کی طرف اپنے مقدمات لے جائیں حالانکہ انہیں طاغوت سے علیحدگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو خوب گمراہ کرے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو خدا نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف رجوع کرو تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تمہارے

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ
مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ
ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ
بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا
وَتَوْفِيقًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ
اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِي أَنفُسِهِمْ
قَوْلًا بَلِيغًا وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ
إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ
إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ
لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا
رَّحِيمًا فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ
حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا
مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(۵: ۶)

پاس آنے سے رکتے ہیں۔ اس وقت ان کی کیا
حالت ہوتی ہے جب انھی کی شامتِ اعمال
سے ان پر کوئی مصیبت آجاتی ہے۔ پھر وہ تمہارے
پاس قسمیں کھاتے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری
نیت نیک تھی اور ہم موافقت کے متمنی تھے۔
خدا ان لوگوں کے دلوں کے حالات جانتا ہے۔ تم
ان کی پروا کرو انھیں نصیحت کرتے جاؤ اور ان
کے متعلق انھیں پوری پوری بات کہدو۔ ہم رسول
صرف اس لیے بھیجتے ہیں کہ خدا کے اذن سے ان
کی اطاعت کی جائے جب وہ اپنے نفسوں پر ظلم
کرتے ہیں۔ کاش وہ تمہارے پاس آجائیں اور
اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کریں اور رسول
بھی ان کے لیے مغفرت مانگے تو وہ ضرور خدا کو
تواب اور رحیم پائیں گے۔ اے پیغمبر! تیرے رب
کی قسم ہے کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن ہوں گے
جبتک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے حکم نہ بنائیں اور پھر
تو جو فیصلہ کرے اس سے ان کے دل میں کوئی تنگی محسوس
ہو اور اس فیصلے کے سامنے پورے طور پر سر تسلیم خم
نہ کردیں۔

وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا
فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

میری یہ راہ سیدھی ہے اس پر چلتے جاؤ اور
متعدد راستوں پر نہ چلو، کیونکہ یہ متفرق راستے

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهٖ۔
(٦ : ٨)

تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا کر تتر بتر کر دیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔ (٧ : ٨)

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کر دی اور گروہ گروہ بن گئے۔ تم کو ان کے جھگڑوں سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے حوالے ہے، وُہ ان کو خبر دے دیگا کہ وُہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ـ(٧ : ٢١)

خدا کے دین کی طرف متوجہ رہو۔ یہ خدا کی بنائی ہوئی فطرۃ ہے جس پر لوگوں کو خدا نے پیدا کیا ہے خدا کی بنائی ہوئی فطرۃ تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اُسی ایک خدا کی طرف رجوع کر کے دین اسلام پر جمے رہو، اس سے ڈرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں داخل نہ ہو جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے فرقے بن گئے، جو دین جس فرقے کے پاس ہے، وُہ اُسی میں مگن ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ إِبْرٰهِيمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى أَنْ أَقِيمُوا

تم لوگوں کے لیے خدائے تعالیٰ نے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی وصیت ہم نے نوح ؑ کو کی تھی۔ اے پیغمبرؐ! تمہاری طرف بھی ہم نے وہی بات وحی کی ہے اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور

الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ (۴۲: ۱۳)

عیسیٰ علیہم السلام کو بھی یہی وصیت کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

بعثتِ انبیاءؑ کا مقصد ان آیات اور دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اس لیے بھیجا اور کتاب اس غرض سے نازل کی کہ حق اور باطل میں فرق معلوم ہو جائے اور جس بات میں لوگ باہم اختلاف کریں اُسے بیان کیا جائے اور لوگوں کا فرض ہے کہ وُہ اس چیز کی پیروی کریں، جو ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور جس بات میں ان کا باہم تنازعہ ہو جائے اسے کتاب و سنت کی طرف لوٹائیں، جو شخص اس کی پیروی نہ کرے وُہ منافق ہے اور جو شخص پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کا اتباع کرے گا وُہ گمراہ نہ ہو گا اور شقاوت کا منہ نہ دیکھے گا۔ اور جو شخص اس سے منہ پھیرے گا اسے عذاب دیا جائے گا، وُہ گمراہ اور بدبخت ہو کر اٹھے گا۔ جن لوگوں نے دین سے علیحدگی اختیار کی، اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ان سے بیزار رہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے اسلاف کا طریق اختیار کیا جو سنت و جماعت کے امام، کتاب و سنت کے پابند اور منزّلاتِ ربّانی کے متبع تھے۔ ہمیں بھی یہی دیکھنا چاہیے کہ جس بات کو اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے لیے ثابت کرے ہم بھی اس کی تصدیق کریں اور جس بات کی وُہ اپنی ذات سے نفی فرمائے ہم بھی اُس کی نفی کریں۔ امام احمد بن حنبل نے کتاب و سنت میں جس لفظ کا اثبات پایا اس کا اثبات کیا اور جس بات کی نفی پائی اُس کی نفی کی اور جو الفاظ کتاب و سنّت، صحابہ و تابعین اور جمیع ائمہ مسلمین کے کلام میں موجود ہی نہیں ہیں اُن کا نہ اثبات کرنا چاہیے اور نہ نفی۔

لوگوں نے ان الفاظ کے متعلق جھگڑے کیے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس وقت ان الفاظ کی نہ نفی کی جائے گی اور نہ اثبات، جب تک کہ ان کے معانی کی تحقیق نہ کی جائے تحقیق کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ وُہ اس بات کے مطابق ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات

کے لیے اثبات کیا ہے تو ان کا اثبات کیا جاتے اور اگر معانی یہ ظاہر کریں کہ ان الفاظ کا اطلاق ان باتوں پر ہوتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق نفی فرمائی ہے تو ان الفاظ کی نفی کی جاتے اور جو الفاظ ایسے ہوں کہ اُن سے حق اور باطل دونوں کا اثبات یا دونوں کی نفی ہو، یا وُہ مجمل ہوں کہ اُن سے حق مراد ہو یا باطل، ان الفاظ کو استعمال کرنے والے کا ارادہ کسی ایک معنی کا ہو لیکن عند الاطلاق لوگوں کو اس معنی کا بھی وہم پڑے اور دوسرے معانی بھی مفہوم ہوں جو صاحبِ الفاظ کے ارادے میں نہ ہوں تو ایسے الفاظ کا اطلاق نہ نفی پر ہوگا اور نہ اثبات پر۔ "جوہر" "جسم" "تحیز" اور "جہت" وغیرہ الفاظ اس کی مثالیں ہیں۔

ایسا بہت کم اتفاق ہُوا ہے کہ کسی شخص نے یہ الفاظ نفیاً یا اثباتاً استعمال کیے ہوں اور ان میں باطل کو دخل نہ دے دیا گیا ہو۔ خواہ صاحبِ الفاظ کی مراد حق ہی کیوں نہ ہو۔

سلف صالحین اور جدید علم کلام

سلف صالحین اور ائمہ مسلمین اس علم کلام کو بُرا سمجھتے ہیں، کیونکہ اس میں کذب و باطل اور اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلانہ اقوال کی شمولیت کا احتمال ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبل ؒ نے جہمیہ کے ردّ میں بھی لکھا ہے:

"إِنَّهُمْ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللهِ فِيْمَا يَنْفُوْنَهُ عَنْهُ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَيْهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔"

"یہ لوگ بظاہر ان باتوں کی نفی کرتے ہیں، جو ذاتِ باری تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہیں، لیکن انہی الفاظ میں وہ خدا پر ایک اور افترا باندھ دیتے ہیں، اور علم کے بغیر اللہ تعالیٰ کے متعلق کچھ کا کچھ کہتے رہتے ہیں۔"

یہ سب باتیں خدا اور رسول نے حرام قرار دی ہیں، سلف نے ان کو اس وجہ سے مکروہ نہیں سمجھا کہ وُہ محض اصطلاحی الفاظ ہیں۔ اور اس دلیل صحیح سے استدلال کرنا بُرا نہیں ہے جو رسول کی لائی ہوئی ہو۔ وُہ اگر بُرا سمجھتے ہیں تو ان اقوال باطلہ کو جو کتاب وسنت

کے مخالف ہوں۔ اور کتاب و سنت کے مخالف وُہ بات ہوتی ہے جو باطل اور خلافِ عقل ہو۔ کانوں کو اچھی معلوم نہ ہو۔ چنانچہ جب ابوالعباس بن سریج سے توحید کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے کہا کہ "توحید مسلمانوں کی توحید ہے۔ اہلِ باطل کی توحید جو ہر و اعراض کے بھنور میں غوطہ زنی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے انکار کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو لفظوں (جوہر اور عرض کی) تردید فرماتی ہے، کیونکہ یہ اُن کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معانیٔ باطلہ کی تردید ضرور فرمائی ہے جو ان دو الفاظ سے مراد لیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے سب سے پہلے مخترع جہمیہ اور معتزلہ ہیں، جن کی غرض یہ تھی کہ ان کے ذریعے سے خدا تعالیٰ کی صفات سے انکار کیا جائے، خدا کی رؤیت اور اس کے متصف بالکلام ہونے کی تردید کی جائے۔

جہمیہ نے خدا کے اسماء سے بھی انکار کیا ہے سب سے پہلے جعد بن درہم انکا اور میں مشہور ہوا اور خالد بن عبداللہ قسری نے شہر واسط میں اس کی قربانی کی اور کہا لوگو! قربانی کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری قربانی کو قبول کرے میں جعد بن درہم کی قربانی کر رہا ہوں اس نے دعوٰے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دوست نہیں بنایا اور موسیٰ علیہ السلام سے کلام نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ جعد کے اقوال سے بہت بلند ہے پھر اترا اور پھر اسے ذبح کر دیا۔

سلف صالحین اور ائمہ نے اس کلام اور ایسے متکلمین کی مذمت میں مبسوط بیانات فرمائے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر اظہار مقصود ہے کہ احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ سنت سے جب اہلِ بدعت، جسم، جوہر، حیز وغیرہ مجمل الفاظ کا ذکر کرتے تھے تو وُہ ان سے اثباتاً موافقت کرتے تھے اور نہ نفیاً۔ اس کے خلاف اہلِ بدعت نے نئے نئے الفاظ اور معانی گھڑ لیے جنھیں یا تو نفی کے معنی دیے یا اثبات کے اور انہیں بمنزلہ محکم و معقول اصول کے قرار دیا جن پر اعتقاد واجب ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کتاب و سنت میں نظر کی تو جہاں تک ہو سکا انھوں نے اسے اپنے اقوال کے مطابق کرنے کے لیے

تاویل کی اور جہاں تاویل سے کام نہ چلا، وہاں یہ کہہ دیا کہ یہ الفاظ متشابہ اور مشکل ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان سے کیا مراد ہے۔ سو انھوں نے اپنی بدعتوں کو اصل محکم قرار دیا اور شریعت رسولؐ کو اس کی فرع بتایا اور جب یہ فرع ان کی بدعت کے موافق نہ ہو تو اسے مشکل قرار دیتے ہیں۔ جہمیہ، قدریہ وامثالہم کے یہی اصول ہیں۔ فلاسفہ، باطنیہ وغیرہ ملاحدہ کا طریق بھی یہی ہے، اُن کی ساری کتابوں میں یہی طریقہ پایا جاتا ہے۔

ان دونوں طریقوں کے درمیان فرق معلوم کرنا ان عظیم ترین امور میں سے ہے، جو خُدا اور رسُول کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم اور شریعت کے مخالف راستے کے درمیان امتیاز کرتے ہیں۔ مسائل علمیہ، فقہیہ، مسائل اعمال قلوب اور اُن کے حقائق وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے۔ ان سب امور میں نئے مشترک الفاظ و معانی داخل ہو گئے ہیں۔ سو واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتاب و حکمت کو ان تمام امور میں اصل قرار دیا جائے، جن امور میں لوگ بحث و تکلم کریں، ان کو اس اصل کی طرف راجع کیا جائے اور الفاظ مجملہ میں جو معانی کتاب و سنت کے مطابق ہوں انھیں قبول کر لیا جائے اور جو معانی اس کے خلاف ہوں وُہ رد کر دیئے جائیں، چنانچہ جس جماعت کے اختراع کیے ہُوئے الفاظ ناپسند ہو جائیں وُہ ان الفاظ سے استدلال کرنے لگتی ہے جو دوسری جماعت کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اہل فکر و کلام اور متصوفین کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

جب یہ گمان ہو کہ بعض آیات دوسری محکم و بیّن آیات کے خلاف ہیں تو اس وقت انہیں مشکل و متشابہ کہنا جائز ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ قاعدہ ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ جب کسی کتاب کے متعلق بیّن و محکم نصوص آ چکی ہوں اور ایک اور نص بھی موجود ہو جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ بظاہر وُہ نص اس بات کی مخالف ہے جس کے اثبات میں دیگر نصوص قطعیہ آ چکی ہیں تو اُس وقت یہ کہا جائے گا کہ وُہ متشابہ محکم کی طرف راجع کی جائے لیکن جب کتاب و سنت میں ایک ہی معنی مذکور ہوں تو یہ جائز نہیں ہے کہ جو بات اس معنی کی

متضاد ہو، اسے اصل قرار دے دیا جائے اور جو بات قرآن وسنت میں ہو، اسے مشکل و متشابہ قرار دے دیا جائے۔ اور اس کے معنی مسترد کر دیے جائیں۔

قرآن میں کوئی بات عقل کے مخالف نہیں

یہ ٹھیک ہے، کہ بہت سے لوگوں کے لیے نصوص، بعض اوقات مشکل ہو جاتی ہیں، اور وُہ انھیں نہیں سمجھتے، لیکن یہ اشکال نسبتی ہوتا ہے، یہ ان کے لیے مشکل اس لیے ہوتی ہیں کہ وُہ ان کے معانی سمجھنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی جو صریح عقل وحس کی مخالف ہو یا قرآن ہی میں اس کے معنی موجود نہ ہوں۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے سینوں کے لیے شفاء، اور لوگوں کے لیے بیان بنا کر نازل فرمایا ہے۔ سو یہ نہیں ہو سکتا، کہ وُہ اس کے خلاف ہو، لیکن کبھی بعض مقامات اور زمانوں میں آثارِ رسالت پوشیدہ رہتے ہیں اور لوگوں کو اس بات کی پہچان نہیں ہو سکتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا چیز لائے ہیں، یا تو وُہ الفاظ ہی کو نہیں پہچان سکتے یا اگر الفاظ معلوم کر لیں تو ان کے معانی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ خفائے نورِ نبوت کے باعث جاہلیت میں رہتے ہیں اور یہیں سے شرک اور تفرقہ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ فتنے تلوار کے فتنوں سے کم نہیں ہوتے۔ قول اور عمل کے فتنے جاہلیت میں پیدا ہوتے ہیں اور نورِ نبوت کا پوشیدہ رہنا ان کا حقیقی سبب ہوتا ہے۔ مالک بن انس رحمہ اللہ کا قول ہے، کہ جب علم کم ہو جاتا ہے تو ظلم وتاریکی کا ظہور ہوتا ہے اور جب آثار کم ہو جاتے ہیں تو خواہشات کا ظہور ہوتا ہے، اس لیے فتن کو شبِ دیجور سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ نے اپنے خطبے میں فرمایا:۔

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ کُلِّ زَمَانِ فَتْرَةٍ بَقَایَا مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ“

”سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے التوائے نبوت کے ہر دور میں اہلِ علم کی ایک جماعت پیدا کر دی۔“

سو اہلِ زمین کو جو ہدایت حاصل ہوتی ہے وُہ نورِ نبوت کا ہی اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰى۔

پس جب میری ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا وُہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ قیامت میں خوار ہوگا۔

اہلِ ہدایت و نجات وہی ہیں جو انبیاء کے پیرو ہیں اور وُہ ہر مکان و زمان کے مسلمین اور مومنین ہیں۔ اہلِ عذاب اور گمراہ وُہ لوگ ہیں جو انبیاء کو جھٹلاتے ہیں۔ البتہ دورِ جاہلیت کے لوگ جن کے پاس انبیاء کی دعوت نہیں پہنچی مستثنٰی ہیں۔ یہ لوگ بلاشبہ جہل و ضلال اور شرک و شر میں مبتلاء ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (۲:۱۵)

اور ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیتے جب تک رسول نہ بھیج لیں۔

اور فرمایا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (۶:۴)

یہ لوگ بشارت دینے والے اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تاکہ لوگوں کے پاس پیغمبروں کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی حجت باقی نہ رہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى یَبْعَثَ فِیْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِی الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۔ (۲۰:۹)

اے پیغمبرؐ! تیرا رب اس وقت تک بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا جب تک اُن کے صدر مقام میں ایک رسول نہ بھیج لے جو اُن کے سامنے ہماری آیات پڑھے اور ہم صرف ان بستیوں کو ہلاک کرتے ہیں جن کے رہنے والے ظالم ہوں۔

سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک ان میں رسول نہ بھیج لے۔

تکلیف بعد الموت کے دلائل

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس آدمی کے پاس دُنیا میں پیغام رسالت نہیں پہنچا اُس کے پاس قیامت کے روز میدانِ حشر میں رسول بھیجا جائے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بات مسلمانوں کے عقیدے کے خلاف ہے۔ کیونکہ آخرت میں کوئی ہستی تسلیم رسالت کی مکلّف نہیں ہے لیکن بات اس طرح نہیں ہے تکلیف اس وقت منقطع ہوتی ہے، جب وُہ دار الجزاء جنت اور دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ ورنہ وُہ اپنی قبروں میں زیرِ ابتلاء وامتحان ہوتے ہیں، ان میں سے ایک ایک سے سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے اور تیرا نبی کون ہے اور اسی طرح میدانِ قیامت میں کہا جائے گا کہ ہر قوم اس چیز کا اتباع کرے جس کا اتباع وُہ کرتی رہی ہے۔ سو جو شخص سُورج کی پرستش کیا کرتا تھا، وُہ سورج کی اتباع کرے گا، جو چاند کا پجاری تھا، وُہ اس کی پیروی کرے گا اور جو شخص طواغیت (بتوں وغیرہ) کی عبادت کرتا تھا، وُہ ان کی اطاعت کرے گا اور یہ امت (اہلِ اسلام) باقی رہ جائے گی، جس میں منافقین بھی شامل ہوں گے، اللہ تعالیٰ جس صورت میں پہلی مرتبہ ان کے سامنے جلوہ فرما ہُوا تھا۔ اب دوسری صورت بدل کر ان کے سامنے آتے گا اور فرمائے گا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ وُہ کہیں گے کہ ہم تجھ سے اللہ کے پاس پناہ لیتے ہیں۔ جب تک ہمارا رب ہمارے پاس نہ آتے گا ہم اسی جگہ رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرے گا اور انہیں ثابت رکھے گا"، اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے امتحان کے لیے ہو گا کہ آیا وُہ اپنے اس رب کے سوا کسی اور کی اتباع کریں گے جس نے پہلی مرتبہ انھیں اپنا جلوہ دکھا کر اپنے آپ کو پہچنوایا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس امتحان میں بھی اُن کو اسی طرح مضبوط رکھے گا جس طرح قبر کی آزمائش میں ان کو ثابت قدم رکھا تھا۔ جب خدا کے غیر معروف صورت میں جلوہ فرما ہونے

کے باعث وُہ اس کی اتباع نہ کریں گے تو اس وقت وُہ اس صورت میں آئے گا جسے وُہ پہچانتے ہوں گے۔

"کشفِ ساق" کی تفسیر

سو پنڈلی کھل جائے گی اور جب وُہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں گے، سجدے میں گر جائیں گے۔ البتہ منافق سجدہ نہ کر سکیں گے۔ وُہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن ان کی پیٹھیں اکڑ جائیں گی، اور یہ بات بہت سی حدیثوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہؓ اور ابو سعیدؓ سے منقول روایات صحیحین میں موجود ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ جابرؓ کی حدیث بھی اس کی تصدیق کرتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابنِ مسعود اور ابو موسیٰ کی روایت بھی یہ امر ثابت ہے اور وُہ احمد اور دیگر راویوں کی روایت سے مشہور ہے۔ ان سب روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ تکلیف و امتحان اسی وقت منقطع ہوتا ہے جب بندے دار الجزاء میں داخل ہو جاتے ہیں اور دار الجزاء سے پہلے پہلے دار الامتحان و ابتلاء ہے۔

جب لوگوں سے نورِ نبوت منقطع ہو جاتا ہے تو وُہ بدعات کی تاریکی میں پڑ جاتے ہیں، اُن میں بدعتیں اور بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور لوگوں کے درمیان شر واقع ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا میں نے اپنے ربّ سے تین چیزیں مانگیں، دو تو اُس نے دے دیں اور تیسری نہ دی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وُہ میری اُمت کو سنتِ جاریہ کے مطابق ہلاک نہ کرے۔ یہ درخواست منظور ہو گئی، پھر میں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ میری امت پر اغیار کو مسلط نہ کرنا جو اُس کا استیصال کر دیں۔ یہ عرض بھی منظور ہو گئی۔ پھر میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، یا اللہ! میری اُمت کا آپس میں جھگڑا نہ ہو۔ یہ بات منظور نہ ہوئی۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ | اے رسول کہہ دے، اللہ تعالیٰ اس بات

يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ۔

(۶ : ۶۵)

پر قادر ہے کہ تم لوگوں پر تمہاری اُوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے، یا تمہیں فرقہ فرقہ بنا دے، اور تمہیں ایک دوسرے کے ہاتھ سے تکلیف پہنچا دے۔

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ کا قول "قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ" نازل ہوا تو رسول اللہ نے فرمایا: "أَعُوْذُ بِوَجْهِكَ" (میں تیرے پاس پناہ لیتا ہوں) پھر جب "أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ" نازل ہوا تو پھر آپؐ نے فرمایا: "أَعُوْذُ بِوَجْهِكَ" اور جب یہ نازل ہوا کہ "أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ" تو حضرتؐ نے فرمایا، "یہ دو باتیں سہل تر ہیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا فرقہ فرقہ ہو جانا اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے مصیبت اٹھانا لابدی ہے۔ البتہ رسولؐ اس حالت سے بری ہے، اور لوگوں کی یہ حالت بمنزلہ جاہلیت ہے۔

زہری کا قول ہے کہ "ایک مرتبہ فتنہ واقع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب بتعداد کثیر موجود تھے۔ ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ تاویلِ قرآن کے جرم کی پاداش میں جو خون بہایا جائے جو مال ضبط کیا جائے اور جو عورت مملوکہ بنائی جائے اس کا کوئی معاوضہ، کوئی دیّت اور کوئی خونبہا نہیں ہے اور مستولین فتنہ کو بدرجہ جاہلیّت قرار دیا گیا۔ مالکؒ نے مع الاسناد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے، وہ فرمایا کرتی تھیں کہ لوگوں نے اس آیت پر عمل کرنا چھوڑ

ہے

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (۱۳: ۲۶)	اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔

جب مسلمان آپس میں جنگ کریں تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان میں صلح کرائیں۔ جیسا کہ خدا کا حکم ہے۔ جب اس حکم پر عمل نہ کیا جائے تو فتنہ اور جاہلیت کا ظہور ہو گا۔

اختلاف رحمت اور نزاع مذموم

مسائل نزاع کی بھی یہی حالت ہے۔ جب اُمت ان کے اصول و فروع میں جھگڑنا شروع کر دیتی ہے اور یہ امور نزاع اللہ اور رسول کی طرف نہیں لوٹائے جاتے تو حق واضح نہیں ہو سکتا۔ اور متنازعین و متخاصمین[1] بلا دلیل و برہان اپنی اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔ اگر ان پر خدا کی رحمت ہو جائے تو ان میں سے ایک دوسرے کو قائل کر دیتا ہے اور دوسرا اس سے سرکشی نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بعض مسائلِ اجتہاد میں باہم جھگڑتے تھے، لیکن جب ان میں سے ایک دوسرے کو قائل کر دیتا تھا تو دوسرا اس سے سرتابی نہیں کرتا تھا۔

اور جب اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہ فرماتے تو ان لوگوں میں مذموم اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، وُہ ایک دوسرے سے سرتابی و سرکشی کرنے لگتے ہیں یا ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کرنے لگ جاتے ہیں یا ایک دوسرے کو قید کرتے، زدو کوب کرتے، اور جان سے مار دیتے ہیں۔ خوارج اور اُن جیسے دیگر اہلِ بدعت و ظلم کی یہی حالت تھی کہ جب دین کے بعض مسائل میں لوگ اُن سے جھگڑتے تھے تو وُہ اُن پر ظلم و تعدی کرتے تھے، انہی پر کیا موقوف ہے۔ سارے اہلِ ہوس کا یہی حال ہے کہ ایک بدعت نکال کھڑی کرتے ہیں اور جو شخص ان کی مخالفت کرے اس کی تکفیر کرنے لگ جاتے

[1] متنازعین و متخاصمین کا معنیٰ "جھگڑا کرنے والے"

ہیں۔ رافضہ، معتزلہ، جہمیہ وغیرہ کا یہی شیوہ ہے، جن لوگوں نے مسئلہ "خلق قرآن" کے ذریعے سے لوگوں میں مصائب ومحن کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا وُہ بھی انہی لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بدعت نکال لی تھی اور جنھوں نے اس بدعت میں ان کی مخالفت کی، ان کو کافر قرار دیا۔ ان کے حقوق سلب کر لیے۔ اور انواع واقسام کی اذیتیں اور عذاب دیے۔

جب لوگوں پر اس نور کا کوئی حصّہ مخفی ہو جائے جو اللہ تعالیٰ رسول کے ذریعے بھیجتا ہے تو ان کے دو گروہ ہو جاتے ہیں، ایک عادل، دوسرے ظالم۔ عادل وُہ ہوتا ہے جو آثارِ انبیاء میں سے جو چیز بھی پائے اس پر عمل کرے اور دوسرے پر ظلم نہ کرے اور ظالم وہ ہے جو دُوسرے پر تعدی کرے اور یہ لوگ جانتے بھی ہیں کہ ہم ظلم کر رہے ہیں لیکن اس سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ (۳: ۱۰)	اور اہلِ کتاب نے علم حاصل کرنے کے بعد محض ایک دُوسرے کی ضد سے اختلاف شروع کر دیا۔

ورنہ اگر وُہ اس راہ پر چلتے جسے وُہ عدل سمجھتے تھے تو وُہ ایک دُوسرے کو قائل کراتے چنانچہ ائمہ فقہ کے مقلدین کو معلوم ہوتا ہے کہ وُہ ان مسائل میں خود بخود خدا اور اس کے رسول کے حکم کو پہچاننے سے عاجز ہیں تو وُہ اپنے ائمہ کو رسول کے نائب قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں، اُن لوگوں میں سے جو عادل ہوتا ہے، وُہ دوسرے پر ظلم نہیں کرتا اور نہ قولاً وفعلاً اس پہ تعدّی کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اظہارِ دلیل کے بغیر ہی یہ دعوٰے کر بیٹھے کہ اسی کے امام ومتبوع کا قول صحیح ہے۔ اور جو شخص اس قول کا مخالف ہو اس کی مذمت کرنے لگے۔ حالانکہ وُہ معذور ہوتا ہے۔

جن جاہلوں نے امام احمد کا امتحان کیا تھا انھوں نے بھی متشابہ کلام گھڑ لیا تھا۔ جن سے وُہ حق کی نفی کرتے تھے امام احمد نے ان کو ان تمام باتوں کا جواب دیا جو اس امتحان و مناظرہ میں اُن کے سامنے پیش کی گئیں، ان لوگوں نے جسم وغیرہ کا ذکر کیا اتو امام احمد نے جواب دیا کہ "میں تو وہی کہوں گا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ" (اللہ ایک ہے اور اللہ صمد ہے)

لفظ "جسم" ایک نیا اور مبتدعانہ لفظ ہے، کسی شخص کو زیبا نہیں ہے کہ وُہ اس لفظ کو زبان پر بھی لاتے اور اس سے جو معنی مراد ہے وُہ مجمل ہے اور تم لوگوں نے تو اس کے معنی ہی بیان نہیں کیے کہ ہم صحیح معنی پر آپ سے موافقت کریں"۔

الغرض امام احمد نے یہی کہا کہ مجھے معلوم نہیں، آپ کیا کہتے ہیں لیکن میں تو کہتا ہوں:

اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔"

اللہ ایک ہے، اللہ صمد ہے۔ نہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کا مقابل ہے۔ امام احمد یہی کہا کرتے تھے کہ میں نہیں جانتا کہ لفظ "جسم" سے تم کیا مراد لیتے ہو جب کتاب وسنت نے کسی لفظ کے الفاظ یا نفی کا ارادہ نہ کیا ہو تو میں کیونکر تم سے اتفاق کر سکتا ہوں۔ ہاں اگر اس کے معنی بتا دیے جائیں، اور متکلم لفظ سے جو مراد لے وُہ نفیاً یا اثباتاً کتاب وسنت کے موافق ہو تو ہم اس کی موافقت کریں گے اور اگر اس سے وُہ مراد لی جائے جس سے قرآن وسنت کی مخالفت لازم آتی ہو تو ہم اس سے موافقت نہیں کریں گے۔

قرآن وسنت سے، کسی صحابی اور تابعی کے قول سے اور امت مسلمہ کے کسی امام کی تحریر و تقریر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق نفیاً یا اثباتاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد نے خلیفہ "متوکل" کو جو خط لکھا تھا،

اس میں یہی فرمایا تھا کہ اس بات میں میں کسی بات پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہاں اگر کتاب اللہ میں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کچھ موجود ہو یا اس کے بعد صحابہ و تابعین سے مروی ہو تو وہ اور بات ہے اس کے سوا کسی بات پر کلام کرنا اچھا نہیں ہے۔

لفظِ "جسم" کی لغوی و اصطلاحی تحقیق

امام احمدؒ نے جہمیہ کا قول بھی ذکر کیا کہ "اللہ تعالیٰ میں فلاں فلاں صفت نہیں ہے" اور اس کے بعد بیان کیا کہ جس لغت میں قرآن نازل ہوا ہے، اس میں لفظِ "جسم" کو ایک خاص معنی دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۔ (۶۳ : ۴)	اور اے پیغمبرؐ! جب تو انھیں دیکھے تو ان کے جسم تجھے پسند آئیں اور جب وہ بات کریں تو ان کی باتوں کو کان لگا کر سنے۔

پھر فرمایا،

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۔ (۲ : ۲۴۷)	اور اُسے علم و جسم میں زیادہ فراخی عطاء فرمائی۔

ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ طالوت علیہ السلام بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ ماہرِ جنگ تھے۔ ان کے کندھے، گردن اور سر تمام لوگوں سے زیادہ قوی، اور خوش منظر تھے۔"

"بَسْطَة" کے معنی "سَعَة" (فراخی) کے ہیں۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ "بَسْطَة" کسی اکٹھی کی ہوئی چیز کے کھول کر پھیلا دینے کو کہتے ہیں"۔ بعض حضرات کا قول ہے کہ جسم کے بڑا ہونے سے مراد قوت کی برتری ہے، کیونکہ عادۃً جو شخص جسم میں بڑا ہوتا ہے قوت میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو لفظ "جسم" کے معنی عرب کی اس لغت میں جس میں قرآن نازل ہوا ہے یہ ہیں: جوہری، ابوزید انصاری کا قول نقل کرتے

ہیں کہ جسم جسد کو کہتے ہیں جسمان و جثمان کے بھی یہی معنی ہیں۔ اصمعی کا قول ہے کہ جسم "جسمان، جسد اور جثمان" ایک چیز ہے۔ ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ جسم انسان کو جسمان کہتے ہیں اور قَدْ جَسُمَ الشَّيْءُ کے معنی ہیں، وہ چیز بڑی ہوگئی جسیم و جسام بڑی چیز کو کہا جاتا ہے اور جسام (بالکسر) جسیم کی جمع ہے۔

ابو عبیدہ رہ کہتے ہیں کہ "تَجَسَّمْتَ فُلَانًا مِنْ بَيْنِ الْقَوْمِ" کے معنی ہیں و تونے اسے قوم میں سے پسند کر لیا ہے گویا تونے اس کے جسم کا قصد کر لیا ہے۔ اسی طرح تَاَتَّيْتُهُ کے معنی ہیں "قَصَدْتُ إِتْيَهُ وَشَخْصَهُ" میں اس کے سامنے آیا، ابو عبیدہ کا مصرعہ ہے ع تَجَسَّمْتُهُ مِنْ بَيْنِهِنَّ بِمُرْهَفٍ

(وہ عورتوں کے درمیان تھا اور میں نے تلوار لے کر اس کا قصد کیا) وتَجَسَّمْتُ الْأَرْضَ (میں اس زمین کی طرف جانے کے ارادے سے روانہ ہوا)

اور "تجسم" جسم سے مشتق ہے۔ ابن سکیت کا قول ہے کہ تَجَسَّمْتُ الْأَقْرَ کے معنی یہ ہیں کہ "میں اُقر، پہاڑی کے جسیم و اجسم (بڑے) حصے پر چڑھا" تجسمت الرمل والجبل (میں ٹیلے اور پہاڑی کے عظیم ترین جسیم ترین ضخیم ترین حصے پر چڑھا)

عامر بن طفیل کا شعر ہے ؎

لَقَدْ عَلِمَ الْحَيُّ مِنْ عَامِرٍ
بِاَنَّ لَنَا الذَّرْوَةَ الْاَجْسَمَا

"قبیلہ کو عامر کی زبانی معلوم ہو گیا ہے کہ ہماری پہاڑی اجسم (بہت بڑی) ہے"

لغتِ عرب میں جسم کا مفہوم یہ ہے، ہوا جسم نہیں کہلاتی۔ نفس، انسان سے خارج ہو کر جسم نہیں کہلاتا۔ اور نہ وہ روح جسم ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان میں سے کسی چیز سے مماثل نہیں ہے۔ نہ اسے انسان کے بدن وغیرہ سے مماثلت ہے اور نہ کسی اور مخلوق کے اوصاف سے کوئی مشابہت

ہے جو اوصاف مخلوقات کے خاصہ ہیں وُہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف نہیں ہو سکتے اور نہ ان ناموں کا اطلاق ذاتِ جل وعلا پر ہو سکتا ہے۔ جو صفات مخلوقات سے مخصوص ہیں، انھیں "جسم یا" جسد" کہنا جائز نہیں ہے۔ اہل کلام لفظ "جسم" اس سے عام تر بناتے ہیں۔ اور ان میں اس کے معنی کے متعلق عقلی، لفظی اور اصطلاحی اختلاف کا ایک طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ جب اس کی طرف حسی اشارہ کیا جائے تو وُہ جسم ہے۔

ترکیبِ اجسام کا ابطال

اس کے بعد پھر اختلاف کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب ایسا ہو تو وُہ جواہر منفردہ سے مرکب ہے۔ پھر ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ جسم قلیل ترین جوہر ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی دُوسری چیز منضم ہو جائے، بعض کہتے ہیں کہ جسم دو جوہروں سے زیادہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض چار جوہر سے زیادہ کی تعداد بتاتے ہیں۔ بعض چھ، بعض آٹھ بعض سولہ اور بعض بتیس جواہر کا جسم بتاتے ہیں یہ اُن لوگوں کا قول ہے جو جسم کو جواہر غیر منقسم سے مرکب بناتے ہیں اور دوسرے اہل فلسفہ کہتے ہیں کہ تمام اجسام جواہر منفردہ سے نہیں بلکہ ہیولیٰ اور صورت سے مرکب ہوتے ہیں۔

بہت سے اہل کلام اور غیر اہل کلام، ہشامیہ، کلابیہ، ضراریہ وغیرہ بڑی بڑی جماعتوں کا یہ قول ہے کہ اجسام نہ جوہر فرد سے مرتب ہیں اور نہ مادہ اور صورت سے۔ اور بعض دوسرے لوگ یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ اثبات جوہر فرد پر مسلمین کا اجماع ہے چنانچہ "ابوالمعالی" وغیرہ کا قول ہے کہ "مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ ایک حد و منتہی تک اجسام کا تجزیہ و انقسام ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ وُہ اجزاء، افراد کی صورت میں رہ جاتے ہیں اور اس کے باوجود اس نے اس قول میں شک کیا ہے۔ ابوالحسین بصری اور

ابو عبداللہ رازی نے بھی اس میں شک کیا ہے اور یہ بات ہے بھی بالکل صاف، کہ ائمہ مسلمین میں سے کسی صحابی، کسی تابعی اور کسی مشہور عالم نے یہ نہیں کہا۔ اسلام میں سب سے اول یہ قول جہمیہ و معتزلہ کی ایک جماعت کی طرف سے پیش ہُوا ہے اور یہ اس کلام اور اُن اقوال میں سے ہے جن کی سلف صالحین نے بہت مذمت کی اور جنھیں معیُوب قرار دیا گیا۔

ابوالمعالی نے جو اس قول کے پیش کرنے والوں کو اجماع سے تعبیر کیا ہے، تو اس کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اسے اصولِ دین سے اسی قدر شناسائی ہے جو کتب علمِ کلام میں موجود ہیں اور دوسرا یہ اس قول کے خلاف کہنے والوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اور اسی کو اجماعِ مسلمین سمجھ لیا۔

جوہر فرد کا قول بھی باطل ہے اور ہیولیٰ اور صورت کی ترکیب کا دعویٰ بھی باطل ہے اور ان مباحث کے متعلق کسی اور موقع پر شرح و بسط کے ساتھ بحث و تمحیص ہو چکی ہے پھر اور لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ جسم خود بخود قائم ہے۔ اور جو چیز خود بخود قائم (قائم بنفسہٖ) ہو وُہ جسم ہے اور ہر جسم قائم بنفسہٖ اور مشارٌ الیہ (جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے) ہوتا ہے۔

تماثلِ اجسام کا ابطال

ان لوگوں کے درمیان اختلاف یہ بھی ہے کہ آیا اجسام متماثل ہیں یا نہیں؛ مسئلہ تماثلِ اجسام کے متعلق دو قول مشہور ہیں۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو جو شخص یہ کہے گا کہ خدا جسیم ہے اور اُس سے وُہ مراد یہ لے گا کہ وُہ اجزاء سے مرکب ہے تو اس کا قول باطل ہے اور جو شخص یہ کہے گا کہ وُہ مخلوقات میں سے کسی کی مانند ہے تو یہ بھی باطل ہے کیونکہ شرعًا اور عقلًا یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی دوسری چیز سے متماثل

نہیں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے کسی صفت میں مثل ثابت کرے وُہ جھوٹا ہے۔ اس معنیٰ میں جو شخص خدا کا جسم ثابت کرے وُہ ہرزہ سرا اور دروغ گو ہے اور جو شخص اس معنیٰ میں عدم تجسیم کا قائل ہو کہ وُہ قیامت میں دکھائی نہ دے گا وُہ قرآن اور دیگر کتابوں وغیرہ کے ذریعے باتیں نہیں کرتا۔ علم اور قدرت وغیرہ صفات اُس کے ساتھ قائم نہیں اور ہاتھ دُعا کے لیے اس کی طرف نہ اٹھائے جائیں، رسول کو اس کی طرف معراج نہیں ہوا، اس کی طرف پاک کلمات صعود نہیں کرتے، ملائکہ اور روح (جبریل یا رُوح البشر) اس کی طرف بلند نہیں ہوتے تو یہ قول بھی باطل ہے۔ جو بات خدا و رسول نے ثابت کر دی ہو اُس کی نفی باطل ہے، خواہ وُہ تجسیم کے نہ ماننے ہی سے کیوں نہ کی جاتے اور اس اثبات کو تجسیم سے موسوم کرنا قائل کی تلبیس ہے کیونکہ اگر مراد ان امور کا اقتضاء ہے کہ اللہ جواہر منفردہ سے یا مادہ وصورت سے مرکب جسم ہو یا قائل کا یہ خیال ہو کہ ان امور سے اللہ کا جسم ہونا لازم آتا ہے اور اجسام ایک دوسرے کے متماثل ہوتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اکثر عقلاء اجسام مخلوقہ کے تماثل و ترکیب کے مخالف ہیں، وُہ یہ بھی نہیں کہتے کہ ہوا پانی کے مانند ہے یا یہ کہ حیوان لوہے اور پہاڑوں کے مانند ہیں۔ تو وُہ اس بات میں کیونکر اتفاق کر سکتے ہیں کہ جب کتاب و سنت کے مطابق خدائے تعالیٰ کے چند اوصاف ثابت کیے جائیں تو ان سے اس کا اپنی مخلوق سے تماثل لازم آئے۔ اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات میں بھی مماثلات کی نفی فرما دی ہے حالانکہ وُہ دونوں جسم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔	اور اگر تم رُوگردانی کرو گے تو وُہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لا کر بٹھا دے گا، پھر وُہ تمہاری مثل نہ ہوں گی۔

(سورۃ محمد آیت ۳۸ پارہ ۲۶)

جب دونوں ذی جسم اور ایک ہی نوعِ بشریت سے تعلق رکھنے والی قومیں باہم متماثل نہیں ہوسکتیں تو یہ کہنا کیونکر جائز ہے کہ رب السمٰوٰت کے ذی علم و صاحب قدرت ہونے سے اُس کا اپنی مخلوق سے تماثل لازم سمجھا جائے؟ اللہ تعالیٰ کی مثل کوئی چیز نہیں، وُہ اپنی ذات، اپنی صفات، اور اپنے افعال میں بالکل یکتا ہے۔

اس بات میں نکتہ صرف یہ ہے کہ نافیؔ اوصافِ باری کے اعتقاد میں جسم تمام اجسام کی مماثلت کو اور جواہر منفردہ یا مادہ وصورت سے مرکب ہونے کو مستلزم ہے۔ حالانکہ اکثر عقلاء مسئلۂ تلازم میں اس نافی کے مخالف ہیں اور اس تلازم کی نفی بہ اتفاق فریقین ہو چکی ہے اور یہی مطلوب ہے۔

جب انھوں نے اس نقص کی نفی پر اتفاق کر لیا جس سے شرعًا اور عقلًا اللہ تعالیٰ بری ہے۔ تو اب بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ آیا جسم اصطلاحی اس نقص ممنوع کو مستلزم ہے؟ یہ بحث عقلی ہے۔ اور بالکل اُس بحث کی طرح ہے کہ آیا زمین باقی رہے گی یا نہیں۔ اس عقلی بحث سے مسلمانوں کا دین وابستہ نہیں ہے، کتاب، سنت اور روایاتِ سلف اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق لفظِ "جسم" کے استعمال سے نفیاً یا اثباتًا بالکل ساکت ہیں۔

جب کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ ایک ایسا مجمل نام گھڑ نکالے جسے مختلف معانی پر محمول کیے جانے کا احتمال ہو اور اس کے استعمال کی کوئی دلیل و برہان شریعت میں موجود نہ ہو اور نہ اُسے دینِ مسلمین کے ساتھ کوئی تعلق ہو۔ اگرچہ وُہ لغتِ عربی میں مستعمل ہو، تو یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ کسی لفظ کے لیے دوسرے معنی پیدا کیے جائیں؟ جو معنی مراد ہوں اگر وُہ صحیح ہوں تو انھیں ایسی عبارت سے تعبیر کیا جائے جس میں کوئی التباس نہ ہو۔

جب کسی شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ اجسام متماثل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مثل

کوئی چیز نہیں ہے نہ اس کا کوئی ہمتا ہے اور نہ کوئی مقابل و شریک ہے، تو یہ قرآن کریم کی عبارات ہیں جو اس معنی کو بلا تلبیس و نزاع ادا کر دیتی ہیں۔ اگر اس شخص کا عقیدہ یہ ہو کہ اجسام غیر متماثل ہیں اور جو چیز محسوس و مرئی ہو اور اس کے ساتھ صفات قائم ہوں وہ جسم ہے تو اس شخص پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات علم، قدرت وغیرہ کا اثبات کرے کیونکہ یہ اللہ اور رسول نے خود ثابت کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ۔ ۲:۲۵۵	اور اللہ تعالیٰ کے علم میں سے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے البتہ اتنا سمجھ سکتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے انہیں بتلا دے۔
إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ۔ ۵۱:۵۸	اللہ تعالیٰ ہی بڑا رزق دینے والا، قوت والا زبردست ہے۔

حدیث استخارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حسب ذیل قول مروی ہے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ۔

اے اللہ میں تیرے علم غیب اور قدرتِ تخلیق سے طالبِ خیر کرتا ہوں۔

جو شخص یہ کہے کہ جو چیز محسوس و مرئی ہو اور جس کے ساتھ صفات قائم ہوں وہ جسم ہوتی ہے، اس شخص پر لازم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہے۔

إِنَّكُمْ تَرَوْنَ رَبَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِيَانًا كَمَا تَرَوْنَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا تُضَامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ۔ تم اپنے رب کو قیامت کے دن اس طرح دیکھو گے جس طرح شمس و قمر کو دیکھتے ہو۔ تمہارے ساتھ رویتِ باری میں بخل نہیں کیا

جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "رؤیت" کو رؤیت سے تشبیہ دی ہے اگرچہ ایک مرئی (یعنی خدا) دوسرے مرئی (یعنی دُنیا کی کوئی چیز) کے مانند نہیں ہے۔ جو لوگ کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ کا اتباع کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اس صحیح معنی کی یہ عبارتیں بلا تلبیس و نزاع مسلم ہیں۔ اس کے بعد جب کسی شخص پر عقلاً ایسے معنی منکشف ہوتے ہوں جو حق کے مطابق ہوں تو وُہ انھیں ردّ نہ کرے کیونکہ حق، حق سے مل گیا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ شریعت اُن معنی کی واضح طور پر تائید کرے اور شرعی الفاظ سے ان کا اثبات ہوتا ہو۔ اگر شریعت میں ان کے متعلق کوئی دلیل موجود نہ ہو تو ان پر اعتقاد رکھنا لوگوں کے لیے واجب نہیں ہے اور نہ کسی پر یہ حق پہنچتا ہے کہ عوام کو ان کی طرف دعوت دے خواہ وُہ فی نفسہٖ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔

مسئلہ تماثل اور ترکیب اجسام میں اختلاف

تماثل اجسام اور ان کے جواہر منفردہ سے مرکب ہونے کے مسئلے میں اہل کلام کا بے حد اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں، جو کبھی ایک بات بیان کرتے ہیں اور کبھی دوسری۔ اس کثرتِ اختلاف کی اصل وجہ الفاظ مجملہ اور معانی متشابہ ہیں۔ کسی دوسرے مقام پر یہ مسئلہ لبسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ مقصود ہے کہ اگر بالفرض انسان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ اجسام متماثل نہیں ہیں اور نہ وُہ جواہر منفردہ یا مادہ و صورت سے مرکب ہیں تو اس صورت میں بھی جائز نہیں ہے کہ اس نام سے ایک نئی بات گھڑ لے اور جو معانی اس کی عقل نے پیدا کیے ہوں ان کی بناء پر مناظرہ شروع کر دے بلکہ یہ معنی شرع و عقل کی رُو سے معلوم ہیں اور ان کا اظہار ایسی عبارت میں ممکن ہے جس میں کسی طرح کا اجمال اور کسی طرح کی تلبیس نہ ہو۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جسم جواہر سے

مرکب ہے۔ ان میں سے بہت لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ لغتِ عرب ان کی مؤید ہے۔ کیونکہ عرب کہا کرتے ہیں "هٰذَا اَجْسَمُ مِنْ هٰذَا" جس سے اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ اُس کی نسبت زیادہ اجزاء رکھتا ہے اور کہتے ہیں کہ "یہ جسیم" ہے یعنی اُس کے اجزاء بہت ہیں ان کا قول ہے کہ "افعل کے وزن پر تفضیل آتی ہے تو اس صیغے کا اسم مفضل پر دال ہوتا ہے"۔ جب کہا جاتا ہے کہ هذا اعلم و احلم تو اس وقت مشار الیہ پر علم وحلم کے اسماء دلالت کرتے ہیں۔

سو جب کسی کثیر الاجزاء وجود کے متعلق اَجْسَمُ کا لفظ استعمال کیا جائے تو جسم سے اُن کی مراد مرکب چیز ہوتی ہے۔ جس شخص نے جسم کا لفظ استعمال کیا اور مرکب مراد نہ لیا تو وُہ لغتِ عرب کے دائرے سے باہر نکل گیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص خصائص جسم یعنی ترکیب۔ تالیف کا قائل نہ ہو۔ گو ہم اس کی تکفیر نہیں کرسکتے۔ لیکن اسے ایک لفظی خطاء کا مرتکب ضرور سمجھتے ہیں۔ خود ان لوگوں میں سے بعض نے هٰذَا اَجْسَمُ مِنْ هٰذَا کے قول پر باہم جھگڑا کیا ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ لفظ لغتِ عرب میں نہیں ہے۔ چنانچہ ابو زید سے یہی منقول ہے۔

بہرحال ان لوگوں کو یہ جواب دیا جائے گا کہ بیشک عرب هٰذَا جَسِیْمٌ "یہ جسیم ہے"، کو هٰذَا عَظِیْمُ الْجُثَّةِ (اس کا جسم بڑا ہے) کے معنی میں اور اَجْسَمُ کو اَعْظَمُ جُثَّةً میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ "عرب اس سے کثرتِ اجزاء و جواہرِ منفردہ مراد لیتے ہیں، صرف اس صورت میں صحیح ہوسکتا ہے جب اہلِ لغت سارے کے سارے قطعی طور پر اس امر کے معتقد ہوں کہ جسم، جواہرِ منفردہ سے مرکب ہے۔ جواہر فرد اس چیز کا نام ہے جو اس قدر باریک اور چھوٹی ہو کہ اُس کے دائیں بائیں کی تمیز نہ ہوسکے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ انسانوں میں سے اکثر عقلاء

جوہر فرد کا تصور ہی نہیں کرتے اور جو لوگ تصور کرتے ہیں وہ اسے ثابت نہیں کرتے۔ اور جو لوگ اسے ثابت کرتے ہیں، ان کو بھی نہایت پر تکلف لمبی چوڑی اور دُور از کار تاویلات سے کام لینا پڑتا ہے۔

سو یہ ممتنع ہے کہ یہ لفظ لغت میں رائج ہوا ہو، زبان زد خواص و عوام ہو، اور لوگوں نے اس سے مراد یہ لی ہو۔

جوہرِ فرد اور سلفِ اسلام

یہ بات تواتر سے معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین علیہ الرحمۃ والرضوان میں سے کسی نے اثباتِ جوہر فرد کا نام تک بھی نہیں لیا اور نہ اُن کے کسی قول و فعل سے اس کے ثبوت پر کوئی دلالت مترشح ہوتی ہے، صحابہؓ سے پہلے بھی اہل عرب میں سے کسی نے جوہر فرد کی تائید نہیں کی۔ باقی جس قدر اقوام فطرت پر قائم ہیں یا جنھوں نے پیغمبروں کا اتباع کیا ہے، وُہ جوہر فرد کی قائل نہیں تھیں۔ پھر ان کے متعلق یہ دعوے کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے "جسم" کا لفظ صرف مرکب متولف شئے" کے لیے استعمال کیا۔ کسی عرب سے کہو، کہ سورج، چاند، آسمان یا پہاڑ، ہوا، حیوانات یا نباتات ایسے چھوٹے چھوٹے اجزاء سے مرکب ہیں جن میں سے ہر ایک لاتیجزیٰ ہے تو وُہ شخص اس بات کا تصور ہی نہ کر سکے گا اور اگر بمشکل تصور کرے گا، تو اس کی فطرت اُسے جھٹلائے گی اور وہ کہے گا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی چیز کے دائیں بائیں میں امتیاز نہ ہو سکے۔

مسلمانوں اور دیگر جماعتوں میں سے اکثر عقلاء جوہر فرد کے منکر ہیں، فقہاء تو قطعی طور پر اس سے انکار کرتے ہیں۔ اہل حدیث اور اربابِ تصوف کا بھی یہی حال ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک یہ بات متفق علیہ ہے کہ بعض اجسام دوسرے اجسام میں مستحیل ہو جاتے ہیں، مثلاً گندگی راکھ بن جاتی ہے، اور خنزیر

نمک کی کان میں سے

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت شد نمک شد

کا مصداق بن جاتا ہے۔

پھر فقہاء نے اس امر پر بحث کی ہے کہ آیا یہ استحالہ (تبدیل حالت) ظاہر ہوتا ہے یا ظاہر نہیں ہوتا۔ جو لوگ جوہر فرد کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ذاتی حالتیں نہیں بدلتیں، بلکہ یہ جواہر دوسری صورت میں بھی بعینہ وہی رہتے ہیں جو پہلی صورت میں ہوتے ہیں۔ صرف ترکیب بدل جاتی ہے، اس لیے فقہائے متاخرین میں سے بعض نے متکلمین سے ترکیب کا خیال اخذ کر کے پانی وغیرہ کی ترکیب میں بحث کی ہے، اور کہا ہے کہ پانی صرف ترکیب میں اپنے غیر سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قائلین فرد کا قول ہے کہ ہم نے کبھی اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان وجودوں کو حادث پیدا کیا ہو جو خود بخود قائم ہیں، بلکہ اس کی ساری مخلوق حیوانات، نباتات، معدنیات، میوہ جات، بارش، بادل وغیرہ سب جواہر کی جمع و تفریق اور ان کی صفات کے ایک حالت سے دوسری حالت میں تغیر و تبدل کا کرشمہ ہے۔ یہ نہیں کہ وہ جواہر یا ان اجسام میں سے جو قائم بنفسہٖ ہیں۔ کسی کو نئے سرے سے پیدا کرتا ہے۔ اس قول سے اکثر اربابِ دانش و بینش صاف انکار کرتے ہیں اور اسے حس، عقل اور شرع کے خلاف بتاتے ہیں۔ چہ جائیکہ اس بات کی بحث چھیڑی جائے کہ "جسم" لغت عرب کی رو سے اس معنی کو مستلزم ہے۔

پھر جسم سے کبھی خود فربہی مراد ہوتی ہے اور یہ عرض ہوتی ہے جو غیر کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ اور کبھی اس سے موٹی چیز مراد لی جاتی ہے اور یہ قائم بنفسہٖ ہوتی ہے ہم کہتے ہیں، هٰذَا الثَّوْبُ لَهُ جِسْمٌ (اس کپڑے کا جسم ہے) یہاں جسم سے مراد غلظ (موٹاپا) ہے۔ "وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" سے بعض نے یا استدلال

کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کے بدن کی مقدار دوسرے لوگوں کے بدن کی نسبت زیادہ بنائی تھی۔ پس جسم سے مراد خود مقدار ہوئی، نہ کہ نفس مقدر، اسی طرح " تعجبك اجسامهم" میں اجسامھم سے مراد وہ صورتیں ہیں جو اُن کے ابدان کے ساتھ قائم ہیں جس طرح آپ کہتے ہیں کہ اَعْجَبَنِیْ حُسْنُہٗ وَجَمَالُہٗ وَلَوْنُہٗ وَبَهَاءُہٗ (مجھے اس کا حسن و جمال، اس کا رنگ اور اس کی زیبائی پسند آئی) سو کبھی صفت ابدان مراد ہوتی ہے اور کبھی خود ابدان مراد ہوتے ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ هٰذَا اَجْسَمُ مِنْ هٰذَا (یہ شخص اس شخص کی نسبت زیادہ جسیم ہے۔) تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ موٹا اور زیادہ بڑے جسم والا ہے۔

دورِ تکلّم و تفلسف کی بدعت

البتہ یہ بات کسی لغت دان کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزری کہ اس بڑائی اور فربہی کی وجہ زیادتِ اجزا ہے۔ یہ محض اسی دورِ تکلم و تفلسف کی بدعت ہے۔ جب صحابہؓ کا زمانہ گزر چکا تھا اور اکثر تابعین راہگیر عالم جاودانی ہو چکے تھے، اسلام اس بات سے قطعًا ناآشنا ہے کہ کسی نے اس لفظ یا اس کے معنی پر کلام کیا ہو۔ البتہ خاندان "بنی امیہ" کے آخری دور میں جب جہم بن صفوان اور جعد بن درہم پیدا ہوئے اور معتزلہ نے سر اٹھایا تو اس طرح کی باتیں سنی جانے لگیں۔

سو یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی آدم میں سے اکثر عقلاء اس بات کے خلاف ہیں کہ جسم مولف و مرکب ہے اور جواہر منفردہ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ سلف صالحین میں سے کسی کے متعلق منقول نہیں ہے کہ اس نے اس عقیدے سے اتفاق کیا ہو قائلینِ ترکیب لفظ "جسم" کے ایسے اصطلاحی معنی بیان کرتے ہیں کہ لغت کے لحاظ سے یہ لفظ اُن معنی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ ایک عقلی دعوے پیش کرتے ہیں جو طویل نزاع کا سرمایہ دار ہے اور شریعت کی ذرہ بھر تائید بھی اُسے

حاصل نہیں۔ جس معنی کی نفی اللہ تعالیٰ کی ذات سے واجب ہے، اس کے لیے ان کے عقلی اختراعات وابداعات کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ہمیں اضطراراً معلوم ہے اس کے لیے لفظ کی دلالت اور ان کے لیے مزعومہ عقلی معنی کی تحقیق غیر ضروری ہے بلکہ جو لوگ تنزیہ باری کے لیے جسم کے مسمّٰی کی نفی پر تکیہ کرتے ہیں، وُہ ذاتِ باری تعالیٰ کو قطعاً کسی نقص سے بھی منزہ ثابت نہیں کر سکتے۔ جہاں وُہ یہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں صفاتِ اجسام میں سے ہیں، وہاں وُہ سب باتیں بھی صفاتِ اجسام میں سے ہیں جنھیں وُہ ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً خدا کا حیّ، علیم اور قدیر ہونا، بلکہ اس کا موجود اور قائم بنفسہٖ ہونا بھی صفاتِ اجسام میں سے ہے۔

ان لوگوں کو ان صفات کی پہچان مشاہدے میں صرف جسم کے توسّط سے ہوئی ہے۔ جب مناظر ان سے کہے کہ تمہارے اس قول میں جس کے ذریعہ سے تم نفی کرتے ہو، اثبات کی دلیل موجود نہیں ہے تو وُہ ساکت ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے مستحق صفاتِ کمال ہونے کے متعلق ان لوگوں کے دو قول ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس بات کا علم فقط اجماعی ہے دُوسرے کہتے ہیں کہ عقلی بھی ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اسے عقل سے معلوم نہیں کیا، ان میں "ابوالمعالی" "رازی" وغیرہ شامل ہیں۔ ان لوگوں کے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے جس کے ذریعے سے وُہ اللہ تعالیٰ کو نقائص سے منزہ ثابت کریں۔ یہ اس وقت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کو صرف اُن باتوں سے منزہ ثابت کیا جائے جس سے اُس کی تنزیہ واجب ہے یعنی اُس کے متعلق نقائص کی نفی کی جائے کیونکہ نقائص سے ذاتِ باری کی تنزیہ واجب ہے۔ نیز اسے مماثلتِ مخلوقات سے منزہ کیا جائے، کیونکہ جہاں ذاتِ باری تعالیٰ کو ہر طرح کے نقص وعیب سے پاک قرار دینا واجب ہے۔ وہاں یہ بھی واجب ہے کہ اُن صفاتِ کمال میں جو اس کے لیے ثابت ہیں، کوئی مخلوق اُس کی مماثل نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے لیے جو تنزیہ واجب ہے وُہ ان دو قسموں پر مشتمل ہے۔ اور قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ کی دلالت ان دو قسموں پر ہے۔ "لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" میں "اَحَدٌ" کا لفظ مماثلت و مشارکت کی نفی کرتا ہے اور "صمد" جمیع صفاتِ کمال پر مشتمل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے نقائص ممتنع ہیں!

نقائص من حیث الجنس اللہ تعالیٰ کی ذات سے ممتنع ہیں۔ جو چیز بھی مخلوق کے ساتھ مختص ہو وُہ ان نقائص میں داخل ہے جن سے پروردگار کو منزہ قرار دینا واجب ہے۔ بندے کے ساتھ علم، قدرت اور رحمت وغیرہ صفات موزوں ہیں۔ یہ نقائص نہیں ہیں، لیکن یہی معانی خدا کے متعلق ایسی صورت میں ثابت ہیں کہ مخلوقات میں سے کوئی ان اوصاف میں خدا کے قریب بھی نہیں پہنچتا۔ چہ جائیکہ اس کا مماثل ہو بلکہ خدا نے جنت میں کھانے پینے اور پہننے کی جو چیزیں پیدا کی ہیں، وُہ ان چیزوں کی مماثل نہیں ہیں جو اس نے دنیا میں پیدا کی ہیں اگرچہ نام میں دونوں برابر ہیں اور دونوں مخلوق ہیں۔

ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "جنت کی چیزوں میں سے دُنیا میں ناموں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جنت میں دودھ، شراب، شہد، پانی، ریشم، سونا اور چاندی ہو گی اور یہ چیزیں دُنیا کی چیزوں کی مانند نہ ہوں گی۔ حالانکہ دونوں مخلوق ہیں۔ جب مخلوق کی مخلوق کے ساتھ مماثلت مستبعد ہے تو مخلوق کی خالق کے ساتھ مماثلت تو بدرجہا بڑھ کر مستبعد ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا نام علیم، حلیم، رؤف، رحیم، سمیع، بصیر، عزیز، ملک، جبار، متکبر، مؤمن، عظیم، کریم، غنی، شکور، کبیر، حفیظ، شہید، حق، وکیل، ولی رکھا اور اپنی بعض مخلوق کے نام بھی یہی رکھے، انسان بھی سمیع و بصیر ہوتے ہیں نبی ﷺ کا نام "رؤف و رحیم" رکھا۔

بعض بندوں کو ملک، بعض کو شکور، بعض کو عظیم اور بعض کو حلیم و علیم کہا گیا۔ تاہم معلوم ہے کہ مخلوق میں سے ان اسماء کے مسمیٰ کسی بات میں بھی خالق جل جلالہ کے مماثل نہیں ہو سکتے۔

تحیّز و جہت اور ذاتِ باری تعالیٰ

تحیّز اور جہت وغیرہ الفاظ میں بھی اسی طرح کا نزاع ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا متحیّز ہے اور وہ ایک جہت (جانب) میں ہے۔ بعض کہتے ہیں، خدا متحیز نہیں۔ اور نہ اُس کی کوئی جہت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ جہت میں تو ہے لیکن متحیز نہیں اور متحیّز کے لفظ میں جسم اور جوہرِ فرد شامل ہیں اور لفظ "جوہر" سے کبھی متحیّز مراد لیا جاتا ہے اور کبھی جوہر، فرد۔

بعض فلاسفہ کا دعوٰی ہے کہ ایسے جواہر موجود ہیں جو خود قائم اور غیر متحیّز ہیں متاخرینِ اہلِ کلام، مثلاً شہرستانی، رازی، آمدی وغیرہ کہتے ہیں کہ عقلاً یہ دعوٰی محال نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ ان لوگوں کے طریق پر چلے ہیں اور کہتے ہیں کہ حدوثِ عالم، حدوثِ اجسام کے ذریعے سے ثابت ہوتا ہے، وہ جواہرِ عقلیہ کے وجود کی تقدیر پر ایسا کہتے ہیں اور اس دلیل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے اُن کا حدوث ثابت ہو سکے۔

حدوثِ اجسام اور تصوراتِ نفس

اس لیے ایک جماعت جس نے کلام کو فلسفے سے خلط ملط کیا ہے، قدمِ جواہرِ عقلیہ اور حدوثِ اجسام کی قائل ہے اور کہتی ہے کہ حدوثِ اجسام کا سبب تصوراتِ نفس میں سے ایک تصور کا حدوث ہے۔ بعض اہلِ مصر کا بھی یہی قول ہے اسی طرح اموی" صاحب اللباب" نے دوامِ فاعلیت پر فلاسفہ کے شبہ کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ حدوث کے لیے سبب لابدی ہے۔ یہ جواب اُس نے کلام رازی

سے اخذ کیا ہے۔ مطالب عالیہ میں رازی کلام فلاسفہ کو کلام متکلمین کے ساتھ خلط ملط کر گیا ہے۔ اور یہ بات حدوث و قدم کے مسئلے میں جائز ہے، یہ جواب سب سے زیادہ فاسد ہے، کیونکہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حدوثِ اجسام کا سبب تو حدوثِ تصورات ہوا، لیکن ان تصورات کے دائمی حدوث کا کیا سبب ہے؟

پھر ان لوگوں کے نزدیک نفس کا جسم کے ساتھ متصل رہنا لابدی ہے اور نفس کا جسم کے بغیر وجود ممتنع ہے، نیز جمیع رسل کا یہ دین رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا باقی ساری کائنات مخلوق و حادث ہے۔ عدم سے وجود میں آئی ہے نیز فلاسفہ جس چیز کو جواہر عقلیہ کہتے ہیں، ان کا وجود ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے۔ اکثر متکلمین کہتے ہیں کہ عقلاً جواہر عقلیہ کی نفی ضروری ہے۔

جواہر عقلیہ کا خارج میں کوئی وجود نہیں

اس موضوع پر کسی اور جگہ بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ فلاسفہ جن جواہر عقلیہ کے اثبات کا دعوےٰ کرتے ہیں، وُہ عقل، نفس، مادہ اور صورت ہیں اور ان چیزوں کا خارج میں کوئی وجود نہیں صرف ذہن میں ان کا تعقل ہو سکتا ہے۔ عقل ان کو اعیان سے اسی طرح ثابت کرتی ہے جس طرح اصناف کے درمیان کلیاتِ مشترکہ مثلاً حیوانیہ کلیہ اور انسانیہ کلیہ کو علیحدہ کرتی ہے، اور کلیات اذہان میں ہوتے ہیں نہ کہ اعیان میں۔ ان لوگوں میں سے بعض کا خیال ہے کہ کلیاتِ خارج میں ہوتے ہیں اور خارج میں ایسے کلیہ کی ماہئتیں ہوتی ہیں جو اعیان سے مقارن ہوتا ہے۔ موجوداتِ معیّنہ اور جزئیں ہوتی ہیں۔ انہی میں سے بعض ایسے کلیات ثابت کرتے ہیں جو اعیان سے علیحدہ ہوتے ہیں اور ان کو وُہ "مثل افلاطونیہ" سے موسوم کرتے ہیں۔ بعض "دہر" کو حرکت

اور اشیائے متحرکہ سے خالی ایک ایسا خلا تے مجرّد ثابت کرتے ہیں جو نہ خود متحیز ہو اور نہ متحیز کے ساتھ قائم ہو۔ نیز وہ ہیولیٰ کو ساری صورتوں سے خالی ثابت کرتے ہیں۔ اُن کی لغت میں ہیولیٰ محل کے معنی میں آتا ہے۔ چاندی، انگوٹھی اور درہم کا اور لکڑی، کرسی کا ہیولیٰ کہلاتی ہے۔ یعنی یہ ایک محل ہوتا ہے جس میں یہ صورت بنائی جاتی ہے، اور یہ مصنوعی صورت اعراض میں سے ایک عرض ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا دعوٰے ہے کہ جسم ہیولیٰ صورت جسمیہ کا محل ہوتا ہے نہ کہ خود قائم بنفسہٖ جسم، اور یہ دعوٰے غلط ہے یہ مفروضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امتداد (کھینچنا) ہر ممتد (کھینچی ہوئی چیز) سے عدد، ہر معدود سے اور مقدار ہر مقدّر (اندازہ کی ہوئی چیز) سے علیحدہ ہے۔

یہ سب باتیں ذہنی مفروضات ہیں، اعیان میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے اس بات کا اعتراف ان متکلمین نے بھی کیا ہے جن کی عادت میں فلاسفہ کی نصرت تائید داخل ہے۔ اور اس امر کی تشریح کسی دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ کی جا چکی ہے۔

سو جواہر عقلیہ جنھیں فلاسفہ ثابت کرتے ہیں، تصورِ تام کے بعد عقلِ صریح خارج میں ان کے وجود کی نفی کرتی ہے جن ملائکہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے ارسطو کا اتباع کرنے والے فلاسفہ انھیں نہیں پہچانتے، نہ اُن کی نفی کرتے ہیں اور نہ اثبات، نبوّتوں کے متعلق بھی ان کا یہی رویّہ ہے۔ نہ تو وہ نبوّتوں کا ذکر نفیاً کرتے ہیں اور نہ اثباتاً۔ البتہ متاخرین فلاسفہ یعنی ابن سینا وامثالہ نے اس پر بحث کی ہے جو نبوّتوں اور فلسفوں میں اتفاق پیدا کرنا چاہتے تھے اور اسی غرض سے انھوں نے تلبیس و تدلیس کا بازار گرم کیا۔

فلاسفہ کے نزدیک حرکت فلک کا سبب

اسی طرح فلاسفہ وجود عالم کی علتِ اولیٰ کو علتِ غائیہ ثابت کرتے ہیں جس سے تشبّہ قائم رکھنے کے لیے فلک حرکت کرتا ہے۔ وہ

فلک کو اسی طرح حرکت میں لاتی ہے جس طرح امام، مقتدی کی حرکت کا باعث ہوتا ہے، ان کی لغت میں لفظ "الٰہ" سے مراد امام متبوع ہے جس سے تشبہ کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک فلک، الٰہ سے تشبہ کرنے کے لیے حرکت کرتا ہے اسی لیے فلاسفہ نے اعلیٰ فلسفہ اور اولین حکمت اس بات کو قرار دیا ہے کہ طاقت کے مطابق الٰہ (معبود) سے تشبّہ کیا جائے اور کلامِ ارسطو کا مدار بھی یہی ہے، جیسا کہ "علم ما بعد الطبیعت" کے مقالہ لام اور دیگر ابواب سے معلوم ہوتا ہے اور کبھی وُہ علتِ اولیٰ کے فلک کے لیے باعثِ حرکت ہونے کو معشوق و عاشق سے تشبیہ دیتا ہے۔

البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ عاشق تو اس لیے حرکت کرتا ہے کہ اسے معشوق سے محبّت ہوتی ہے، یا اُس سے کوئی غرض حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن فلک کی حرکت ایسی نہیں، وُہ محض اس لیے حرکت کرتا ہے کہ علتِ اولی سے تشبّہ کرے۔ اسے صرف تشبہ سے محبّت ہے۔ اس کی حرکت کا مقصد یہ نہیں کہ وُہ محرک (علتِ اولیٰ) کی عبادت کرنا چاہتا ہے، یا اُسے اس چیز سے محبت ہے جو وُہ علتِ اُولیٰ سے حاصل کرے گا۔ ارسطو کہتا ہے کہ یہ حرکت ویسی ہی ہے جیسے نوا میس کی حرکت اپنے اتباع کے لیے ہوتی ہے۔

ان فلاسفہ کے نزدیک "ناموس" شہروں کی اُس سیاستِ کلیہ کا نام ہے جسے اربابِ عقل اپنی دنیوی مصلحت کے لیے وضع کرتے ہیں تاکہ وُہ باہم ظلم نہ کریں اور ان کی دُنیا درہم برہم نہ ہو جائے، ان میں سے جو لوگ نبوتوں کو تسلیم کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ شرائع انبیاء ان نوامیس کی جنس سے ہیں اور ان سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قانونِ عدل وضع کر کے دُنیا کے لیے بہتری کا سامان کیا جائے۔ اس لیے ابن سینا وغیرہم نے اس ناموس کے وضع کرنے کے لیے نبوت کو واجب ولابدی قرار دیا ہے اور چونکہ ان کے نزدیک حکمتِ عملیہ، خلقی، منزلی اور مدنی ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے ان عبادات

شرائع اور احکام کو بھی جو پیغمبروں کے توسط سے آتے ہیں، اسی حکمت کی جنس سے قرار دیا ہے جو خلقی، منزلی اور مدنی ہے۔

سو یہ لوگ خدا کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ وہ معرفتِ باری سے کفارِ یہود و نصاریٰ کی نسبت بہت زیادہ دُور ہیں اور ان لوگوں کا معلم اوّل ارسطو، رب العالمین کی ذات کے متعلق انتہا درجہ کا جاہل تھا۔ البتہ ان لوگوں کو امور طبیعہ سے اچھی واقفیت ہوتی ہے یہی ان کے علم کا سمندر ہے اور اسی میں مشغول رہتے اور اپنا سارا وقت اسی میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ان کا حصّہ بہت ناقص و قلیل ہے۔ خدا کے ملائکہ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو تو وہ قطعاً تسلیم نہیں کرتے اور نفیاً یا اثباتاً اس پر بحث کرنے سے مجتنب رہتے ہیں۔ متاخرین فلاسفہ جو حلقۂ مذاہب میں داخل تھے، اس موضوع پر تعرض کرتے ہیں۔

قدمائے یونان تمام لوگوں سے بڑے مشرک و ساحر تھے، کواکب و اصنام کی پرستش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے، کہ علمِ ہیئت و کواکب کی طرف اُن کی توجہ بہت مبذول رہی ان کے لیے مجسمے بنوایا کرتے تھے، ان کا آخری بادشاہ "بطلیموس" صاحب "مجسطی" جب دورِ نصرانیت میں رُوم میں داخل ہوا تو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین کا ظہور ہُوا، اُس نے شرک کو باطل کہا۔ بعض لوگوں نے دینِ مسیح ؑ کو بدل کر توحید و شرک کا ایک مرکب دین مرتب کیا، یہ نئے لوگ سورج، چاند اور کواکب کی عبادت کرتے اُن کی نمازیں پڑھتے اور انھیں سجدے کرتے تھے۔ پھر قسطنطین شاہ نصاریٰ اور اس کے متبعین آئے، ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کی۔ اور وہ سورج کو سجدہ کرنے کے بجائے سورج کی طرف منہ کرنے لگے۔ یہ لوگ اجسام مجسدہ کی پرستش کرتے تھے جن کا سایہ بھی ہوتا تھا۔ پھر نصاریٰ آئے اور انھوں نے گرجوں میں مقدس بزرگوں کی تصویریں بنائیں۔ سایہ دار اور قائم بنفسہٖ بتوں کے بجائے دیواروں

اور چھتوں میں تصویریں بنوائی گئیں۔

ارسطو، سکندر بن فیلقوس مقدونی کا وزیر تھا اور مسیح سے تقریباً تین سو برس پہلے گزرا ہے۔ جو لوگ ان فلاسفہ کی عظمت کے قائل ہیں، ان کا خیال ہے کہ ارسطو اسی ذوالقرنین کا وزیر تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اور یہ جہالت ہے کیونکہ ذوالقرنین اس سے بہت مدت پہلے ہو گزرا ہے، ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کے لیے دیوار بنائی ہے اور یہ سکندر مقدونی صرف بلاد ایران تک پہنچا ہے اور دیوار بنانا تو درکنار، وہ چین تک بھی نہیں پہنچا۔

ملائکہ کی تعداد خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، زندہ ہیں، باتیں کرتے ہیں، زمین پر اترتے ہیں، آسمانوں پر چڑھتے ہیں اور خدا کے اذن کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خبر دی ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا- سُبْحَانَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ- لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ- يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ- (۲۱:۲۷)	اور کہتے ہیں کہ رحمان نے اولاد بنالی ہے۔ حالانکہ وہ پاک ہے اولاد تو کوئی نہیں البتہ معزز بندے (فرشتے ہیں) وہ اس سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کرتے وہ اس کے حکم کے مطابق کام کرتے ہیں، اللہ ان کے سامنے کی چیزوں کو اور ان کے پیچھے کی چیزوں کو جانتا ہے وہ اس کے لیے سفارش کرتے ہیں، جسے خدا پسند کرے اور وہ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔
وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ	آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ البتہ

بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى۔	اس وقت شفاعت سے فائدہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ جسے چاہے اور پسند کرے اسے اذن دے دے۔

اسی طرح کی اور بہت سی نصوص سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

ان لوگوں کا دعوٰی ہے کہ عقلیں قدیم اور ازلی ہیں۔ عقل فعال آسمان کے نیچے کی ساری چیزوں کی رب ہے اور عقل اول آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کی رب ہے۔ بنی عبید کے متبعین میں سے جو ملاحدہ ان میں شامل ہوئے مثلاً "رسائل اخوان الصفا" کے مصنفین وغیرہ، نیز ملاحدہ متصوفین، مثلاً ابن عربی، ابن سبعین وغیرہ۔ وہ اس دعوٰی کی تصدیق میں یہ موضوع حدیث پیش کرتے ہیں، کہ "سب سے پہلے جو چیز اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے وہ عقل ہے" ابو حامد غزالی کی تصانیف سے بھی ان لوگوں کے معانی کا بہت بڑا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

کلمۃ الحق ارید بہا الباطل

وہ (غزالی) ان کے مذہب کو ملک، ملکوت اور جبروت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے اُن کی مراد جسم، نفس اور عقل ہے۔ سو یہ لوگ ان اسلامی عبارات کو لے کر فلاسفہ کے رنگ میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہ عبارات مسلمانوں کے ہاں مقبول ہیں۔ اس لیے جب وہ انھیں سنتے ہیں تو قبول کر لیتے ہیں۔ پھر جب انھیں ان لوگوں کے معانی کا علم ہوتا ہے جو وہ ان الفاظ میں داخل کرتے ہیں تو جن لوگوں کو دین اسلام کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی وہ گمراہ ہو جاتے ہیں جو معنی یہ بے دین لیتے ہیں، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، مثلاً موسیٰؑ، عیسیٰؑ وغیرہما علیہم السلام نہیں لیتے تھے۔ اس لیے اس التباس کے باعث متاخرین میں سے بہت سے لوگ گمراہ ہوئے، وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ رسول اللہؐ کیا لائے تھے اور

یہ لوگ کیا کہتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے عالم، عابد اور صوفی اور بعض ایسے لوگ بھی گمراہ ہو گئے۔ جن کی غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ تھی بلکہ وُہ ان کے اتباع کو مطلقاً پسند کرتے تھے، اور اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ باتیں رسول اللہ کی شریعت کی مخالف ہیں تو وُہ انھیں ہرگز قبول نہ کرتے۔ لیکن چونکہ انھیں اس بات سے پوری واقفیت نہ تھی، جس بات کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی اور نہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے کیا معنی ہیں اور فلاسفہ کا مقصد کیا ہے، اسی لیے انھوں نے ان کی بات مان لی۔

اس انحراف عن الحق کے اسباب بہت ہیں۔ مثلاً بہت سے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ مؤخر الذکر معانی پیش کرنے والے اشخاص کو علم، کلام، تصوّف، زہد، فقہ اور عبادت سے بہرہ وافر حاصل ہے تو وُہ اپنی حقیقت ناشناسی کے باعث اس چکّر میں پھنس گئے کہ یہ لوگ فقہاء اور محدثین سے افضل ہیں، اس لیے کہ فقہاء محض ظواہر شرع کے عالم ہوتے ہیں اور محدثین محض الفاظ نقل کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے یہ دیکھا کہ بڑے بڑے اہل کلام یا تو فلاسفہ کے اقوال سے موافقت کا اظہار کرتے ہیں اور یا اُن سے خائف ہیں۔ فلاسفہ کے ساتھ جن متکلمین کی بحثیں انھوں نے دیکھیں، انھیں فلاسفہ کے اقوالِ فاسدہ کی کنہ تک پہنچنے کا شرف حاصل نہ ہُوا تھا، بلکہ ان میں سے بعض ایسے تھے جو بعض فاسد اصول پر فلاسفہ کے ہم آہنگ ہو گئے اور بعض ایسی باتوں میں ان کے مخالف بن گئے جن میں حق فلاسفہ کے ساتھ تھا۔

بہت سے متکلمین طبیعی اور ریاضی کے امور میں فلاسفہ کی مخالفت کرتے ہیں، اُن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وُہ شریعت کی حمایت کر رہے ہیں۔ حالانکہ شریعت دراصل اس بات کے موافق ہوتی ہے جو عقلاً صحیح ثابت ہو چکی ہو۔ مثلاً افلاک کے گول ہونے کے مسئلے میں سلف سے کوئی اختلاف مروی نہیں ہے۔ آثار بھی اُس کی تصدیق کرتے

ہیں۔ کتاب و سنت دونوں استدراہ افلاک پر دال ہیں۔ اسی طرح استحالۂ اجسام کا مسئلہ ہے۔ بعض اجسام حالت بدل کر دوسرے اجسام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس مسئلے پر تمام فقہا متفق ہیں۔ علاوہ ازیں فلاسفہ نے بعض اور باتیں بھی ایسی کہی ہیں جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں۔ لیکن اکثر متکلمین کو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ و تابعین کے متعلق مطلقًا خبر نہیں ہوتی۔ اور وُہ ایسی باتوں کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ کہیں وُہ دینِ مسلمین بلکہ اجماعِ مسلمین سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ سلف صالحین میں سے کسی نے بھی ایسی بات نہیں کہی ہوتی، بلکہ سلف سے اس کا برعکس ثابت ہوتا ہے متکلمین تحقیقِ علومِ شرعیہ میں کثرتِ جہل اور کوتاہی کا ثبوت دینے لگے۔ عقلیات میں کبھی فلاسفہ کے باطل اقوال کی حمایت اور کبھی ان کی صحیح بات کی مخالفت کرتے تھے مناظروں میں کبھی ایک طرف جیت جاتی اور کبھی دوسری طرف۔ عقلیاتِ الہیہ و کلیہ میں متکلمین زیادہ صحیح ہوتے تھے۔ اور فلاسفہ کی نسبت شریعت سے بھی قریب تر تھے۔ الہیات اور کلیاتِ عقلیہ میں فلاسفہ کا کلام بہت قاصر ہے اور اس میں خلط ملط بہت ہے۔ البتہ حسّی و طبیعی امور اور اُن کے کلیات میں وُہ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ان مسائل میں ان کا کلام اکثر عمدہ ہوتا ہے۔ ان غیبی امور کے متعلق جن کی خبر انبیاء دیتے ہیں اور ان کلیاتِ عقلیہ کے متعلق، جو ساری موجودات پر عام ہیں۔ اور موجودات کی صحیح تقسیم کرتے ہیں۔ انھوں قطعًا کوئی علم نہیں ہے، یہ باتیں اسی کو معلوم ہو سکتی ہیں جو ساری موجودات پر محیط ہو اور انہیں حساب اور اس کے بعض لوازم کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ اور یہ موجودات کے بہت کم حصّے کا علم ہے۔ کیونکہ موجودات کا وُہ حصہ جس کی شہادت آدمی نہیں دے سکتے۔ مقدار اور منفعت کے لحاظ سے اس حصّے کی نسبت بہت بڑا ہے جس کی شہادت بشر دے سکتا ہے۔ اسی لیے جن لوگوں کی ساری کائنات معصومات فلاسفہ کے اقوال کے

ہیولیٰ سے ترکیب پاتے ہوتے ہو۔ وہ نبیوں کی زبان سے ملائکہ، عرش، کرسی، جنت اور دوزخ کی خبریں سن کر محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ موجود صرف وہی چیزیں ہیں جن کا علم اُن کو اور فلاسفہ کو حاصل ہے اس لیے وہ اپنے علم کی بناء پر انبیاء کے کلام کی تاویل شروع کر دیتے ہیں اگرچہ بے دلیل ہی کیوں نہ ہو، اُن چیزوں کی نفی کسی علم کی بناء پر نہیں کرتے۔ عدمِ علم اَور چیز ہے اور علم بالعدم اور چیز ہے۔

ان کا ان چیزوں کی نفی کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی طبیب جنوں کی نفی کرتا ہے۔ فنِ طب سے نہ تو جنوں کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ اُن کی نفی معلوم ہوتی ہے یہی حالت اُس شخص کی ہے جو ایک قسم کا علم حاصل کر کے عوام پر فوقیت حاصل کرتا ہے لیکن اپنی جہالت سے جن علوم کو وہ نہیں جانتا، ان کی نفی کرتا رہتا ہے۔ بنی آدم ان چیزوں کے اثبات و تصدیق کے باعث گمراہ ہوئے ہیں، جن کی تصدیق انھیں نہیں کرنا چاہیے تھی۔

تکذیبِ حق کا باعث

لیکن اس سے بھی زیادہ گمراہی اس بات سے پھیلی ہے کہ اکثر لوگوں کو انکار کا مرض ہے اور چھوٹتے ہی اُن چیزوں کی نفی کہنے لگتے ہیں جن کی نفی کے لیے ان کے پاس کوئی علم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۔

(۱۱ : ۹)

بلکہ وہ اس چیز کی تکذیب کر دیتے ہیں، جس تک اُن کے علم کی رسائی نہیں اور اُس کی تاویل اُن تک نہیں پہنچتی۔

اور یہ اس لیے ہے کہ اکثر آدمیوں کی عقل و حس صحیح ہوتی ہے، جب وہ کسی چیز کی تصدیق یا اثبات کرتے ہیں تو وہ سچ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی آدم کی ساری جنسوں میں تواتر مقبول رہا ہے، کیونکہ وہ اس بات کی خبر دیتے ہیں، جسے

انھوں نے دیکھا یا سنا ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی جماعت غلطی میں باہم شریک نہیں ہو سکتی اور نہ اس قدر کثیر جماعت عمدًا جھوٹ بولتی ہے۔ جب معلوم ہو جاتے کہ فلاں بات کے متعلق لوگوں نے کوئی خاص سازش نہیں کی اور ایک دوسرے سے یہ بات اس طرح نہیں سیکھی جس طرح مذہب اور خیالات سیکھے جاتے ہیں کہ پچھلا شخص پہلے شخص سے خیال اخذ کر لیتا ہے اور جب یہ بھی معلوم ہو جاتے کہ عادۃً ایسی بات میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ تو ان کی سچائی پر یقین ہو جاتا ہے، کیونکہ خبر دینے والا یا تو عمدًا جھوٹ کہتا ہے، یا غلطی کرتا ہے اور متواترات میں ان دونوں باتوں کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف نفی یا تکذیب اکثر لوگ اس بات کی کرتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے اور اس بات کی تکذیب کرتے ہیں جس کے علم تک وہ نہیں پہنچتے۔

جن لوگوں کے نزدیک موجودات وہی کچھ ہے جو ان متفلسفین کو معلوم ہوئی ہے، وہ جب نبیوں کی زبان سے عرش و کرسی کا ذکر سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ عرش نویں آسمان کو اور کرسی آٹھویں آسمان کو کہتے ہیں۔ ہم مسئلۂ احاطہ کے ذکر میں اس امر پر بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں، کہ یہ خیال عقلاً و شرعًا لغو ہے۔ اور جب ان لوگوں نے انبیاء سے ملائکہ کا نام سنا تو ان کو خیال ہوا کہ عقول و نفوس ہیں، جنھیں متفلسفین ثابت کرتے ہیں۔ نیز یہ قویٰ ہیں جو اجسام میں ہوتے ہیں۔ جن و شیاطین کو انھوں نے اعراض خیال کیا جو نفوس کے ساتھ قائم ہیں، کیونکہ ان کا مبلغ علم یہی تھا، نیز ان لوگوں نے ابن سینا وغیرہ کے نقشِ قدم پر چل کر یہ خیال دلنشین کر لیا کہ اس جہان میں جو عجیب باتیں رونما ہوتی ہیں، ان کا سبب فلکی طبیعی یا نفسانی قوت ہے اور معجزاتِ انبیاء، نفسانی قوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، ان کی اور سحر کی جنس ایک ہے۔ البتہ ساحر کا ارادہ برا اور پیغمبر کا ارادہ اچھا ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں ان امورِ کلیہ سے بے خبر ہونے کا نتیجہ ہیں جو موجودات اور ان کی انواع کو محیط ہیں۔ نیز ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کیا ہے، اس لیے علومِ کلیہ و علومِ الٰہیہ میں سے انھیں صرف اسی قدر بہرہ حاصل ہوتا ہے، جس تک فلاسفہ متقدمین کی رسائی تھی یا اس کے علاوہ اہلِ کلام و اہلِ مذہب متفرق طور پر چند باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الٰہیات و کلیات میں ابنِ سینا اور اس کی طرح کے متاخرین فلاسفہ کا کلام ان کے اسلاف کے کلام سے بہتر ہے اور اسی لیے فلاسفۂ یونان ملاحدہ و مبتدعہ اہلِ مذاہب کے قریب پائے جاتے ہیں۔

بنو عبید کی طرح کے ملاحدہ نے یونان کے بے دین اور مشرک فلاسفہ سے عقل و نفس کا اور مجوس سے نور و ظلمت کا خیال اخذ کیا ہے اور ان کا نام "سابق و تالی" رکھا۔ یہی حال ان ملاحدہ کا ہے جو تصرف و تالہ کی طرف منسوب ہیں۔ ابن سبعین وغیرہ متصوفین نے اپنے زعم میں شرع و فلسفہ کا تطابق کیا ہے۔ یہ ملحد ہیں اور بہتّر فرقوں میں سے ہیں۔ کسی اور موقعہ پر ان تمام معاملات کے متعلق تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔

جاہل متکلمین اور فتنۂ تفلسف

مبتدعین اہلِ کلام سلف صالحین، ائمہ کتاب و سنت اور صحابہ کے اقوال سے بے خبر ہونے کے باعث کلامیاتِ باطلہ میں پڑ گئے جن کے سبب سے فلاسفہ نے اسلام میں بہت سے باطل امور داخل کر دیے، اور غی و ضلال کا وہ طوفان برپا ہوا کہ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

جب فتنہ جہمیہ پیدا ہوا اور ۲۲۰ھ میں امام احمد بن حنبلؒ نے اس فتنے کا سرفروشانہ مقابلہ کیا تو یہ قرامطہ ملاحدہ باطنیہ کے دور کا آغاز تھا۔ بدعتیوں

نے الحاد کا دروازہ کھول دیا۔ اور وفورِ معاصی نے یورشِ کفر کا پیغام سنایا اور اس کی تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔ یہاں تحیز اور جہت پر بحث مقصود ہے، فلاسفہ متکلمین کا اس بات پر نزاع ہوا کہ آیا ملائکہ متحیز ہیں یا نہیں۔ جو لوگ فلاسفہ کی طرف مائل ہیں اور ملائکہ کو عقول ونفوس سمجھتے ہیں، وُہ انہیں غیر متحیز قرار دیتے ہیں۔ بلکہ فلاسفہ کی ایک جماعت تو ملائکہ کی تعداد کو دس عقول اور نو نفوس تک محدود نہیں کرتی۔ جیسا مشائین سے مشہور ہے۔

انبیاءؑ نے خبر دی، کہ ملائکہ کثیر التعداد ہیں، سو ان لوگوں نے چاہا کہ کثرتِ ملائکہ کو فلسفی طریق پر ثابت کریں، چنانچہ ابوالبرکات صاحب "المعتبر" اور رازی نے "مطالب عالیہ" اور دیگر تحریرات میں ایسا ہی کیا ہے۔

متکلمین کہتے ہیں کہ ہر ممکن یا محدث یا مخلوق یا تو متحیز ہوتی ہے یا قائم بالمتحیز، اور ان میں سے بہت کہتے ہیں کہ ہر موجود یا متحیز ہے، یا قائم بالمتحیز، وُہ کہتے ہیں کہ کوئی موجود چیز صرف اسی صورت میں سمجھی جا سکتی ہے۔ متکلمین و مناظرین کی ایک جماعت بھی یہی کہتی ہے۔ ابن سینا اور اس کے ہمخیال فلاسفہ اور شہرستانی رازی وغیرہ جب کسی موجود کا اثبات کرتے ہیں، تو ان کا اوّلین مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانیت مشترکہ اور حیوانیت مشترکہ اور اسی طرح کے دیگر کلیات ثابت کریں اور جب ایسا ہو تو کلیات صرف ذہن میں ہو سکتے ہیں۔ سو لوگوں نے اس بات میں ان سے نزاع نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ان سے موجود خارج از ذہن اور قائم بنفسہ کے اثبات میں جھگڑا کیا ہے۔ جس کا احساس کسی حال میں نہیں ہو سکتا، بلکہ وُہ معقول ہی نہیں، اور وُہ ان سے کہتے ہیں کہ معقول وُہ ہے جو عقل میں ہو اور جو چیز موجود در خود بخود قائم ہو ... ممکن الاحساس ہونا لابدی ہے۔ ... ہم اُس کا احساس نہ کر سکیں، جس طرح ہم جنّ و ملائکہ وغیرہ کا احساس نہیں

کر سکتے تو لابدی ہے کہ جن و ملائکہ ان کا احساس کریں اور موت کے بعد یا قیامت میں اُن کا احساس کیا جاتے یا دنیا ہی میں بعض انسان انھیں محسوس کر سکیں اور بعض نہ کر سکیں مثلاً انبیاءؑ فرشتوں کو دیکھتے اور اُن کی باتیں سنتے ہیں۔

ائمہ اہلِ نظر ابنِ کلاب اور ابن الزاغونی وغیرہ کا یہی طریقہ ہے کہ جو چیز خود بخود قائم ہے وُہ دیکھی جا سکتی ہے، اشعری، ابو یعلیٰ اور ابو المعالی وغیرہ کہتے ہیں، کہ ہر موجود چیز دیکھی جا سکتی ہے، یا سارے حواس خمسہ سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ خیال جمہور عقلاء کے نزدیک مردود ہے، بلکہ وُہ کہتے ہیں کہ تصورِ تام کے بعد اس خیال کا فساد و بطلان بالکل صریح ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر بالتفصیل بیان کیا جا چکا ہے

حقیقتِ روح کے متعلق اختلافات

اسی طرح رُوح کی بحث ہے۔ جمہور کا عقیدہ ہے کہ رُوح ایک وجود ہے، جو خود بخود قائم ہے۔ حیات کی طرح بدن کے اعراض میں سے نہیں ہے۔ اور نہ اُس ہوا کی طرح، جو بدن سے خارج ہوتی ہے، جزوِ بدن ہے۔ بہت سے متکلمین کا دعوٰے ہے کہ وُہ ایک عرض ہے جو بدن کے ساتھ قائم ہے یا اجزائے بدن میں سے ایک جزو ہے، لیکن یہ کتاب و سنت، اجماعِ سلف و خلف اور ساری اُمتوں کے جمہور عقلاء کے فیصلے کے خلاف ہے۔ اس کے خلاف دلائل صریحہ موجود ہیں۔ یہ وُہ قول ہے جس سے کہ فلاسفہ نے بہت سے متکلمین پر فوقیت کا دعوٰے کیا ہے۔ قاضی ابو بکر نے کہا ہے "اکثر متکلمین کے نزدیک رُوح اعراض میں سے ایک عرض ہے اور اگر روح سے مراد نفس نہ ہو، تو ہم بھی یہی کہتے ہیں، کیونکہ اُس نے کہا ہے کہ رُوح جسم میں دو قسم کی ہوتی ہے، ان میں سے ایک حیات ہے جو اُس کے ساتھ قائم ہے اور دوسری نفس ہے اور نفس ایک ہوا ہے جو اُس کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اور نفس سے مراد اُس ہوا کے اجزاء ہیں تو [illegible]

والے کے سانس کے ساتھ متحلل ہو کر مسام سے نکلتی ہے۔ یہ اسفرائینی وغیرہ کا قول ہے۔ ابن فورک کا قول ہے کہ رُوح وُہ چیز ہے جو اعضاء کے سوراخوں میں ہوتی ہے ابوالمعالی نے ان لوگوں کی مخالفت کی اور بجا مخالفت کی ہے، اس نے کہا کہ روحیں اجسامِ لطیفہ ہوتی ہیں جو اجسامِ محسوسہ کے ساتھ چمٹی رہتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہ ایک عادتِ جاریہ بنادی ہے کہ جب تک یہ اجسامِ لطیفہ، اجسامِ محسوسہ کے ساتھ چمٹے رہیں، اس وقت تک اجسامِ محسوسہ زندہ رہتے ہیں۔ اور جب علیحدہ ہو جاتے ہیں تو زندگی کے بعد موت آجاتی ہے۔

صحابہ وتابعین، امت کے تمام سلف صالحین اور ائمہ سنت کا قول یہ ہے کہ رُوح، ایک قائم بنفسہٖ وجود ہے جو بدن سے علیحدہ ہوتا ہے، اور اسے انعام یا عذاب دیا جاتا ہے، یہ بدن نہیں ہے اور نہ نفس مذکور کی طرح اجزائے بدن میں سے ایک جزو ہے۔ امام احمدؒ اور دیگر ائمہ نے صاف صاف یہی عقیدہ پیش کیا ہے اور ان کے دوستوں نے اس بات میں اختلاف نہیں کیا، لیکن ایک جماعت کا جن میں قاضی ابویعلےٰ شامل ہے، یہ دعوےٰ ہے کہ رُوح جسم ہے اور وُہ ہوا ہے جو مخارقِ بدن میں آتی جاتی ہے۔ باقلانی نے دو معنے پیش کیے ہیں جن میں سے ایک اس کے موافق ہے۔ گو یہ اقوال ضعیف ترین اقوال میں سے ہیں، لیکن ان پر بہت سے لوگ جمے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ رُوح کو قائم بنفسہٖ وجود مانتے ہیں جو بدن اور اس کے اجزاء واعراض کے بغیر ہے، ان کا اس بات پر نزاع ہے کہ آیا روح ایک جسم متحیز ہے، جس طرح فرشتوں کے متعلق ان کے دو قول ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی دو قول ہیں، ان میں سے جو متکلمین ہیں وُہ جسم مانتے ہیں اور متفلسفین جوہرِ عقلی مانتے ہیں جو کہ جسم نہیں ہے۔

اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس چیز کو فلاسفہ جواہرِ عقلیہ سے موسوم کرتے

ہیں۔ ان کا وجود صرف ذہن میں ہے اور ان کے تسمیہ کی اصل مجردات و مفارقات ہیں جو نفس انسان سے ماخوذ ہے۔ جب رُوح انسان کے بدن سے موت کے وقت علیحدہ ہوتی ہے اور تنہا ہو جاتی ہے تو اسے "مفارقہ مجردہ" کہتے ہیں۔ پھر وُہ عقول و نفوس ثابت کرتے ہیں جنھیں وُہ مفارقات و مجردات سے موسوم کرتے ہیں، اس لیے وُہ اس مادے سے علیحدہ ہوتی ہیں جو اُن کے نزدیک جسم ہے۔ یہ مفارقات ان کے نزدیک نہ تو جسم ہیں اور نہ قائم بالجسم۔ لیکن رُوح جسم سے اسی طرح متعلق ہوتی ہے جس طرح عقل و تدبیر اجسام کے ساتھ اس کا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تمام عقلاء، بدن اور رُوح مفارقہ کے درمیان فرق ثابت کرتے ہیں، لیکن متکلمین کی اصطلاح میں جس چیز پر لفظِ جسم کا اطلاق ہوتا ہے وُہ لغت میں جسم نہیں کہلاتی۔ بلکہ جسم "جسد" کو کہتے ہیں، اور اُس کے معنی موٹا (غلیظ) جسم یا اس کی فربہی کے ہیں۔ رُوح فربہی اور کثافت میں بدن کی طرح نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس کا نام جسم نہیں۔ سو جو لوگ لغوی معنی کے مطابق ملائکہ اور ارواح وغیرہ کو جسم قرار دیتے ہیں، وُہ درستی پر ہیں اور رب العالمین کا جسم نہ ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے کیونکہ لغت میں ارواح و اجسام کے درمیان فرق مشہور ہے۔ اہلِ اصطلاح یعنی متکلمین و فلاسفہ، جسم کا مسمّٰی اس سے عام تر بتاتے ہیں۔ وُہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف اشارہ حسّی ممکن ہو اور جس کے متعلق کہا جا سکے کہ "وُہ وہاں ہے" اور جو ابعاد ثلاثہ (لمبائی، چوڑائی اور موٹائی) وغیرہ کو قبول کرے وُہ جسم ہے۔ ان لوگوں کی اصطلاح میں متحیز بھی جسم ہے اور جو لوگ جوہر فرد کے قائل ہیں اُن کے نزدیک یہ بھی اسی تعریف میں داخل ہے جسم کے لغوی معنی تو بیان ہو چکے اور متحیز کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ	اور جو شخص اس دن ان کے سامنے پیٹھ پھیرے گا، وُہ خُدا کے غضب کا مستوجب

مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ ۹ : ۱۶

ہوگا، البتہ جو لوگ جنگ کی خاطر ایک کنارے پر ہو جائیں یا محض دکھانے کے لیے کسی جماعت سے جا ملیں وہ اس غضب سے مستثنیٰ ہیں۔

تحیّز کی لغوی تحقیق

جوہری کا قول ہے کہ "حوز" کے معنی جمع کرنے کے ہیں، جو شخص اپنے ساتھ کسی چیز کو ملا لے، اُس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حَازَہٗ حَوْزًا وَحِیَازَۃً اور "اِحْتَازَہٗ" بھی کہا جاتا ہے۔ "اَلْحَوْزُ وَالْحَیْزُ" کے معنی نرم ہانکنا بھی ہیں، قَدْ حَازَ الْاِبِلَ یَحُوْزُھَا وَیَحِیْزُھَا۔ (اونٹ کو آہستہ ہانکا) "وَحَوَّزَ الْاِبِلَ اِلَی الْمَآءِ" (اونٹ کو پانی کی طرف آہستہ ہانکا)

اصمعی کا قول ہے کہ "جب اُونٹ پانی سے دُور ہو تو جس پہلی رات کو وہ پانی کی طرف روانہ کیا جاتا ہے لَیْلَۃُ الْحَوْزِ کہلاتی ہے۔" تَحَوَّزَتِ الْحَیَّۃُ" (سانپ آہستہ چلا) تَحَیَّزْتُ" (میں آہستہ چلا) کہا جاتا ہے۔ مَا لَکَ تَتَحَوَّزُ تَحَوُّزَ الْحَیَّۃِ، اور تَتَحَیَّزُ تَحَیُّزَ الْحَیَّۃِ (تجھے کیا ہوگیا؟ تو اس طرح آہستہ چلتا ہے جس طرح سانپ) سیبویہ کا قول ہے یہ "حُزْتُ الشَّیْئَ"، (میں نے اس چیز کو جمع کیا) کے باب تَفَعُّلْ سے ہے۔ قطامی کا قول ہے ؎

تَحَیَّزُ مِنِّیْ خَشْیَۃً اَنْ اُضِیْفَھَا
کَمَا انْحَازَتِ الْاَفْعٰی مَخَافَۃَ ضَارِبٖ

(اس ڈر سے کہ میں اس کے ہاں مہمان رہوں گا، وہ مجھ سے اس طرح کھسک جاتی ہے جس طرح سانپ مارنے والے کے ڈر سے کھسک جاتا ہے۔

"حیّز" گھر کے ہر خانے کو کہتے ہیں جو اس کے ساتھ منضم ہوتا ہے۔ گھر کا

ہر ایک کو "حیز" کہلاتا ہے۔ حیز حیّز کی تخفیف ہے جس طرح "ھیّن" کی "ھین" اور "لیّن" کی "لین" ہے۔ جمع "احیاز" ہے۔ "حوزہ" طرف کو کہتے ہیں، "انحاز عنہ" کے معنی ہیں۔ "وہ اس سے کترا گیا" "انحاز القوم" (قوم ایک مرکز سے دوسرے مرکز کی طرف چلی گئی) دوست جنگ سے بھاگ آئیں تو لوگ کہا کرتے ہیں "انحازوا عن العدو وحاصوا" (دشمن سے کنی کاٹ کر آگئے اور بچ نکلے) اور اگر دشمن بھاگ جائیں تو کہتے ہیں۔ "انھزموا وولوا مدبرین" (شکست کھا گئے، اور پیٹھ دکھا کر بھاگے) "تحاوز الفریقان فی الحرب" کے معنی ہیں، انحاز کل فریق عن الآخر۔ (ہر ایک فریق دوسرے سے بھاگ گیا۔)

اہلِ لغت نے اس لفظ کے متعلق یہی کچھ بتایا ہے۔ اس لفظ کا مادہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحیّز، انحیاز، تحوّز وغیرہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جانے کے معنی کو متضمن ہیں، اور یہ معنی اس معنی کی نسبت زیادہ خاص ہے کہ متحیّز وہ ہے جسے کوئی امر موجود چلائے۔ اہلِ لغت "حوز" کے معنی میں ایک جانب سے دوسری جانب جانے کا معنی ملحوظ رکھتے ہیں اس لیے کہتے ہیں "حزت المال" (میں نے مال فراہم کیا) اور حزت الابل (میں نے اونٹ کو ہانکا) ظاہر ہے کہ اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کے معنی پائے جاتے ہیں، جو چیز پہاڑ، سورج اور چاند کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے، اسے متحیز سے موسوم نہیں کرتے۔ اس سے عام تر معنی یہ ہیں کہ متحیز، وہ چیز ہے جسے کوئی چیز موجود محیط ہو۔ سو جس چیز کو کوئی دوسری چیز محیط ہو، وہ متحیّز ہے۔ اس اصول کے ماتحت آسمان اور زمین کے مابین جو چیز بھی ہے، وہ متحیّز ہے، بلکہ جو کچھ سارے جہان میں ہے، وہ متحیز ہے۔ صرف سطح عالم غیر متحیز ہے، کیونکہ اسے کوئی چیز محیط نہیں۔ اسی طرح اس لحاظ سے عالم من حیث المجموع غیر متحیّز ہے کیونکہ وہ کسی دوسرے عالم میں نہیں جو اسے محیط ہو۔

متحیز سے جو مراد متکلمین لیتے ہیں وُہ اس سے عام تر ہے، اور حیز ان کے نزدیک مکان سے عام تر ہے، سو عالم سارے کا سارا ایک حیز میں ہے، لیکن وُہ مکان میں نہیں ہے۔ ان کے نزدیک متحیز میں یہ امر بھی ملحوظ نہیں ہوتا کہ اسے کوئی اور چیز چلائے اور اس کے لیے کوئی حیز وجود ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا جا سکے اور اس کے ذریعے سے ایک چیز دُوسری چیز سے ممتاز ہو، وُہ ان کے نزدیک متحیز ہے۔ پھر متکلمین میں باہم اس بات پر اختلاف ہے کہ آیا متحیز جواہر منفردہ سے یا مادہ وصورت سے مرکب ہے یا وُہ غیر مرکب ہے، جیساکہ جسم کے متعلق ان کا جھگڑا پہلے گزر چکا ہے۔ اُن کے نزدیک جسم متحیز ہے، اور جو لوگ جوہر فرد کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس سے صرف جوہر فرد خارج ہے اور ان لوگوں میں سے اکثر کا اعتقاد ہے کہ ہر متحیز مرکب ہے۔ جزء لا یتجزا ہے تک ان کا انقسام ہو سکتا ہے، ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے اور ان میں سے اکثر کہتے ہیں کہ متحیزات، حد اور حقیقت میں متماثل ہوتے ہیں۔ جس شخص کے نزدیک متحیز کے معنی یہ ہوں، اس پر لازم ہے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کو اس اعتبار سے متحیز ہونے سے منزہ قرار دے جمہور عقلائے اسلام اور دیگر اہل فکر نے اس بات کی بھی مخالفت کی ہے کہ ملائکہ یا روح اس اعتبار سے متحیز ہیں۔

تحیزِ ملائکہ وارواح کے متعلق سلف کی رائے

یہی نہیں بلکہ سلفِ اُمت میں سے کسی سے یہ قول مروی نہیں کہ ملائکہ اس اعتبار سے متحیز ہیں اور نہ اُن سے کوئی ایسا قول منسوب ہے جس سے یہ معنی مترشح ہوں۔ نیز سلف صالحین میں سے کسی نے رُوحِ انسان کو جو بوقت موت جدا ہوتی ہے، اس اعتبار سے متحیز نہیں کہا، اور نہ ان میں سے کسی سے ایسا لفظ صادر ہوا جو اس معنی پر دلالت کرے جب ملائکہ

رُوح کے لیے تحیز ثابت کرنا شرعاً بدعت اور ایک امر باطل ہے، تو رب العالمین کی شان کی نسبت سے تو یہ بطریقِ اولیٰ بدعت و باطل ہے۔ یہاں یہ بات واضح ہو گئی، کہ اہلِ تفلسف اور یہ متکلمین، نفوسِ انسان کے متعلق جو عام اقوال پیش کرتے ہیں، وہی باطل ہیں، تو جو بات وُہ رب العالمین کی شان میں کہتے ہیں وُہ کیوں باطل نہ ہو گی، اسی لیے اہلِ تفلسف اور اہلِ کلام کی ان تصنیفات میں کوئی بات بھی عقل و شرع کے مطابق نہیں ہے۔ جن میں ربّ العالمین، ملائکہ، ارواح بنی آدم، معاد اور نبوّتوں کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ ان تحریرات سے اقوال سلف و ائمۂ اسلام سے اُن کی عدم واقفیت اور کتاب و سنّت سے ان کے جہلِ قطعی کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فضلاء و ائمہ حیرت میں پھنس کر رہ گئے، انھوں نے انتہائی غور و فکر کیا لیکن علم تک رسائی نہ ہوئی۔

ابُوعبداللہ رازی کا رجُوع

چنانچہ ابوعبداللہ رازی نے آخری عمر میں یہ کہہ دیا کہ "میں نے اہل کلام و اہلِ فلسفہ کے طرق و مناہج پر غور کیا۔ لیکن مجھے تو اس سارے دفتر میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جو مریض کے لیے شفا اور تشنۂ تحقیق کے لیے سیرابی کا موجب ہو۔ میری رائے میں سب سے زیادہ قریب کا راستہ قرآن ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق اثبات کے لیے میں یہ پڑھتا ہوں: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (۳۵:۱۰) "اچھی اچھی باتیں اسی تک پہنچتی ہیں" اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (۲۰:۵) (رحمان عرش پر مستوی ہوا) اور نفی کے بارے میں یہ پڑھتا ہوں: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲:۱۱) (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) "وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا" (۲۰:۱۱۰) (اور لوگوں کا علم اس کا احاطہ نہیں کر سکتا) جس شخص کو بھی میرے جیسا تجربہ حاصل ہو گا وُہ اسی نتیجے پر پہنچے گا، جس پر میں پہنچا ہوں"۔

جس شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ متحیز وُہ چیز ہے جو اپنے غیر سے متبائن ہو اور اُس سے ہٹ جائے اور جس کے لیے اجزائے منفردہ سے مرکب ہونا اور تفریق و تقسیم کے قابل ہونا شرط نہ ہو۔ وُہ اگر باری تعالیٰ کو اس معنی میں متحیز کہے کہ وُہ اپنی مخلوقات سے متبائن ہے تو یہ عقیدہ صحیح ہے۔ لیکن اس عبارت کا اطلاق بدعت اور تلبیس آمیز ہے، کیونکہ جو معنی اُس شخص نے مراد لیے ہیں، وُہ بلحاظ لغت لفظ "متحیز" کے معنی نہیں ہیں، بلکہ یہ اس شخص کی اور اُس کی جماعت کی اپنی اصطلاح ہے اور اصطلاحی معنی میں عقلاء کے مابین اختلاف ہے۔ اس سے ایسے فاسد معنی کا بھی احتمال ہے جس سے ذاتِ باری تعالیٰ کو منزہ قرار دینا واجب ہے۔ انسان کے لیے ایسے لفظ کا استعمال جائز نہیں ہے۔ جو دوسرے شخص کے نزدیک کسی فاسد معنی پر دلالت کرے اور وُہ اس شخص کی مراد واضح نہ ہونے کے باعث یہی فاسد مفہوم ذہن نشین کرے۔

جن متکلمین کے نزدیک متحیز، اُن اجزاء سے مرکب ہے جو قابلِ انقسام نہ ہوں، اور وُہ خود قابلِ انقسام ہو۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ہر ممکن یا ہر حادث، یا ہر مخلوق، یا تو متحیز ہے یا متحیز کے ساتھ قائم ہے تو جمہور عقلاء نے اس تقسیم میں ان کی مخالفت کی اور ائمۂ اسلام، صحابہ کرام یا تابعین میں سے کسی نے اُن کی تائید نہیں کی۔ جب یہ صورت ہو تو بعض متکلمین کا یہ قول تو بدرجہ اولیٰ مردُود ہو گا، کہ ہر موجود یا تو متحیز ہے یا متحیز کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ ان کے نزدیک بھی متحیز کے معنی وہی ہیں جو اول الذکر طائفہ متکلمین کے نزدیک ہیں اور اس صورت میں موخر الذکر جماعت کا قول اوّل الذکر کی نسبت عقل و شرع سے زیادہ بعید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متاخرین اہلِ کلام نے ان سے دلیل طلب کی ہے۔ حالانکہ متفلسفین کے اثبات جواہر عقلیہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ لوگ اپنے عقیدے میں خاطی نہیں ہیں، کیونکہ یہ بھی عقلِ صریح کے لحاظ سے باطل ثابت ہو چکا ہے۔

اہلِ فلسفہ نے نفس ناطقہ کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ اس کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا۔ حرکت و سکون اور صعود و نزول سے مبرّا ہے، نہ وُہ عالم کے اندر ہے اور نہ اُس کے باہر تو یہ عقیدہ بھی جمہور عقلاء کے نزدیک ان متکلمین کی نسبت زیادہ باطل ہے۔ علی الخصوص ابنِ سینا وامثالہ کا یہ کہنا تو بدرجۂ غایت لغو ہے، کہ امورِ جزئیہ نہیں پہچانے جا سکتے اور امورِ کلیہ کی پہچان ہو سکتی ہے۔" یہ تو صاف صاف ہٹ دھرمی ہے، کیونکہ پہچان بدن ہی کی ہو سکتی ہے، اور وہی چیز پہچانی جا سکتی ہے جس کا بدن دیکھا جا سکے، اس کی آواز سنی جا سکے، اُس کی بُو آ سکے، اس کا ذائقہ ہو، اس کی طرف کوئی قصد کر سکے، اسے حکم کر سکے، اس سے محبت کر سکے یا اُسے ناپسند کر سکے۔ وقس علیٰ ہذا۔ تو یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ امورِ معیّنہ کی پہچان نہیں ہو سکتی اور امورِ کلیہ کی ہو سکتی ہے۔

بدن کے ساتھ نفسِ ناطقہ کا تعلق

ان کا یہ قول بھی نہایت لغو ہے کہ نفسِ ناطقہ کا بدن کے ساتھ تعلق ایسا ہی ہے، جیسا تدبیر و تصریف کا تعلق ہے اور ایسا ہی ہے، جیسا کوئی بادشاہ اپنی مملکت کے لیے تدبیر کرتا ہے، کیونکہ بادشاہ اپنی مملکت کی تدبیر کرتا ہے لیکن اپنی مشیئت و قدرت سے وُہ لوگوں پر تصرف نہیں کر سکتا جب تک وُہ اپنے ارادہ و قدرت سے حرکت نہ کریں۔ بادشاہ اپنی مملکت کے کسی متنفس کی لذت سے لذت گیر اور اُس کے درد سے متالم نہیں ہو سکتا۔[1] رُوح و بدن کا تعلق ایسا نہیں ہے

[1] یہاں لذت اور درد سے قلبی درد اور قلبی راحت مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں یہ الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، نیک بادشاہ کو اپنی رعایا کی ہر فرد کی خوشی سے خوشی اور غم سے غم محسوس ہوتا ہے لیکن ان دونوں کی کیفیاتِ مسرت و اندوہ مختلف ہوتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں سپاہی کی ٹانگ مجروح ہو جاتی ہے تو اسے ٹانگ میں ہی درد ہوتا ہے لیکن بادشاہ کی ٹانگ میں نہیں بلکہ دل میں درد کی ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں مصنف کی مراد یہ ہے کہ یہ نہیں ہوتا کہ سپاہی کی ٹانگ مجروح ہونے پر بادشاہ کی بھی ٹانگ میں درد ہونے لگے۔ واللہ اعلم! (مترجم)

بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان ایسا اتحاد و ربط قائم کر رکھا ہے کہ اُس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ جس پر اُسے قیاس کیا جا سکے۔ بدن میں رُوح کا دخول ان اجسام میں سے کسی دخول سے متماثل نہیں ہے جو دیکھے جاتے ہیں۔ اس کا بدن میں دخول ایسا نہیں ہے جیسا پانی اور دیگر مائعات کا برتنوں میں داخل ہونا ہے، کیونکہ موخرالذکر برتنوں کی اندرونی سطح سے ملاقی ہوتا ہے۔ اُن کے پیٹ اور پُشت تک نہیں پہنچتا۔ نیز وُہ برتنوں کے اطراف سے ملاقی ہوتا ہے۔ نہ کہ اوساط کو، لیکن رُوح بدن کے سارے ظاہری و باطنی اجزاء سے متعلق ہے۔ اسی طرح رُوح کا بدن میں داخل ہونا، کھانے اور پینے کے دخول کی مانند نہیں ہے، کیونکہ اول الذکر بدن کا مشہور پڑوسی ہے اور آخرالذکر اس کی دیگر صفات میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ رُوح کا بدن میں جاری ہونا خون کے جاری ہونے کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ خون بدن کے کسی حصّے میں ہوتا ہے اور کسی حصّے میں نہیں ہوتا۔

الغرض جس قدر نظیریں ذکر کی جائیں ان میں یہ ہوگا کہ ایک چیز کلیتہً دوسری چیز سے متعلق ہو۔ اس کے برخلاف رُوح و بدن کی یہ حالت ہے کہ وُہ بدن میں داخل ہوتی ہے۔ موت کے وقت اس سے نکل جاتی ہے اور تھوڑی تھوڑی بھی نکلتی رہتی ہے، لیکن وُہ بدن سے اس طرح علیحدہ نہیں ہوتی جس طرح بادشاہ اُس شہر سے علیحدہ ہوتا ہے جس کا وُہ انتظام و تدبیر کرتا ہے۔

چونکہ لوگوں کو تعلقِ رُوح و بدن کی نظیر نہیں ملی، اس لیے اُن پر اس کی حقیقت کی تعبیر دشوار ہوگئی۔ اس سے ان لوگوں کو رب العالمین کے متعلق تنبیہ ہوتی ہے کہ اس میں اس کی حقیقت معلوم نہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کیفیّت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ اور جو صفات اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں وُہ اللہ جل جلالہ کے لائق ہیں، کیونکہ رُوح جو خدا کے بعض بندوں میں سے ہے۔ اس کی یہ صفات

ہیں کہ جب انسان سو جاتا ہے تو وُہ اُوپر چڑھ جاتی ہے اور عرش کے نیچے سجدہ کرتی ہے حالانکہ وُہ اس کے باوجود سونے والے کے بدن میں ہوتی ہے، اور کلیتہً اس سے علیحدہ نہیں ہوتی۔ انسان نیند میں اپنی رُوح کے تصرفات محسوس کرتا ہے جو بدن پر ہوتے ہیں یہ صعود جو رُوح کی وصف ہے، ان چیزوں کے صعود کا مماثل نہیں ہے جو دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ جب یہ چیزیں صعود کرتی ہیں تو ایک جگہ کو کلیتہً چھوڑ کر دوسری جگہ میں داخل ہوتی ہیں۔ رُوح کی حرکت عروجی و سجودی ایسی نہیں ہوتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سبحانہ کے اوصاف یہ بیان فرمائے ہیں کہ وُہ ہر رات کو پہلے آسمان تک اتر آتا ہے، وُہ عرفہ کی عشاء کو حجاج کے قریب آتا ہے۔ اُس نے وادی ایمن میں ایک درخت والی مبارک جگہ میں موسٰے علیہ السلام کے ساتھ کلام فرمایا، وُہ آسمان کی طرف گیا، (مستوی ہوا) اور وُہ آسمان دھواں تھا۔ سو اُس نے آسمان اور زمین دونوں سے کہا کہ "تم دونوں طوعًا و کرہًا آؤ"۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ یہ اقوال اُس جنس سے ہوں جسے ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ اجسام مشہودہ کے نزول کی طرح نہیں ہیں، کہ اُن سے ایک مکان کا فارغ ہونا اور دوسرے کا مشغول ہونا لازم آئے۔ رُوح کا نزول و صعود بھی اس کو مستلزم نہیں تو رب العالمین کا نزول و صعود تو بطریقِ اولیٰ اس التزام سے منزہ ہے۔ ملائکہ کا صعود و نزول بھی اسی جنس سے ہے۔

سو جس بات کا اثبات اللہ اور رسول ؐ کرے، اُس کی نفی جائز نہیں۔ اگر اللہ اور رسول صفات و اسماء باری تعالٰی کا اثبات فرمائیں تو صفاتِ مخلوقات سے ان کی تمثیل نہیں کریں گے، چاہیے، خصوصًا جس مخلوقات کا ہم مشاہدہ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ مخلوقاتِ غیر مشہودہ کے اسماء و صفات جب مخلوقاتِ مشہودہ کے اسماء و صفات سے متماثل نہیں تو وُہ رب العالمین کے اسماء و صفات سے کس طرح مماثل ہوسکتے ہیں

ایک مخلوق اور دوسری مخلوق میں جو بُعد مماثلت ہو سکتا ہے۔ اس کی نسبت کسی مخلوق سے اللہ تعالیٰ کی مماثلت زیادہ بعید ہے۔ ہر مخلوق کا کسی دوسری غیر متماثل مخلوق سے مشابہت کا امکان اس کی نسبت زیادہ ہے کہ خالق کو مخلوق سے مشابہت ہو۔ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا۔

اس سے معلوم ہوا کہ صاحبِ "محصل" اور اُن کی طرح کے دیگر اشخاص نے اہلِ تفلسف و کلام کی رائے پر تقسیم موجودات کا جو ذکر کیا ہے، وُہ سب ناقص تقسیم ہے ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک نے اپنے سلف سے انحراف کیا ہے متکلمین نے اس تقسیم میں کتاب و سنت اور سلفِ امت کا مسلک ملحوظ نہیں رکھا۔

تبعین ارسطو اور "حدوثِ عالم" ارسطو کے تبعین نے قدیم فلاسفہ کا مسلک بھی چھوڑ دیا جو "حدوثِ عالم" کے قائل تھے اور اس عالم کے اُوپر ایک اور عالم مانتے تھے جس کے حالات و اوصاف وُہ جنت کے بعض اُن اوصاف سے موافق بتاتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔

فلاسفہِ قدیم معادِ ابدان کا بھی اثبات کرتے تھے، جیسا کہ سقراط اور تالیس وغیرہ اساطینِ فلاسفہ کے کلام میں موجود ہے۔ ان کا بیان ہے کہ "قدمِ عالم" کا قول سب سے پہلے، ہم نے پیش کیا ہے۔ یہ نئے مجمل اور نافی الفاظ مثلاً مرکب، مولف، منقسم وغیرہ ان غرض مند لوگوں کے لیے مابہ التعبیر بن گئے جو خدا کے ان اسماء و صفات کی نفی کرنے کے متمنی تھے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے اثبات فرمایا ہے جو لوگ ان فلاسفہ کی مراد نہ سمجھتے تھے وُہ ان کے اقوال کو تنزیہ باری تعالیٰ پر محمول کرتے تھے۔ وُہ سمجھتے تھے کہ فلاسفہ ان الفاظ کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کے اوصافِ احدیت و صمدیت کا اثبات کر رہے ہیں، جو قرآنِ کریم میں وارد ہوئے

ہیں۔جس بات کی وُہ ذات باری سے اپنی رائے کے مطابق نفی کرنا چاہتے تھے۔ وُہ بات انھوں نے ان الفاظ کے معانی میں داخل کر دی اور اپنی اور اپنے موافقین کی وضع و اصطلاح کے مطابق اس عبارت سے ذاتِ باری کی تعبیر کرنے لگے۔ حالانکہ لغتِ عرب جس میں قرآن نازل ہوا، اُن الفاظ کو یہ معانی نہیں دیتی اور نہ کسی اور قوم کی زبان اور معانی کی تائید کرتی ہے۔

توحید کے پردے میں الحاد کی اشاعت

بایں ہمہ انھوں نے احد، صمد، واحد اور اس طرح کے دیگر اسماء کے جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں، یہی معنی بیان کیے اور جن باتوں کو اللہ اور رسولؐ ثابت کرتے ہیں وہ اُن کی نفی کرنا جزوِ توحید سمجھتے ہیں۔ توحید کا نام بڑا ہے، اُس کی دعوت پیغمبرؑ لے کر آتے ہیں۔ آسمانی کتابوں کا نزول اسی عظیم الشان دعوت کا مرہونِ احسان ہے۔ جب فلاسفہ نے ان معانی کو خلافِ توحید بتایا تو جن لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان لوگوں کی مراد اور ہے اور رسولؐ کی دعوت اور ہے تو وُہ یہ سمجھنے لگے، کہ یہ لوگ وہی توحید بیان کر رہے ہیں جو پیغمبرؑ لے کر آئے تھے۔ اور ان لوگوں کو موحدین کہنے لگے۔ جیسا کہ جہمیّہ و معتزلہ اور اُن کے وُہ موافقین کرتے ہیں جو کسی نہ کسی صفتِ باری کے منکر ہیں۔ اس انکار کو وُہ توحید سے موسوم کرتے اور فلاسفہ کے علم کو علمِ توحید کہتے ہیں۔ چنانچہ معتزلہ اور دیگر فرقے جو نفی تقدیر میں اُن سے موافق ہیں وہ عدل سے موسوم ہیں اور اپنے آپ کو "عدلیہ" اور "اہلِ عدل" کہتے ہیں۔ اور اس طرح کی بدعات بہت زیادہ ہیں۔ کتاب وسنت کے الفاظ کے ذریعہ سے وُہ معنی بیان کیے جاتے ہیں جو خدا اور رسول کی مراد کے مخالف ہوں۔ ان لوگوں نے ابتداءً یہ اقوال اللہ عزّ وجل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھے بلکہ ان اقوال کی بناء، وُہ شبہات ہیں جو ان لوگوں اور ان کے اماموں کے دلوں میں

پیدا ہوتے اور انھوں نے بطورِ حجت انھیں کتاب وسنّت کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ اس سے وُہ ظاہر یہ کرنا چاہتے تھے کہ وُہ رسول کے تابع ہیں، مخالف نہیں ہیں۔

ان میں سے بہت لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے وُہ رسول کے مخالف ہے، بلکہ ان کو یہی خیال ہوتا ہے کہ جو معنی وُہ سمجھتے ہیں، وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ کتاب وسنت کے الفاظ سے اللہ و رسول کی مراد کیا ہے؟ اس لیے کہ قرآن کی زبان (عربی) اور ان الفاظ کے معانی کے متعلق صحابہ، تابعین اور تمام علمائے مسلمین کے اقوال سے آگاہی حاصل کرنا لابدی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کتاب وسنت کے متعلق ان صحابہ رض سے گفتگو فرمایا کرتے تھے تو اُن کو بتا دیا کرتے تھے کہ ان الفاظ سے ان کی کیا مراد ہے۔

صحابہ کرام رض حفظ قرآن پر علم معانی قرآن کو ترجیح دیتے تھے!

صحابہ بہ حفظ حروفِ قرآن کی نسبت معانیِ قرآن سے زیادہ کامل واقفیت رکھتے تھے۔ تابعین تک ان لوگوں نے حروف قرآن کی نسبت ان کے معانی زیادہ پہنچائے ہیں۔ عام مسلمانوں کو جن معانی کے جاننے کی ضرورت ہے۔ مثلاً توحید، واحد، احد، ایمان، اسلام وغیرہ۔ ان کے متعلق سارے صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ اللہ اور رسول ص کو ان معانی سے واقفیت حاصل کرنا کس درجہ محبوب و مرغوب ہے۔ سارے کا سارا قرآن ان سے تھوڑے لوگ حفظ کرتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے اہل تواتر قرآن کا کچھ حصہ یاد کیا کرتے تھے۔

قرآن خدا کے اس وصف سے بھرا پڑا ہے کہ وُہ احد اور واحد ہے۔ تمہارا معبود واحد ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ونحو ذالك۔ یہ ضرور ہے کہ صحابہ ان اوصاف

کو جانتے ہوں کیونکہ ان کا جاننا اصل دین ہے۔ سب سے پہلے رسولؐ نے اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے اور سب سے پہلے اسی بات پر وہ لوگوں سے جہاد کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو سب سے پہلے اسی بات کا حکم دینے کے لیے مامور فرمایا تواتر سے معلوم ہے کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہی دعوت دی ہے کہ وہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ کہیں۔ صحیحین میں ہے کہ جب حضرت معاذؓ یمن کی طرف بھیجے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا کہ آپ اہل کتاب کے پاس جاتے ہیں سو آپ کی پہلی دعوت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ کی شہادت ہونی چاہیے اگر وہ یہ مان لیں تو ان کو اطلاع دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو اُن کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور انہیں کے فقراء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اگر وہ اس بات میں بھی آپ کی اطاعت قبول کر لیں تو ان کے عمدہ اور نفیس مالوں سے بالکل تعرض نہ کرنا۔ مظلوم کی پکار سے ڈرنا کیونکہ مظلوم کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

سو حضرت معاذؓ سے یہی کہا گیا کہ سب سے پہلے دعوت توحید ہونی چاہیے۔ حالانکہ وہ لوگ اہل کتاب اور یہود تھے۔ ارض یمن میں یہود بہت تھے حضرت معاذ کو جو یہ حکم دیا گیا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے موافق ہے۔

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ

جب عزت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ وہیں اُن سے لڑو، انہیں گرفتار کرو، اُن کو محصور کرو اور ہر گھات کی جگہ میں ان کی تاک میں بیٹھو۔ سو اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دے دیں تو ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

دوسری آیت میں ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ	اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دے دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ۔	انھیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں خالص یک رنگی سے اسی کا دین اختیار رکریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی ٹھیک دین ہے۔

صحیحین میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "ایمان کی شاخیں ستّر سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے افضل لا الٰہ الا اللہ کا قول ہے: اور ان سب سے ادنے رستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا، اور حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

الغرض، جو کچھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور الفاظ قرآن و حدیث سے جو مراد انھوں نے لی ہے، وُہی علم، ایمان، سعادت اور نجات کی جڑ ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے اقوال دیکھنے چاہئیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق و مخالف معانی نظر سے گزر جائیں۔ الفاظ کی دو قسمیں ہیں، ایک وُہ جو اللہ اور رسولؐ کے کلام میں ــــــ پائی جاتی ہے۔ اور دوسری وُہ جو اللہ اور رسول کے کلام میں نہیں، پائی جاتی۔ اول الذکر کے معنی معلوم کرکے ان کو اصل قرار دینا چاہیے پھر معلوم کرنا چاہیے کہ موخر الذکر سے لوگ کیا مراد لیتے ہیں اور اسے اول الذکر کی طرف لوٹانا چاہیے۔ اہل ہدیٰ و سنت کا یہی طریقہ ہے اور اہل بدع و ضلال کی راہ اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنے گھڑے ہوئے الفاظ و معانی کو اصل قرار دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ و رسول نے بتایا ہے اسے ان کا تابع بناتے ہیں اور اسے تاویل و تحریف سے اپنے معانی کی طرف لے جاتے

ہیں، کہتے ہیں کہ ہم عقل اور لغت سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ وُہ اپنی عقل و رائے کے مطابق ایک معنی قرار دے لیتے ہیں اور پھر تمام ممکن تاویلات و تفسیرات سے قرآن کو اس کی طرف پھیر کر لے جاتے ہیں۔ اور "تَحْرِيْفُ الْكَلِمِ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ" کے مصداق بنتے ہیں۔ اس لیے امام احمد فرماتے ہیں کہ لوگوں کی اکثر غلطیوں کی وجہ تاویل و قیاس ہے۔ فقہا، ان دو اصلوں مجمل اور قیاس سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس طریق میں تمام چھوٹے بڑے اہلِ بدعت مشترک ہیں۔ جہمیہ، معتزلہ، فلاسفہ، ماولین اور ملاحدہ باطنیہ سب کا یہی طریق ہے۔ حذاق فلاسفہ کہتے ہیں کہ رسول کے مخاطب کرنے سے یہ مراد ہے کہ جمہور کے سامنے انہی امور کا تخیّل پیش کیا جائے جو اُن کے روز مرّہ کے دنیوی مصالح و مشاغل میں پیش آتے ہیں، اگرچہ وُہ حق کے مطابق نہ ہوں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ "رسول کا مقصود حق کی تبیین و تعریف نہیں ہے، بلکہ جس بات پر ان کا اعتقاد راسخ ہو، اسی کا تخیل ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوتِ تخییل نبوّت کا خاصہ ہے، وُہ کہتے ہیں کہ رسول تبیین و تفہیم نہیں کرتا اور نہ یہ بات اس کے مقاصد میں شامل ہے۔ ان فلاسفہ میں اسی عقیدے کے متعلق دو رائیں ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ رسول کو حقیقی امور کا علم ہوتا ہے لیکن اس کے لیے ان کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ لوگ رسول کو فلسفی سے افضل سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ امور کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اور ان چیزوں کی معرفت میں رسول کی کوئی دسترس نہیں ہوتی۔ اور وُہ امورِ عملیہ کا عارف ہوتا ہے یہ لوگ فلسفی کو نبی کی نسبت زیادہ کامل قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ امورِ علمیہ، عملیہ کی نسبت کامل تر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ اور رسول کی خبروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں تخییل ہے اور وُہ کہتے ہیں کہ اس سے تخییل مقصود نہیں بلکہ مقصود معنی ہوتا ہے جو تاویل سے معلوم کیا جاتا ہے۔

بہت سے متکلمین جہمیہ کا قول یہی ہے کہ توحید کے باب میں رسول، اظہارِ حق نہ فرما سکے، اور انھوں نے جمہور سے اسی طرح باتیں کیں جس طرح ان کے خیال راسخ تھے۔ انہی لوگوں کا یہ قول بھی ہے، کہ اگر رسول یہ فرماتے کہ تمہارا رب نہ عالم کے اندر ہے اور نہ باہر۔ اس کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا، وُہ عالم کے اُوپر بھی نہیں ہے، وعلیٰ ہذا القیاس تو ان لوگوں کے قلوب متنفر ہو جاتے، اور کہتے کہ وُہ پہچانا نہیں جا سکتا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اسی وجہ سے رسول نے لوگوں سے تجسیم کے رنگ میں باتیں کیں اور ان کے لیے ایک رب ثابت کیا، جس کی وُہ عبادت کریں، حالانکہ مشہور ہے کہ تجسیم باطل ہے۔ بڑے بڑے مشہور فقہائے متاخرین کی متعدد جماعتیں یہی کہتی ہیں۔ ان فقہا نے نفاۃ صفات کے مذہب کو صحیح قرار دیا اور رسول کے اثبات کے لیے انھیں اعتذار کی ضرورت پڑی۔ جیساکہ بہت سے فقہاء کے کلام سے ظاہر ہے۔ کبھی کہتے ہیں، کہ رسول نے بیانِ حق سے اس لیے پہلوتہی کی ہے کہ لوگ معرفتِ حق کے لیے جدوجہد کریں اور تعلیم و تعریف کے بغیر تاویلِ الفاظ کی کوشش کریں۔ تاکہ اُس کی وجہ سے اُن کو بڑا اجر ملے۔ یہ عقلیات و تاویلات کا اجتہاد ہے۔

وُہ یہ نہیں کہتے کہ اس سے رسولؐ کا مقصود عام لوگوں کو باطل باتیں سمجھانا تھا جیساکہ فلاسفہ کہتے ہیں اور اکثر متکلمین جہمیہ و معتزلہ صفاتِ باری کی نفی کرتے اور ان کے مسلک پر چلتے ہیں۔ ابن عقیل و امثالہ، ابو حامد، ابن رشد الحفید و امثالہا اسی عقیدے پر ہیں اور ان کے کلام میں اول معنی موجود ہیں۔

ابو حامد نے اپنی آخری عمر میں [illegible] کی مذمت کی ہے اور اسی اصول پر انھوں نے اِلْجَامُ الْعَوَامِ عَنْ عِلْمِ الْکَلَامِ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ کیونکہ [illegible] مصلحت جمہور صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ ظاہری

باتوں کو اُن کے ظاہری معنوں پر ہی چھوڑ دیا جاتے۔ اگرچہ ان کی رائے وہی ہو جو انھوں نے اپنی خاص کتابوں میں بیان کی ہے، کہ نفی فی الحقیقت ثابت ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک خطاب نبویؐ کا مقصود بیان اور ہدایت نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور اپنی کتاب کے اوصاف اس طرح بیان کیے ہیں۔

(۱) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ	اہل تقویٰ کے لیے ہدایت ہے۔
(۲) هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ	یہ لوگوں کے لیے بیان ہے۔
(۳) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔	ہم نے عربی زبان میں قرآن نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔
(۴) وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔	رسول کے ذمے صرف صاف طور پر حکم پہنچا دینا ہے۔
(۵) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔	یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اس لیے نازل کی ہے کہ تو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن بیان و ہدایت ہے نہ کہ محض تخییل۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا لَا يَزِيْغُ عَنْهَا بَعْدِيْ اِلَّا هَالِكٌ

(میں تمہیں ایسی صاف سفید فضا میں چھوڑ چلا ہوں جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح ہے۔ میرے بعد اس فضا سے وہی ہٹے گا جس کو ہلاک ہونا ہو) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا	میری یہ راہ سیدھی ہے اس کا اتباع کرو

فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ۔

پگڈنڈیوں پر نہ جاؤ، ایسا نہ ہو، کہ تمہیں اپنی راہ سے علیحدہ کر دیں۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِينٌ۔ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔

تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشنی اور روشن کتاب آئی جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سلامتی کی راہوں کی طرف ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور انہیں اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔

تجھے معلوم نہیں تھا کہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ ہم نے اس قرآن کو نور بنایا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے جن بندوں کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور تو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

جو لوگ اس رسول کے ساتھ ایمان لائے اس کو تقویت اور مدد پہنچائی اور اس نور کا اتباع کیا جو اُس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔

پھر ایک تیسری جماعت ہے جو سنت کی طرف منسوب ہے۔ متاخرین میں یہ جماعت بکثرت تھی۔ اس جماعت کا قول ہے کہ رسول ان آیاتِ قرآنی کے معانی نہیں سمجھتے تھے جو ان پر نازل ہوتی تھیں اور جن میں صفاتِ الٰہی مذکور ہیں وُہ صفاتِ الٰہی کے متعلق بات چیت کرتے تھے۔ لیکن ان کے معانی نہیں سمجھتے تھے۔

لفظِ "تاویل" کے مختلف معانی

ان بیچاروں نے جب سلف صحابہؓ، تابعین سے یہ مشہور روایت سنی کہ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ پر" وقفِ تام" ہے تو انھوں نے سلفِ صالحین کی موافقت کی اور اس موافقت میں ان کی نیت بھی نیک تھی۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ تاویل سے مراد لفظ کے معنی اور تفسیر کی تاویل ہے یا اس سے وُہ اصطلاحی تاویل مراد ہے جو بہت سے متاخرین اہل فقہ و اصول کے کلام میں جاری ہے۔ اس تاویل سے یہ مراد ہے کہ کسی لفظ کے راجح معنی کچھ اور ہوں لیکن کسی ایسی دلیل کے باعث جو اس لفظ کی مقترن ہو اس کو مرجوح معنوں کی طرف پھیر لیا جائے، ان لوگوں نے تاویل کے متذکرہ بالا معنی سنے تو سمجھنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کے قول" وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ میں بھی لفظ" تاویل" کے وہی معنی ہیں جو ان لوگوں کے کلام میں ہیں۔ ان سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی ان نصوص کے معنی نہیں جانتی نہ حضرت جبریل جانتے ہیں، نہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں اور نہ کوئی اور، بلکہ ان میں سے حضرت جبرئیل و رسول اللہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے متعلق قرآن کریم کی بہترین خبریں پڑھتے تھے اور ان کے معنی ہرگز نہیں جانتے تھے۔

پھر ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو جہمیہ، معتزلہ وغیرہ اہل بدعت کی تاویلات کی مذمت و تکذیب کرتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے، لیکن کبھی کہتے ہیں، یہ الفاظ ظاہر پر جاری کیے جائیں، اور ان کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اگر

ظاہر سے ان کی مراد ظاہر معنی ہوں تو یہ اُن کے قول کے متناقض ہوگا کہ ان کی تاویل ہو سکتی ہے جو اُن کے ظاہر معنی کے مخالف ہے اور جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اگر ظواہر سے اُن کی مراد صرف الفاظ ہوں تو اُن کے کلام کی مراد یہ ہوگی کہ وُہ ان الفاظ میں بات چیت کرتا ہے اور ان کے باطنی معنی ظاہر معنی کے خلاف ہیں یہی تاویل ہے اور اسی کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان الفاظ کو ان کے ظاہر پر جاری کرنے سے یہ معنی مراد لیتے ہیں اور انہی میں وُہ ہیں جو اس سے پہلے معنی مراد لیتے ہیں۔ عام لوگ تاویل سے تیسرے اور دوسرے معنی مراد لیتے ہیں۔

یہ لوگ نص کی تفسیر کبھی ظاہر نص کے مطابق کرتے ہیں۔ یہ تاویل ثالث سے نہیں ہے، اسے مان لیتے ہیں۔ نصوص کے تدبر اور اُن کے معانی پر غور و فکر کرنے کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان نصوص سے مراد وُہ آیات ہیں، جن کے متعلق وُہ کہتے ہیں کہ اُن کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے بعد پھر ان نصوص کے متعلق ان میں حسب عقائدِ مختلفہ اختلاف ہے۔ قدریہ کہتے ہیں کہ نصوص مثبتہ بندے کے فاعل ہونے کی حیثیت سے محکم ہیں اور اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق اور وہی ہر واقعہ کا ارادہ کرنے والا ہے۔ یہ نصوص متشابہ ہیں۔ خدا کے سوا ان کی تاویل کوئی نہیں جانتا۔ یہ ان لوگوں کا طریق ہے جو ان آیات کی تاویل نہیں کرتے۔ ان میں سے عام جماعتیں ان نصوص کی تاویل کرتی ہیں جو اُن کے قول کے خلاف ہوں اور بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو تاویل نہیں کرتے۔ صفاتیہ جو انہی صفات کو مانتے ہیں جن کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وُہ ان آیات کو عقل کے ذریعہ جانتے ہیں، صفاتِ خبریہ کو نہیں مانتے۔

متاخرین اہل کلام میں سے ابوالمعالی نے اپنی آخری عمر میں اور ابنِ عقیل نے

اپنے بہت سے کلام میں ان نصوص کے متعلق جو اُن کے نزدیک عقل کے ذریعہ ثابت نہیں ہوسکتیں، یہ کہا ہے کہ وُہ نصوص متشابہ ہیں، ان کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ان میں سے بہت سے لوگوں کا یہ حال ہے کہ کبھی تاویل کرتے ہیں، اور تاویل کو واجب یا جائز قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے حرام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ابوالمعالیٰ ابن عقیل و امثالہما میں اختلاف اقوال موجود ہے۔

ابو محمد بن کلاب اور ابوالحسن بن زاغونی اور اُن کے موافقین نے علوّ (بلندی) کو عقل سے ثابت کیا۔ اور اسے صفاتِ عقلی میں شمار کیا ہے۔ قاضی ابویعلیٰ کے دو قول میں سے آخری قول اور ابو محمد کا قول صفتِ علوّ کا مؤید ہے اور یہ دونوں استوا کو صفاتِ خبریہ میں سے قرار دیتے ہیں، جن کی تاویل اُن کے نزدیک خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور اگر وُہ ان لوگوں میں سے ہوں جو فوقیت اور علو کو بھی صفاتِ خبریہ میں سے قرار دیتے ہیں، اور جن میں قاضی ابوبکر، اکثر اشعریہ، ابوبکر بیہقی، ابوالمعالی وغیرہ شامل ہیں تو وہ ان لوگوں کے مسلک پر چلے ہیں۔ قاضی ابویعلیٰ کا پہلا قول اور ابنِ عقیل کا اکثر کلام اُس کی تائید کرتا ہے، ان امور پر اپنی جگہ مبسوط بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ہر جماعت کے خیالات و آراء، مدلولات قرآنیہ کے مناقض ہیں، وُہ ان نصوص کو متشابہات قرار دیتے ہیں، اگر یہ لوگ اس خیال کے ہوں کہ ان کے معانی خدا کے سوا کوئی نہیں سمجھتا تو وُہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ نہ محمد صلعم کو نہ جبرئیل کو اور نہ کسی اور کو ان آیات و اخبار کے معانی معلوم ہوئے ہیں، اگر وُہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی آیت شریفہ کو ملحوظ رکھیں تو وُہ یہ کہتے ہیں کہ "علماء راسخین" "تاویل" جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رسول نے اپنے خطاب میں حق اس لیے نہیں بیان کیا کہ لوگ حق بات کو معلوم کرنے میں جدوجہد کریں اور اس جدوجہد میں وُہ وساطتِ نبویؐ کے بغیر اپنی عقلوں اور ذہنوں کا استعمال کریں۔

اور یہ لوگ الفاظِ قرآن، عربی لغات سے نکالنے اور عجیب و غریب لغات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کے ذریعہ وُہ تاویل پر قدرت حاصل کرتے ہیں۔
یہ اس صورت میں ہے کہ ان کے خیال میں قرآن و حدیث کا مقصود نفس الامر میں سچے معنی بیان کرنا ہو۔ اگر وُہ فلاسفہ و باطنیہ کے قول کی تائید کریں اور تاویل کے قائل نہ ہوں تو وُہ یہ کہتے ہیں کہ ان الفاظ سے صرف وُہ معنی مراد ہیں جو جمہور عوام سمجھتے ہیں، وُہ نفس الامر میں باطل ہوتا ہے، لیکن مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے وُہ تخیلات پیش کیے جائیں جن سے وُہ متمتع ہوتے ہیں۔
رسول کے لیے ممکن نہ تھا کہ ان لوگوں کو حق پہنچواتے، کیونکہ وُہ اس سے بھاگتے تھے اور قبول نہیں کرتے تھے۔ بعض لوگ باطنیہ ملاحدہ اور ان کے فلاسفہ کی طرح تاویل کے معنی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان تمام خبروں کی تاویل کی جاتی ہے جو پیغمبر لائے ہیں اور جن میں ایمان اور یوم آخرت وغیرہ شامل ہیں، پھر وُہ عبارتوں کی تاویلیں کرتے ہیں، جیسا کہ قرامطہ باطنیہ کی تاویلات مشہور ہیں۔
ابو حامدؒ نے "احیاء" میں ان متاولین فلاسفہ کا ذکر کیا اور کہا ہے کہ انھوں نے تاویل میں حد سے تجاوز کیا ہے اور حنابلہ نے جمود میں۔ ابو حامدؒ نے احمد بن حنبل کے متعلق ایسی بات کہی جو احمد نے نہیں کہی، اُسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ اس باب میں احمدؒ نے کیا کہا؟ اور دیگر سلف صالحینؒ نے کیا کہا، قرآن و حدیث کا اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ اس نے یہ سن لیا کہ حنابلہ کی ایک جماعت اور مالکی اور شافعی وغیرہ حرف صوت اور بعض صفات کے متعلق فلاں عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے قاریوں سے جو آوازیں سنی جاتی ہیں وُہ قدیم و ازلی ہوتی ہیں اور حروف جو پے در پے آتے ہیں قدیم و ازلی ہیں۔ خدا پہلے آسمان تک اتر آتا ہے۔ عرش اُس سے خالی ہو جاتا ہے۔ کچھ مخلوقات اس سے اُوپر ہو جاتی ہے اور کچھ نیچے وغیر

ذالک من المنکرات ۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک جماعت میں کوئی نہ کوئی آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کے اقوال میں بظاہر فساد ہوتا ہے اور جو شخص اس جماعت سے نفرت کرتا ہے وُہ ان الفاظ کو یاد کر لیتا ہے اور ان کو لے کر اس جماعت کی مذمت و تشنیع کرنے لگ جاتا ہے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر ان الفاظ سے انکار کرتے ہیں۔ انہی مسائل منکرہ کو لے لیجئے۔ امام احمد، امام مالک اور امام شافعی کے بعض متبعین ان الفاظ کے قائل ہیں لیکن انہی جماعتوں کے اکثر افراد اس سے انکار کرتے ہیں اور بڑے زور سے اُن کی تردید کرتے ہیں، حنابلہ وغیرہ کی تخصیص کوئی نہیں۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ مسائل اثبات میں جتنی غلطیاں اہل حدیث (اہل السنۃ والجماعۃ) سے ہوئی ہیں، اتنی اہل کلام سے نہیں ہوئیں۔ اور مسائل نفی میں اہل کلام نے اہل حدیث کی نسبت زیادہ غلطیاں کی ہیں، کیونکہ حدیث اثبات صفات ہی کے لیے آئی ہے، اس میں نفی کے متعلق کوئی بات نہیں اور یہ اہل کلام ہی سے مخصوص ہے اور جہمیہ و معتزلہ کا کلام نفی پر مبنی ہے جو قرآن و حدیث کے صریح ارشادات بلکہ خود عقل کے بھی خلاف ہے۔ لیکن ان کا دعوٰے ہے کہ عقل نفی پر دلالت کرتی ہے۔ اہل کلام کی بعض جماعتوں نے ان کی مخالفت کی ہے۔ ہشامیہ و کرامیہ وغیرہ نے اثبات میں بڑھ کر قدم رکھا، لیکن اس مبتدعانہ کلام میں نفی بہت زیادہ ہے، جسے سلف صالحین نے بُرا سمجھا ہے۔

حنبلیوں اور دوسرے لوگوں میں سے جو لوگ سنت سے منسوب ہیں اور جو لفظ "تاویل" کو دونوں مفہوموں پر عام قرار دیتے ہیں وُہ متشابہ کلام کے متعلق ائمہ کے کلام سے تمسک کرتے ہیں، مثلاً حنبل کی روایت میں احمد کا قول ہے ۔

لا کیف ولا معنیٰ (کوئی کیفیت نہیں اور کوئی معنی نہیں) اس سے انھوں نے

یہ سمجھ لیا کہ امام احمدؒ کی مراد یہ ہے کہ ہم ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ امام احمد کا کلام اس کے صریح خلاف ہے، جیسا کہ اُن کی متعدد تحریرات سے ظاہر ہے۔

یہ بیان ہو چکا ہے کہ امام احمد جہمیہ اور اُن کی طرح کے دوسرے لوگوں کی تاویلات سے انکار کرتے ہیں جو قرآن کریم کی غلط تاویل کرتے ہیں۔ زنادقہ جہمیہ نے متشابہات قرآن سے انکار کیا اور اس کے معنی الٹ ڈالے، تو امام احمد نے اُن کے رد میں ایک کتاب لکھی جس میں انھوں نے اللہ ورسول کی مراد کے خلاف تاویل کی مذمت کی، وہ لوگ جب قرآن کی تاویل کرتے تھے تو کہتے تھے کہ اس آیت کے فلاں معنی ہیں اور کہتے تھے کہ جن صفات باری تعالیٰ کی انھیں خبر دی گئی ہے انھیں ان کی کیفیت معلوم ہے۔ امام احمد نے ان دونوں قسم کے لوگوں کے قول کی نفی کی۔ تکیفین کی نام نہاد "کیفیت" کا طلسم توڑا اور ان محرفین کو چاروں شانے چت گرایا جو کلمات کو اپنی جگہ سے تحریف کرکے کہہ دیتے تھے کہ ان کے فلاں معنی ہیں۔ میں نے امام احمدؒ کا کلام انہی کے لفظوں میں لکھ دیا ہے، جس طرح خلال نے "کتاب السنۃ" میں ذکر کیا ہے۔

تاویل سے کیا مراد ہے؟

اس باب میں امام احمد کے کلام سے نقل کرکے جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر آیا ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ آیت میں تاویل کرنے سے مراد یہ ہے کہ بلغتِ قرآن میں تاویل کی جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ فَهَل لَّنَا مِن شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا أَوْ

وعدۂ عذاب کی تعبیر ہی کا تو انتظار کر رہے ہیں، جس دن اس وعید کی تعبیر سامنے آ گئی اُس دن اُس وعید کو فراموش کرنے والے کہیں گے کہ ہمارے پروردگار کے رسول سچ بات لے کر آئے تھے، اچھا اب ہمارے لیے کوئی شفیع

نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۔	ہیں جو اس بات کی سفارش کریں کہ ہم دنیا میں واپس بھیجے جائیں تاکہ ہم وہ کام کریں جو ہمارے پہلے کاموں سے مغائر ہوں ۔

حضرت عباسؓ سے "هَلْ يَنْظُرُونَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ" کی تفسیر میں یہ قول مروی ہے کہ "تاویل" سے مراد وعدۂ قرآنی کی تصدیق ہے ۔ قتادہؒ سے مروی ہے کہ "تاویل" سے مراد "ثواب" (بدلہ) ہے ، مجاہد کا قول ہے کہ "تاویل" کے معنی جزا کے ہیں ، سدی کے نزدیک "تاویل" سے مراد "عاقبت" و انجام ہے اور ابن زید کے نزدیک حقیقت ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ تاویل سے مراد وہ چیز یعنی عذاب اور دوزخ میں داخل ہونا ہے جس کی طرف ان کا معاملہ لوٹایا جائے گا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ	بلکہ انھوں نے اس بات کو جھٹلایا جس کے علم تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اور اس کی تاویل ان کے پاس نہ آئی ۔

بعض کہتے ہیں کہ تاویل سے مراد تصدیقِ وعید ہے ۔ اور تاویل اسے بھی کہتے ہیں جس کی طرف معاملہ لوٹایا جائے

ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے مراد اس وعدے کا انجام ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے ۔ اور وہ وعید ہے ۔ تاویل وہ ہے جس کی طرف معاملہ لوٹایا جائے ، ثعلبی اس کے معنی تفسیر کے کرتے ہیں ، زجاج کا قول ہے ، ان کے پاس وعید کی تاویل کا علم نہ تھا ۔ یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں :

يٰاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ	اے میرے باپ ! میں نے ...

مِنْ قَبْلُ۔ | خواب دیکھا تھا، اس کی تفسیر یہ ہے۔

سو انھوں نے ماں اور باپ کے سجدہ کرنے ہی کو اپنے خواب کی تاویل قرار دیا۔ اس سے پہلے انھوں نے فرمایا،

لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا۔	تمہارے پاس وہ کھانا جو تمہیں خواب میں کھلایا جارہا تھا اس وقت تک آئے گا جب تک میں اس کی تاویل آنے سے پہلے بیداری میں تمہیں اس کی تاویل سے آگاہ نہ کردوں!

یہ یوسف علیہ السلام کے دو رفیق زنداں کے خوابوں کی طرف اشارہ ہے اس میں سے ایک نے یہ خواب بتایا تھا کہ؛

إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا۔	میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں

دوسرے نے کہا کہ؛

إِنِّي أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا۔	میں دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں۔

یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور یہی درست ہے۔ بعض کا قول ہے کہ تمہارے پاس جو کھانا بھی پہنچے گا، میں تمہیں اس کی تاویل سے آگاہ کردوں گا، یعنی یہ کہ تم نے کونسا کھانا کھایا، کتنا کھایا اور کب کھایا، انھوں نے کہا کہ یہ کاہنوں اور ستارہ شناسوں کا کام ہے تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں کاہن نہیں ہوں، یہ میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے یہ قول کچھ نہیں کیونکہ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہیں اس کی تاویل سے آگاہ کردوں گا اور استفسار کرنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ "میں دیکھتا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں" اور دوسرے نے کہا کہ "میں نے اپنے آپ کو سر پر روٹی اٹھائے ہوئے دیکھا" یہ کہہ کر ان دونوں نے کہا کہ ہمیں اس کی تاویل سے آگاہ کرو" انھوں نے اسی

بات کی تاویل دریافت کی جو انھوں نے دیکھی اور یوسف علیہ السلام نے بھی اسی بات سے انھیں آگاہ کیا۔ اس کی تاویل بیداری کا طعام نہ تھی اور نہ قرآن اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو اُن چیزوں کی خبر دی جو وُہ بیداری میں کھاتے تھے۔ یہ عام قول وُہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ جو تم کھاؤ اسی کی میں خبر دوں گا۔ اس طرح کی عام خبر دینے پر تو خدا کے سوا کوئی قادر نہیں۔ انبیاء بھی اس کے کسی حصے کے متعلق خبر دیتے ہیں، سارے کے متعلق نہیں دے سکتے۔ نیز کھانے کی صفت اور اس کا اندازہ اس کی تاویل نہیں کہلا سکتی۔ نیز اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس نے یوسف علیہ السلام کو خواب کی تاویل سکھائی۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ	اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے باتوں کی تاویل سکھائے گا۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ	اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ملک دیا اور مجھے باتوں کی تفسیریں بتائیں۔

پھر وُہی فرماتے ہیں:

هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ۔	اس سے پہلے جو مجھے خواب آیا تھا، اس کی تاویل یہی ہے۔

جب بادشاہ کو خواب آیا تو یوسف علیہ السلام کے ساتھی قیدیوں میں سے رہائی پانے والے نے جسے یوسف علیہ السلام کی یاد بڑی مدت کے بعد آئی، کہا کہ مجھے قید خانہ تک جانے کی اجازت ہو تو میں یوسف علیہ السلام سے پوچھ کر اس خواب کی تاویل بتا

دوں گا اور بادشاہ نے کہا:

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ۔	اے اہل دربار اگر تعبیر خواب کی تعبیر دینی آتی ہے تو میرے خواب کے متعلق خیال ظاہر کرو۔

انھوں نے کہا:

أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ۔	یہ تو پریشان خیالات ہیں اور ہم خوابوں کی تاویل نہیں جانتے۔

یہی لفظ متعدد مقامات پر ایک ہی معنی میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔	اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے تو اگر تم اللہ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ یہ بہتر و احسن تاویل ہے۔

مجاہد و قتادہ کا قول ہے کہ اس کے معنی جزاء و ثواب کے ہیں۔ سدی، ابن زید، ابن قتیبہ اور زجاج کہتے ہیں کہ تاویل کے معنی عاقبت (انجام) کے ہیں۔ ابن زید سے یہ بھی روایت ہے کہ انھوں نے اس کے معنی "تصدیق" کے کیے ہیں، جیسا کہ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ سے ظاہر ہے۔ یہ سب اقوال صحیح ہیں۔ اور ان سب کی مراد ایک ہی ہے۔ تمام سلف صالحین کی تفسیر یہی ہے۔

سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا۔	میں تمہیں اس بات کی تاویل بتاؤں گا، جس پر تم صبر کی برداشت نہ کر سکے۔

اور یہ حضرت خضرؑ کے فعل کی تاویل ہے، ان کے قول کی تاویل نہیں ہے اور اس سے مراد اُن افعال کی عاقبت (انجام) ہے جس کی طرف ان کے افعال لوٹائے جائیں گے۔ یعنی کشتی والوں کی مصلحت، بچے کے والدین کی مصلحت اور دیوار والوں کی مصلحت۔ بعض لوگوں کا یہ قول ہے کہ اللہ ورسول کی طرف لوٹانا تمہاری تاویل کی نسبت بہتر ہے اور یہ قول اسی قسم کا ہے جو اس آیت کے ماتحت مذکور ہے اور یہ تفسیر جدید اصطلاح کے لحاظ سے ہے نہ کہ لغت عرب کے لحاظ سے۔

قدمائے مفسرین کے نزدیک تاویل وتفسیر کے الفاظ برابر ہیں۔ ابن جریرؒ کہتے ہیں۔ اَيَقُوْلُ فِيْ تَأْوِيْلِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ" اس جگہ تاویل سے تفسیر مراد ہے چونکہ امام تفسیر مجاہد کے نزدیک تاویل کا معنی یہ ہوا اس لیے اس نے وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ پر وقف قرار دیا۔ سو علمائے راسخین اس کی تفسیر جانتے ہیں، ابن قتیبہ وغیرہ اہلسنت نے یہی قول پسند کیا ہے۔ ابن قتیبہ، احمد واسحاق کے مذہب کی طرف مائل تھے، اور اس بات پر انھوں نے اپنی کتاب "المشکل" وغیرہ میں شرح وبسط کے ساتھ کلام کیا ہے۔ متاخرین اہل تفسیر ثعلبی وغیرہ تفسیر وتاویل کے مابین فرق کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی "تنویر" (روشن کرنا) اور لفظ قرآن کے مشکل مطالب کے حل کرنے کے ہیں اور تاویل، آیت کو اُن معنی کے طرف لوٹانے کو کہتے ہیں جن کو وہ برداشت کرسکے اور جو ماقبل ومابعد آیت سے مطابق ہو جائیں۔

ثعلبی نے ان دونوں کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہوئے تفصیلی کلام کیا۔ لیکن اس مقام پر صرف اسی قدر ظاہر کیا جاتے گا کہ "تاویل" جس کا اُس نے ذکر کیا ہے اس سے تیسرا اور آخری معنی مراد ہے۔ ابو الفرج ابن جوزیؒ کا قول ہے کہ علماء نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ آیا تفسیر وتاویل کے معنی ایک ہیں یا ان میں اختلاف ہے؟ بعض لوگ جو عربیت کی طرف مائل ہیں، کہتے ہیں کہ ان

دونوں کے معنی ایک ہیں، اور یہ متقدمین اہلِ تفسیر کے جمہور کا قول ہے۔ دوسری جماعت فقہ کی بنا پر ان دونوں لفظوں میں فرق کرتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کسی چیز کو پوشیدگی کے مقام سے نکال کر ظہور و شہود کے مقام پر لانے کا نام ہے، اور تاویل کلام کو اپنی وضع سے بدل کر اس معنی کی طرف لے جانے کا نام ہے جس کے اثبات کے لیے ایسی دلیل کی ضرورت ہو جس کے موجود نہ ہونے کی صورت میں ظاہر لفظ ترک نہ کیا جائے "آل الشئ الی کذا" (وہ چیز فلاں چیز کی طرف ہو گئی) یہ لوگ تاویل کے لیے صرف پہلا اور دوسرا معنی ذکر کرتے ہیں، اور لغتِ قرآن میں تاویل کے جو معنی ہیں ان کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ مشہور ہے کہ قرآن مجید میں تاویل موجود ہے، جس کی طرف کلام لوٹایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ تاویل ان معنے کے موافق ہی کیوں نہ ہو جو لفظ سے ظاہر ہوں، بلکہ اصطلاح متاخرین کے خلاف قرآن میں تاویل کا کوئی ایسا لفظ معلوم ہی نہیں جو مدلول لفظ کے خلاف ہو۔ کلام دو قسم کا ہوتا ہے، ایک انشاء، اور دوسرا اخبار۔ انشاء امر، نہی اور اباحت (اجازت) کو کہا جاتا ہے۔ امر کی تاویل خود وہ فعل ہے جس کا حکم کیا جائے۔ نہی کی تاویل امر ممنوع کا چھوڑنا ہے جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع سجود میں سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ (اے میرے پروردگار تو پاک ہے، میں تیری حمد بیان کرتا ہوں۔ اے اللہ مجھے بخش دے) پڑھ کر قرآن کی تاویل کرتے تھے۔ گویا یہ کلام اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تاویل ہے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ۔	سو اپنے پروردگار کی حمد اور پاکی بیان کر اور اس سے بخشش طلب کر۔

ابن عیینہ کا قول ہے کہ سنت امر و نہی کی تاویل ہے۔ ابو عبیدہ کا قول ہے،

کہ اشتمال صماءؔ[1] کی نہی کے متعلق فقہاء، اور اہلِ لغت میں اختلاف ہے لیکن فقہاء تاویل سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، وُہ ان افعال موجودہ کے اعیان (حقائق) سے واقف ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور افعالِ ممنوعہ کے اعیان کو بھی پہچانتے ہیں۔ جن سے اُس نے منع کیا ہے اس کے کلام کی تفسیر نفس موجود فی الخارج نہیں، بلکہ اس کا بیان، اس کی شرح اور اس کے معنی کا انکشاف ہے۔ تفسیر کلام کی جنس سے ہے۔ کلام کی تفسیر ایسے کلام سے ہوتی ہے جو اس کی وضاحت کر دیتا ہے اور تاویل وُہ فعل ہوتا ہے، جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ نیز امر ممنوع کے ترک کرنے کا نام تاویل ہے۔ یہ کلام کی جنس سے نہیں، دوسری قسم خبر ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات کے متعلق اپنے اسماء و صفات کے ذریعہ سے آگاہ کرنا اور ان وعد و وعید کے متعلق خبر دینا جن کا اس نے قرآن کریم میں ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس قول میں یہی تاویل مذکور ہے:

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ	ہم ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے جان بوجھ کر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے لیے یہ کتاب ہدایت و رحمت بنا کر بھیجی گئی ہے وُہ اس کی انتظار کر رہے ہیں کہ وُہ وعدۂ عذاب کب سچا ثابت ہو جس دن اس وعید کے مطابق عذاب آئے گا اُس دن وہ لوگ جنھوں نے پہلے اس وعید کو

[1] اشتمال صماء۔ چادر اوڑھنے کی ایک قسم ہے۔ جب کوئی شخص اپنی دائیں طرف سے بائیں ہاتھ اور بائیں کندھے پر چادر کو لے جائے، پھر اسے پیچھے کی طرف سے لوٹا کر دائیں ہاتھ اور دائیں کندھے کی طرف لے جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اشتمالِ صماء کیا۔ (مترجم بحوالہ صراح)

رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔	فراموش کردیا، کہیں گے کہ ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچی بات لے کر آئے تھے۔
یَا وَیْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔	ہائے افسوس ہمیں ہماری قبروں سے کس نے اٹھایا۔ یہ ہے جس کا ہمارے رحمٰن نے وعدہ کیا۔ اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔
اِنْطَلِقُوْا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ۔	جس بات کی تم تکذیب کرتے ہو، اس کی طرف جاؤ۔
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ۔	اور کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے وعدے میں سچے ہو تو وہ عذاب کب پورا ہوگا۔ یا رسول اللہ! ان سے کہو کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔ سو جب وہ عذاب کو دیکھ لیں گے کہ پاس آ پہنچا تو کفار کے چہرے بگڑ جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہ عذاب ہے جس کی تم خواہش کرتے تھے۔

قرآن کریم میں اس کے متعدد نظائر ہیں:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ	کیا وہ کہتے ہیں کہ رسول نے جھوٹ موٹ کا قرآن بنا لیا ہے، ان سے کہو اگر وہ سچے ہیں تو ایک سورت تو اس کے مثل کی لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے جتنے

صَادِقِيْنَ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ۔	معاندن دیا ور ہیں ان کو بھی دعوت دیں، سورت تو کیا لائیں گے حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ایسی چیز کو جھٹلایا ہے جس کے علم تک ان کی رسائی نہ ہوئی اور اس کی تاویل ان کے پاس نہ آئی۔

سو قرآن میں جس بات کا ان سے وعدہ ہوا ہے، وہ ان کے پاس ابھی آئی نہیں اور آئے گی ضرور۔ تفسیر کے اس علم کا احاطہ کرنے اور تاویل خود اس چیز کو کہتے ہیں جس کا وعدہ دیا گیا ہے۔ انھوں نے قرآن کی تکذیب کی جس کے علم کا احاطہ خود نہ کر سکے اور جس کی تاویل اُن کے پاس نہ آئی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے علم کا احاطہ کر لیتے ہیں لیکن اس کی تاویل ابھی نہیں آئی ہوتی۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہے، اگرچہ اس کی تاویل نہ آئی ہو۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ۔ الخ۔	یارسول اللہ! کہو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب نازل کرے۔ الخ

روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اِنَّهَا كَائِنَةٌ وَلَمْ يَاْتِ تَاْوِيْلُهَا بَعْدُ۔" (یہ بات ہونے والی ہے لیکن ابھی اس کی تاویل نہیں آئی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ۔	تیری قوم نے اسے جھٹلایا، حالانکہ وہ سچ ہے تو ان سے کہہ کہ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں ہر ایک خبر کی تصدیق کا ایک وقت ہوتا ہے۔

بعض نے مستقر سے مراد قرار کی جگہ حقیقت امر منتہی لی ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کے حق و باطل کا اظہار ہوتا ہے۔ صدق و کذب کا پتہ چلتا ہے۔ مقاتل کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خبر دیتا ہے اُس کا ایک وقت اور ایک مکان ہوتا ہے۔ جس میں وُہ خبر واقع ہوتی ہے۔ اس کا خلاف نہیں ہوتا اور نہ اس میں تاخیر ہوتی ہے۔ ابنِ سائب کا قول ہے کہ ہر قول و فعل کی ایک حقیقت ہوتی ہے اس سے جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وُہ تو تمہیں معلوم ہی ہے اور جو آخرت میں ہے وُہ عنقریب تم پر ظاہر و آشکارا ہو جائے گا۔ حسن کہتے ہیں کہ ہر عمل کی جزاء ہوتی ہے، جس نے نیک عمل کیا اُسے اس کی جزاء جنت میں ملے گی اور جس نے بُرا عمل کیا اُسے اس کی سزا دوزخ میں ملے گی اور عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا اور حسن کے قول کے معنی یہ ہیں کہ اعمال پر جو وعدہ وعید واقع ہو گیا ہے، وہی وُہ خبر ہے جس کے لیے مستقر ہے، اس نے معنی بیان کر دیا اور اس کی مراد یہ نہیں کہ خود جزا ہی خبر ہے۔ سدی کہتے ہیں کہ لِكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ سے مراد میعاد ہے جس کا خُدا نے لوگوں سے وعدہ کیا ہے، وُہ ان کے پاس آئیں گی اور وُہ اسے پہچان لیں گے۔ عطا سے روایت ہے کہ اُس نے لِكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ سے مراد یہ لی ہے کہ انسان کی سزا میں تاخیر کی جاتی ہے، حتیٰ کہ وُہ گناہ کرتا ہے۔ اور جب وُہ گناہ کرتا تو اسے عذاب دیا جاتا ہے، جب تک وُہ گناہ نہ کیا جائے، جس پر وعید کی گئی ہو، اس وقت تک صرف وعید باعث عقوبت نہیں ہو سکتی، اسی طرح سلف کے بہت سے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں آیات کی تاویل گزر چکی ہے اور فلاں آیات کی تاویل ابھی واقع نہیں ہوئی۔

عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ کی تاویل کا محل

ابو اشہب نے حسن و ربیع سے اور انھوں نے ابو عالیہ سے روایت کی

ہے کہ جب ابن مسعود کے سامنے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ الخ	اے ایمان والو اپنے نفسوں کو بچاؤ۔ الخ۔

کی آیت پڑھی گئی تو انھوں نے فرمایا، کہ یہ اس کا وقت نہیں ہے، جہاں تک تمہاری باتیں مانی جائیں، کہتے جاؤ۔ اور جب تمہاری باتیں نہ مانی جائیں تو اپنے آپ کو اسلام پر قائم رکھو۔ پھر فرمایا کہ قرآن تو اپنے وقت میں نازل ہو گیا۔ اس میں سے بعض آیات کی تاویل نزول سے پہلے گزر چکی ہے۔ بعض کی تاویل عہدِ نبوی میں واقع ہوئی۔ بعض کی تاویل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھوڑی مدت بعد واقع ہوتی۔ بعض کی تاویل آج سے بعد واقع ہوگی۔ بعض کی آخر زمان میں واقع ہوگی اور بعض آیات کی تاویل یوم قیامت کو واقع ہوگی، مثلاً حساب، جنت اور دوزخ وغیرہ کی تصدیق قیامت ہی کو ہو سکتی ہے۔ سو جب تک تمہارے دل اور تمہاری خواہشیں ایک رہیں، گروہ گروہ نہ بن جاؤ۔ اور ایک دوسرے کے درپے آزار نہ ہو جاؤ۔ اس وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو اور جب قلوب واہوا میں اختلاف آجائے، تم گروہ در گروہ بن جاؤ اور ایک دوسرے کو تکلیف دینے لگو، تو اس وقت ہر مرد پر اپنے نفس کو بچانا لازم ہے، اس وقت اس آیت کی تاویل ظاہر ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کلام میں امر کی تاویل اور خبر کی تاویل کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ آیت عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ امر کے باب سے اور حساب و قیامت خبر کے باب سے ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ خبر کی تاویل اس چیز کا وجود ہوتا ہے جس کی خبر دی جاتی ہے اور امر کی تاویل وہ فعل ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ جس آیت کی تاویل گزر چکی ہو وہ خبر کے باب سے ہے۔ ایک بات واقع ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا ذکر فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کے حضور میں مشرکین کے

قول کا ذکر فرمایا، اور یہ بھی ذکر فرمایا کہ انھوں نے کس طرح رسول کی تکذیب کی، اگرچہ اس کی تاویل گزر چکی ہے لیکن یہ عبرت ہے اور اس کا معنی اپنی نظیر میں ثابت ہے، ابن مسعود فرماتے ہیں، پانچ چیزیں گزر چکی ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ | ساعت قریب آگئی اور شق قمر ہو گیا۔

یہ بات تو صاف ہو گئی، امر متشابہ کی تاویل سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ جس بات کا حکم دیا گیا ہے اس کا کرنا اور جس سے منع کیا گیا ہے اسے چھوڑنا ضروری ہے۔ اور یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو۔ لیکن قرآن کریم سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ اس امر میں بھی کوئی متشابہ آیت موجود ہے:

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ | اور دوسری متشابہات ہیں۔

سے خبر مراد ہے، متشابہ خبر کی مثال وہ چیزیں ہیں جو جنت میں ہوں گی یعنی گوشت، دودھ، پانی، ریشم اور سونا وغیرہ، ان چیزوں کا جو جنت میں ہوں گی دنیا کی چیزوں سے لفظی و معنوی تشابہ ہے۔ اور اس کے باوجود ایک کی حقیقت دوسری کی حقیقت کی مخالف ہے اور یہ حقیقت ہم دنیا میں معلوم نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ | کوئی نفس نہیں جانتا کہ لوگوں کے اعمالِ نیک کے عوض ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک کہ وہ غیب میں موجود ہے، یہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی جزا ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے: يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصّٰلِحِيْنَ

مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میں نے نکوکار بندوں کے لیے وہ چیز تیار کر رکھی ہے جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھی، کسی کان نے نہیں سنی اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال گزرا) جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں سے وعدہ کیا ہے اور جسے کوئی نفس نہیں جانتا۔ یہی وہ تاویل ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح قیامت کی ساعت، جس کو اور جس کی شرائط کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ علیٰ ہذا القیاس اس کی دیگر کیفیات حساب، پلصراط، میزان، حوض، ثواب، عذاب وغیرہ کی کیفیت کو بھی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ تاویل ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اس لیے فرشتے بھی اسے نہیں جانتے۔ کوئی ایسی نظیر بھی موجود نہیں جو من کل وجہ اس کے مطابق ہو کہ اس کے ذریعہ اس کا علم حاصل ہو سکے۔ یہ "تاویل متشابہ" ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق جو خبر دی ہے مثلاً اس کا عرش پر مستوی ہونا، اس کا سننا، اس کا دیکھنا اور کلام کرنا وغیرہ کیفیات بھی اسی طرح ہیں۔ یہ بھی خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ ربیعہ ابن ابی عبدالرحمٰن اور مالک بن انس کا قول ہے کہ جب کہا گیا کہ رحمٰن عرش پر کیونکر مستوی ہوا تو آنحضرت ؐ نے فرمایا، مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے، اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ سارے اہل علم نے یہ کلام انہی دو بزرگوں سے سیکھا ہے، مالک بن انس نے "فرمایا" کی جگہ "خبر دی" کہا، اس کیفیت کا علم خاص اللہ تعالےٰ کو حاصل ہے۔ جمیع سلف ماحشون اور احمد بن حنبل وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق جو خبر دی ہے، اس کی کیفیّت بندوں کو معلوم نہیں، کیفیت ہی تاویل ہے جو خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اور نفس معنیٰ جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا، وہ ہر شخص کو بقدر اس کی فہم کے معلوم ہے، وہ سمع اور بصر کے معنیٰ سمجھتے ہیں اور یہ بھی

سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں، انہیں ان دونوں کے مابین اور علیم و قدیر کے مابین فرق معلوم ہے گو وہ سمع و بصر کی کیفیت نہیں سمجھتے۔ یہ تو یہ ہے، و من حیث الجملہ رُوح کو بھی پہچانتے ہیں لیکن اس کی کیفیت نہیں سمجھتے۔ اسی طرح وُہ استوا علی العرش کے معنی جانتے ہیں، اس کے معنی میں پروردگار کا اپنے عرش پر بلند و مرتفع ہونا شامل ہے۔ یہی معنی سلف نے بیان کیے ہیں اور مشہور بھی یہی ہیں اور لغت اس کے سوا اور کسی معنی کی متحمل نہیں، جیسا کہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل کی جا چکی ہے۔ اس لیے مالک نے کہا ہے، استوا معلوم ہے جس نے یہ کہا کہ استوا کے متعدد معنی ہیں اس نے مجمل بات کہہ دی۔ استوا کے ساتھ کوئی صلہ نہ ہو تو اس کا معنی اور ہوتا ہے "استوٰی علی شئ" کے معنے اور ہوتے ہیں "استوی مع کذا" کے اپنے اور "استوٰی الی ھکذا" کے اپنے معنے ہیں۔ سو اس کے معانی اس کے صلہ کے لحاظ سے متعدد و متنوع ہیں۔ استوی علی کذا کے معنی عرب کی مشہور لغت اور قرآن میں صرف یک معنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَآزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ۔	اسے مضبوط کیا اور وہ سخت ہو گیا اور اپنے تنے پر مستوی ہو گیا۔
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ	جودی پر مستوی ہوئی۔
لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ۔	تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر مستوی ہو کر اپنے رب کی مہربانی کو یاد کرو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کے لیے ایک جانور لایا گیا۔ جب آپ نے اپنا پاؤں مبارک رکاب میں رکھا تو فرمایا: "بِسْمِ اللّٰہِ" جب اس کی پیٹھ پر مستوی (بلند) ہوئے تو فرمایا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ"۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر مستوی ہوئے تو انھیں حج کی طرف جانے کی مبارک باد دی گئی۔

یہ معنی دو باتوں پر مشتمل ہے جس چیز پر وُہ مستوی ہُوئے اس پر وُہ بلند ہوئے دوسرے یہ کہ وُہ سیدھے اور برابر ہو کر بیٹھے۔ علو و اعتدال استوا کا مفہوم ہے، جو شخص کسی چیز پر جھکا ہوا ہو اُسے یہ نہیں کہا جاتا کہ وُہ اس چیز پر مستوی ہے۔ خلیل بن احمد کا قول ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰی بِشْرٌ عَلَی الْعِرَاقِ
مِنْ غَیْرِ سَیْفٍ وَّدَمٍ مُّھْرَاقٍ

ترجمہ:۔ پھر بشر تخت عراق پر مستوی ہوا، اور اس کے لیے نہ اُس کو تلوار چلانی پڑی اور نہ کوئی خونریزی ہوئی۔

یہ اسی باب سے ہے، اس سے مراد بشر بن مروان ہے۔ استوا سے مراد صرف استیلا (قبضہ) نہیں ہے بلکہ نفس استوا ہے۔ کیونکہ اگر صرف استیلا مراد ہوتا تو عبدالملک بھی جو کہ خلیفہ تھا، عراق اور ساری مملکت اسلام پر مستوی ہوتا، عمر بن الخطابؓ، عراق، خراسان، شام، مصر اور جمیع مفتوحات پر مستوی ہوتے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن اور دیگر مفتوحہ علاقوں پر مستوی ہوتے، اور یہ معلوم ہے کہ اُن کے کلام میں استوا کا استعمال اس موقعہ پر بالکل نہیں پایا جاتا۔ جس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وُہ کسی ملک پر مستوی ہوا اور اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ وُہ اس ملک کے تخت پر مستوی ہوا، جس طرح یہ کہا جاتا ہے،

کہ فلاں شخص سریر یا تخت پر بیٹھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا۔ — اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بلند کیا اور وہ اس کے سامنے سربسجود ہو گئے۔

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِیَتْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِیْمٌ۔ — میں نے ایک عورت دیکھی ہے جو ان لوگوں پر بادشاہی کرتی ہے۔ اُسے ہر قسم کی چیز دی گئی ہے اور اس کا بہت بڑا تخت ہے۔

زمخشری وعطا کا یہ قول کہ "اِسْتَوٰی عَلٰی كَذَا" میں "اِسْتَوٰی" سے مراد "مَلَكَ" (مالک ہوا) ہے، محض دعوٰی ہے جس کے لیے کلام عرب میں کوئی دلیل و شاہد موجود نہیں ہے۔ اگر یہ معنی صحیح بھی مان لیے جائیں، جب بھی خدا کے عرش پر مستوی ہونے کی صورت میں وہ باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس نے زمین و آسمان چھ دن میں پیدا کیے اور پھر عرش پر مستوی ہو گیا۔ اس نے یہ بھی خبر دی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق سے قبل عرش موجود تھا، جیسا کہ کتاب وسنت سے ظاہر ہے، اس صورت میں اللہ تعالیٰ عرش کا اس وقت سے مالک ہے جب سے عرش پیدا ہوا اور اسی وقت سے وہ اس پر مستولی ہے۔ سو یہ کیونکر ممکن ہے کہ استوا (بمعنی ملکیت) علی العرش میں تخلیق ارض و سمٰوات سے متاخر ہو۔ نیز وہ تو ہر ایک چیز کا مالک اور ہر چیز پر مستولی ہے۔ اس میں عرش کو استوا کے ساتھ مخصوص کرنے کی ضرورت کیوں داعی ہوئی۔ یہ تخصیص، تخصیص ربوبیت کی طرح نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول رَبُّ الْعَرْشِ میں موجود ہے۔ کبھی کبھی اسے عظمت کے لیے خاص کیا جاتا ہے، لیکن یہ بات ساری مخلوقات میں جائز ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ رَبُّ الْعَرْشِ وَرَبُّ كُلِّ شَیْءٍ (عرش کا

(رب اور ہر ایک چیز کا رب) لیکن استوا عرش کے ساتھ مختص ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ: اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَعَلٰی کُلِّ شَیْءٍ (عرش پر مستوی ہوا اور ہر چیز پر مستوی ہوا) مسلمانوں میں سے کسی نے اسے ہر چیز (فِی کُلِّ شَیْءٍ) میں استعمال نہیں کیا اور نہ یہ بات کتاب وسنت میں پائی گئی ہے۔ اس کے خلاف ربوبیت کا لفظ عرش کے بارے میں خاص طور پر اور ہر ایک چیز کے بارے میں عام طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح خلق (پیدا کرنا) اور اس کی طرح کے دیگر الفاظ کا استعمال خاص بھی ہوتا ہے اور عام بھی مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ	اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ پڑھ جو کائنات کا خالق ہے اور اس نے انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا۔

استوا ان الفاظ میں سے ہے جو عرش کے ساتھ مختص ہیں، اس کے سوا اور کسی کے ساتھ خصوصاً یا عموماً مضاف نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات دوسرے مقام پر بسط وشرح کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے۔ غرض صرف یہ ہے کہ سلف صالحین کا یہ قول بالکل درست ہے کہ استوا معلوم ہے اور جنھوں نے یہ کہا ہے کہ اس لفظ کے دس سے زیادہ معانی ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔

ابن عربی معافری کا بیان ہے کہ اس آیت کا سببِ نزول نصارٰی نجران کا آنا اور مسیح کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مناظرہ کرنا ہے، جیسا کہ اہلِ تفسیر اور اہلِ سیرت نے اس کا ذکر کیا ہے اور یہ بات مشہور بلکہ متواتر ہے۔

یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ نصارٰی نجران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انھیں اس مباہلہ کی دعوت دی جس کا ذکر سورۂ آلِ عمران میں ہے اس کے بعد انھوں نے جزیہ کا اقرار کیا اور اُن سے مباہلہ نہ کیا۔ آلِ عمران کے

ابتدائی حصے کا سبب نزول یہی ہے، اسی لیے عام طور پر یہ مسیح علیہ السلام کے ہی متعلق ہے۔ نصاریٰ نجران نے کہا کہ ہماری دلیل قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں إِنَّا اور نَحْنُ اور اس طرح کے دوسرے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ معبود تین ہیں، سو وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ گئے اور محکمات قرآنیہ کو چھوڑ دیا، جن میں مذکور ہے کہ ایک معبود ہے۔ اس سے اُن کی غرض فتنہ تھی، تاویلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کے دلوں میں کفر پیدا کرتے تھے، إِنَّا اور نَحْنُ کے الفاظ کی تاویل ڈھونڈتے تھے حالانکہ ان اسماء کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ اسماء اس واحد کے لیے بولے جاتے ہیں جس کے مددگار ہوں اور مددگار یا تو شریک ہوں گے یا مملوک؛ اس لیے یہ الفاظ متشابہ ہو گئے جس کے ساتھ شریک ہوں وہ کہتا ہے فَعَلْنَا نَحْنُ كَذَا اور إِنَّا نَفْعَلُ نَحْنُ كَذَا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان میں ممتنع ہے۔ جس کے اعوان مملوک اور مطیع لوگ ہوں، جو اسے بادشاہ سمجھ کر اس کی اطاعت کریں، وہ کہتا ہے فَعَلْنَا كَذَا یعنی میں نے اپنے اہل ملک اور ممالیک (غلاموں) کے ذریعہ سے یہ کام کیا، اور خدا کے سوا ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہے۔ وہ خود جہان کی تدبیر و انتظام کرتا ہے، جو کام کرنا چاہے اور جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ کرے اس کے فرشتے حکم کی بجا آوری کے لیے مستعد رہتے ہیں وہ اس کے قاصد و مطیع ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو إِنَّا اور نَحْنُ کہنے کا حق زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کے سوا کسی کی مملکت و ملکیت مکمل نہیں اور کسی کا حکم پورے طور پر مانا نہیں جاتا۔ اور إِنَّا اور نَحْنُ کہنے کا مستحق ہے۔ بادشاہوں کو اس بات کی مشابہت حاصل ہے۔ اس میں بھی متشابہ کا دوسرا معنیٰ ہو گیا لیکن جو بات اللہ تعالیٰ کے لیے خاص طور پر ثابت ہے۔ اس میں کوئی چیز اس کی مماثل نہیں۔ اور اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے ملائکہ، ان کی صفات اور اُن کے اندازوں کا پہچاننا

اور یہ بات معلوم کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعہ سے کیونکر آسمان اور زمین کا کام چلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ۔ | تیرے پروردگار کے لشکر کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

سو اس متشابہ کی یہ تاویل ہے، اسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگرچہ ہمیں اس کی تفسیر اور معنی معلوم ہوں، لیکن اس کی تاویل معلوم نہیں جو خارج میں واقع ہو، اس کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ قول "اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ" محکم آیت ہے، اس میں کوئی تشابہ نہیں۔ کیونکہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ "انا" اور "نحن" کی طرح نہیں ہے جو ایسے شخص کے لیے بولے جاتے ہیں جس کے شرکاء یا مددگار ہوں اور وہ ان کی طرف محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ اس سے منزّہ ہے۔

فرمایا،

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۔ | یارسول اللہ! ان سے کہو کہ جن کو تم خدا کے سوا خدائی میں دخیل سمجھتے ہو انہیں بلاؤ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کو تو کیا آسمانوں میں اور کیا زمین میں ذرہ برابر اختیار حاصل نہیں، نہ تو انہیں تخلیق ارض و سماوات میں خدا کے ساتھ کوئی ساجھا ہے اور نہ اُن میں سے کسی سے خدا نے مدد لی۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ | اور اے پیغمبر! کہو کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس کا کوئی بیٹا نہیں جس کے ملک میں اس کا

لَهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا۔ | کوئی ساجھی نہیں، جو کمزور نہیں کہ اس کا کوئی مددگار ہو اور اس کی بڑائی بیان کر دے۔

اس سے جو معنی مراد ہیں، وُہ مخلوقات کے حق میں ہیں۔ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی نظیر ثابت ہو۔ اس لیے یہ آیت متشابہ ہوئی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول" ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" اور" وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُودِيِّ" اور" وَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ" "فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَی الْفُلْكِ" (جب تو اور تیرے ہمراہی کشتی پر مستوی ہو جائیں) اور" لِتَسْتَوُوْا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ" (تاکہ ان کی پیٹھوں پر مستوی ہو جاؤ) یہ استوا اس امر کو مستلزم ہے کہ مستوی مستویٰ علیہ کی طرف محتاج ہے اور اگر اس کے نیچے سے مستویٰ علیہ معدوم کر دیا جائے تو مستوی گر جائے، اور اللہ تعالیٰ عرش سے کیا، ہر ایک چیز سے مستغنی ہے، بلکہ وُہ اپنی قدرت سے عرش کو اور حاملین عرش کو اٹھاتا ہے اور روایت ہے کہ فرشتوں کو عرش کے اٹھانے کی طاقت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ انھیں" لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" کہنے کا حکم دیتا ہے۔

سو استوا کا لفظ متشابہ ہو گیا جو بعض ایسے معانی کو مستلزم ہے جو مخلوقات کے لیے حق ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے منزہ ہے۔

استوار کے معنی علو و اعتدال ہیں، لیکن ہمیں وُہ کیفیت معلوم نہیں جو خدا کے ساتھ خاص ہے۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ عرش کی طرف سے اُسے کوئی افتقار نہیں ہوتا، بلکہ عرش اس کی طرف محتاج ہے تو پھر وُہ کیونکر مستوی ہوتا ہے اور ہر ایک چیز بہر صورت محتاج ہے اور ہم نے موجودات میں کبھی یہ واقعہ نہیں دیکھا کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز پر مستوی ہو اور اس سے بے نیاز بھی ہو اور مستویٰ علیہ مستوی کی طرف محتاج ہو اس وجہ سے یہ متشابہ ہو گیا۔

دو لفظوں اور دو معنوں میں ایک قدر مشترک ہوتا ہے اور انہی دونوں میں ایک قدر فارق بھی ہوتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کی مراد ہوتا ہے اور ہمیں وُہ فارق معلوم نہیں جس کی وجہ سے پروردگار ممتاز ہے۔ سو ہم من وجہ اسے پہچانتے ہیں، اور من وجہ اس سے جاہل رہتے ہیں۔ یہ اس کی تاویل ہے اور اول الذکر اس کی تفسیر اور جنت کے کھانے پینے اور پہننے کی چیزیں، مثلاً دودھ، شہد، شراب اور پانی بھی اس طرح ہیں، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے۔ ہمیں دودھ کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ وُہ ایک جانور سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا خروج گوبر اور خون کے درمیان سے ہوتا ہے اور اگر وُہ چند دن رہ جائے تو اُس کا مزا بدل جاتا ہے۔ شہد کے متعلق ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ وُہ شہد کی مکھی سے پیدا ہوتا ہے، جو اسے موم کے مسدس خانوں میں بناتی ہے اور یہ عسل مصفےٰ نہیں ہوتا۔ ریشم کے متعلق ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اسے ریشم کا کیڑا بناتا ہے اور وُہ پُرانا ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جن چیزوں کا وعدہ فرمایا ہے وُہ مادہ، صورت اور حقیقت کے لحاظ سے ان چیزوں کی مماثل نہیں ہیں، بلکہ ان کی ایک حقیقت ہوتی ہے جو ان چیزوں کی حقیقت کی مخالف ہے اور یہ وُہ تاویل ہے جو ہم کو معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، "دنیا میں جنت کی چیزوں کے ناموں کے سوا اور کچھ نہیں۔" لیکن کہا جاتا ہے کہ فرشتوں کو یہ معلوم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو چیزیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئیں، انھیں فرشتے نہیں جانتے اور نہ وُہ جنت کی ساری چیزوں کو جانتے ہیں۔ نیز بعض نعمتیں ایسی ہیں جنہیں فرشتے نہیں جانتے اور تاویل ان سب پر حاوی ہے۔

تشابہ کی دو قسمیں | جن چیزوں کو ہم نہیں پہچانتے اور فرشتے بھی نہیں پہچانتے

ہو سکتا ہے کہ وُہ چیزیں بھی اُن کے نزدیک متشابہ نہ ہوں اور ہمارے نزدیک متشابہ ہوں، کیونکہ متشابہ سے کبھی آیت کی صفت لازمہ مراد ہوتی ہے اور کبھی امور نسبتی مراد ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کے نزدیک کوئی چیز متشابہ ہو اور دوسرے کے نزدیک نہ ہو۔ امام احمد وغیرہ سلف صالحین کے کلام سے بھی یہی مراد لی جا سکتی ہے۔

امام احمدؒ نے جہمیہ کے ردّ میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ان تین متشابہ آیات سے استدلال کیا ہے:

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ۔	اور اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں میں ہے۔
لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ	اُس کی مثل کوئی نہیں۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ	اُسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔

امام احمدؒ نے "وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ" کی تفسیر کی ہے جب ان آیات کے معنی ہمیں معلوم ہو گئے تو وُہ ہمارے نزدیک متشابہ نہ رہیں، اور وُہ ان لوگوں کے لیے متشابہ ہیں جنھوں نے ان سے استدلال کیا ہے اور انہی پر لازم ہے کہ وُہ انہیں ان محکم آیات کی طرف لوٹائیں جنھیں وُہ جانتے ہیں۔ امام احمدؒ نے قید خانے میں جو کتاب تصنیف فرمائی، اس کے ترجمے میں وُہ یہی فرماتے ہیں، یہ زنادقہ و جہمیہ کے ان شکوک کے ردّ میں لکھی گئی تھی جو متشابہات قرآن کے متعلق ان کے دلوں میں جاگزیں تھے، اور جن کے باعث وُہ غلط تاویلات کرتے تھے۔ پھر امام احمدؒ نے ایک ایک کر کے ان آیات کی تفسیر فرمائی اور بیان کیا کہ وُہ میرے نزدیک متشابہ نہیں ہیں بلکہ ان کے معنی معلوم ہیں" اور اس طرح علمائے راسخین اس متشابہ آیت کی وُہ تاویل جانتے ہیں جو تفسیر ہے" اور جس تاویل سے مراد وُہ حقیقت ہے

جو خارج میں موجود ہوتا ہے وُہ خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

لیکن کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ متشابہ اضافی وُہ متشابہ نہیں ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔ موخر الذکر کے متعلق اللہ نے خبر دے دی ہے کہ اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور متشابہ اضافی وُہ ہوتا ہے جو بہت سے لوگوں کے لیے مشکل ہو لیکن کچھ لوگ اس کے معنی سمجھتے ہوں۔

اس کے متعلق دو جواب دیئے جاتے ہیں، ایک یہ کہ آیت میں دو قرأتیں ہیں، ایک یہ کہ اِلَّا اللّٰہُ پر وقف کیا جائے۔ اور دوسری یہ کہ وَالرَّاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ پر وقف کیا جائے اور دونوں قرأتیں حق ہیں۔ پہلی سے مراد متشابہ فی نفسہٖ ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص فرمایا ہے اور دوسری سے مراد متشابہ اضافی ہے جس کی تفسیر راسخ علماء جانتے ہیں۔ اور وُہ اس کی تاویل ہے۔

اسی طرح وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْہُ الْجِبَالُ ——— (اور اگرچہ ان کے مکر ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں) میں بھی دو قرأتیں ہیں، ایک کے مطابق "لِتَزُوْلَ" اور دوسری کے مطابق "لَتَزُوْلُ" پڑھتے ہیں۔ اور ہر ایک قرأت کا معنی صحیح ہے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً۔	اُس بلا سے ڈرو جو خاص طور پر انہی پر نازل نہ ہوگی جنھوں نے تم میں سرتابی کی ہوگی۔

سلف کی ایک جماعت نے لَتُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً پڑھا ہے اور دونوں قرأتیں حق ہیں، کیونکہ جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے تو وُہ ظالم ہے۔ اور جو شخص اس ظلم کا مقابلہ نہیں کرتا وُہ اس لحاظ سے غیر ظالم

ہو گا کہ اس نے اس میں شرکت نہیں کی اور اس لحاظ سے ظالم قرار پائے گا کہ اس پر اس ظلم کی مخالفت واجب تھی اور اُس نے اس واجب کو ترک کیا۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهٖ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ۔

جب انھوں نے نصیحت کو پس پشت ڈال دیا تو ہم نے ان لوگوں کو تو نجات دے دی جو برائی سے منع کرتے تھے، اور جن لوگوں نے ظلم کیا انھیں سخت عذاب میں گرفتار کر لیا۔

منع کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نجات دے دی، اور جو لوگ گناہ سے بُرا مناتے تھے، لیکن کہتے تھے کہ ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو سان کے متعلق اکثر کی رائے یہ ہے کہ وُہ ناجی ہیں، کیونکہ وُہ گناہ کو بُرا تو سمجھتے تھے۔ سو اُنھوں نے حسب استطاعت مخالفت کی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جو متشابہ مذکور ہیں، وُہ قطعی طور پر متشابہ فی نفسہٖ ہے اور اسی کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جن لوگوں کے کلام میں متشابہ اضافی کا ذکر آیا ہے، وُہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ انھوں نے ان آیات میں کلام کیا ہے۔ جن کا معنی مشتبہ ہوا۔ اور بعض لوگوں کو اس کے سمجھنے میں وقت داشکال پیش آیا۔ جہمیہ نے اس پر استدلال کیا جو ان کو مشتبہ اور مشکل نظر آیا۔ گو وُہ ایسا متشابہ نہ ہو جس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ بہت سے امور ایک شخص پر مشتبہ ہوتے ہیں اور دوسرے پر نہیں ہوتے۔

امام احمدؒ کے کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی مراد بھی متشابہ فی نفسہٖ ہے جسے تشابہ لازم ہے۔ ان کے کلام میں کہیں یہ نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے تشابہ اضافی مراد لیا ہو، وُہ فرماتے ہیں کہ: تَأَوَّلَتْهُ عَلٰى غَيْرِ تَأْوِيْلِهٖ میں عَلٰى غَيْرِ تَأْوِيْلِهٖ

سے مراد وُہ تاویل ہے جو تاویل نفس الامری کے خلاف ہو۔ اگرچہ یہ تاویل حقیقی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس سے یہی تاویل مراد ہے۔ اس لیے اُن کے نزدیک کوئی مشکل باقی نہیں، جس سے کوئی دوسری تاویل کا احتمال ہو اس لیے خبریات میں جس قدر متشابہ آیات ہیں، وُہ یا اللہ تعالیٰ کے متعلق ہیں یا آخرت کے متعلق۔ اس سارے کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ بعض کے نزدیک قرآن کی محکمات کی بھی تاویل ہوتی ہے

چنانچہ فرمایا: هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ تاہم اس تاویل کا وقت اور کیفیت خُدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ تاویل متشابہ کے لیے مخصوص ہے، کیونکہ وُہ وعدو وعید اور ساری باتوں میں متشابہ ہے۔ نیز یہ لازم نہیں آتا کہ ہر آیت جسے بعض لوگ متشابہ سمجھیں، وُہ فی الواقعہ متشابہ ہو، امام احمد کا قول ہے کہ انھوں نے تین متشابہ آیات سے استدلال کیا اور انہی کا قول ہے کہ انھوں نے ان آیات سے استدلال کیا جن کے متعلق خیال کیا گیا ہے کہ وُہ متشابہ ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے یا امام احمد نے ان میں سے بعض کو متشابہ قرار دیا، حالانکہ وُہ متشابہ نہیں ہیں، کیونکہ آیت:

مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ۔	اس میں سے محکم آیات ہیں جو کتاب کی اصل وہی ہیں اور دوسری متشابہات ہیں۔

اس سے عام احکام اور عام تشابہ مراد نہیں ہے، جس میں جمیع آیاتِ قرآنیہ مشترک ہوں اور وُہ اللہ تعالیٰ کی ان آیات میں مذکور ہے:

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ۔	ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیات محکم کی گئی ہیں اور پھر مفصل کی گئی ہیں۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتَابًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْہُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ۔

اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا کلام یعنی یہ کتاب نازل کی جس کی باتیں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں اور بار بار دہرائی گئی ہیں جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے جسم ان کو سن کر کانپ اٹھتے ہیں۔

یہاں سارے قرآن کی یہ وصف بیان کی گئی ہے کہ وُہ متشابہ ہے۔ یعنی وُہ متفق ہے۔ اس کی آیات میں باہم اختلاف نہیں ہے۔ ایک آیت دوسری کی تصدیق کرتی ہے :

وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔

اگر وُہ خُدا کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو اس میں وُہ بہت اختلاف پاتے۔

اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ یُّؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ۔

تم ایسی بے ٹھکانی بات میں پڑے ہو جس سے صرف وُہ شخص گمراہ ہو سکتا ہے جو ازل سے گمراہ ہو۔

سو یہ تشابہ سارے قرآن کے لیے عام ہے جس طرح اُس کی آیات کا احکام سارے قرآن کے لیے عام ہے، یہاں فرمایا: مِنْہُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِھَاتٌ،[1] سو بعض کو محکم قرار دیا اور بعض کو متشابہ چنانچہ تشابہ کے دو معنی ہوئے، اور ایک تیسرے معنی بھی ہیں، اور وُہ اضافی معنی ہیں۔ کہا جاتا ہے "قَدِ اشْتَبَہَ عَلَیْنَا ھٰذَا" (ہمیں اس چیز میں شک پڑ گیا ہے) بنی اسرائیل نے کہا:

---

[1] ترجمہ صہ ۹۳ پر دیکھو۔

إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا	اس گائے کے متعلق ہمیں شبہ پڑ گیا ہے (کیونکہ اکثر گائیں ہم شکل اور ہم رنگ ہیں،

بعض انسانوں کو کسی چیز کے متعلق اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وُہ چیز بنفسہٖ بالکل متمیز اور ایک دوسرے سے منفصل ہو اور یہ حق کے باطل کے ساتھ مشتبہ ہو جانے کے باب سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے "الحلال بَیِّنٌ وَالحرام بَیِّنٌ وَّبَیْنَ ذَالِکَ اُمُوْرٌ مُّتَشَابِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ" (حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر، اور ان دونوں کے درمیان متشابہ امور ہیں، جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے) اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ ان امور متشابہات کو جانتے ہیں، اس لیے وُہ سب لوگوں پر متشابہ نہیں ہیں، بلکہ بعض کے لیے متشابہ ہوتے ہیں۔ لیکن جس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس کے عدمِ علم میں تمام لوگ مشترک ہیں۔

مسیح علیہ السلام سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا "امور تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک وُہ جن کی اچھائی واضح ہے، ایسے امور کا اتباع کرو۔ دُوسرے وہ جن کی برائی واضح ہے ان سے بچو، تیسرے وُہ باتیں جن کے رشد وغیّ میں تمھیں اشتباہ ہو انھیں ان کے عالم کے سپرد کر دو" سو یہ بعض لوگوں پر مشتبہ ہے اور ممکن ہے کہ دوسرے اس میں حق کو پہچانتے ہوں۔ اور وہ مشتبہ باتوں میں فرق کر سکتے ہوں، اور جو لوگ کہتے ہیں کہ "راسخ علماء تاویل جانتے ہیں، ان کی مراد یہی ہے۔ اُن کے نزدیک مشتبہاتِ قرآنیہ اسی باب سے ہیں، بعض لوگوں پر مشتبہ ہوتے ہیں، اور بعض کے نزدیک مشتبہ نہیں ہوتے، اور اُن کے درمیان فرق ہوتا ہے جو اُن کے متشابہ ہونے کو مانع ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ فرق معلوم ہوتا ہے، یہ معنی فی نفسہٖ صحیح ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاتا۔

بے شک علمائے راسخین کو وُہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو دوسروں پر مشتبہ ہوتی ہیں اور کبھی یہ تشابہ قرأۃ کے اختلاف پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس موقع پر تاویل کے لفظ سے تفسیر مراد ہوتی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وُہ اس کی تاویل کو اجمالاً جانتے ہیں، جس طرح وُہ محکم کی تاویل جانتے ہیں۔ حساب، میزان، ثواب، عذاب وغیرہ امور کو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول نے خبر دی ہے، مجمل طور پر جانتے ہیں۔ اس لیے وُہ عالمین تاویل کہلاتے ہیں، اور وُہ جو اس صورت پر خارج میں واقع ہوتی ہے، اسے مفصل طور پر نہیں جانتے۔ انہیں اس کی کیفیتُ حقیقت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ وُہ اس کی مانند نہیں ہوتی جو انہیں دنیا میں معلوم ہے اور جسے انھوں نے دیکھا ہے، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وُہ اس کی تاویل جانتے ہیں، اور یہ علم اس کی تفسیر کا علم ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ وُہ اس کی تاویل نہیں جانتے۔ اور وُہ دونوں قرأتیں حق ہیں۔ اور نفی کی قرأت پر اگر یہ کہا جاتے کہ محکم کی بھی تاویل ہوتی ہے۔ جس کی تفصیل وُہ نہیں جانتے۔ تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ متشابہ آیات کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس امر کے لیے حجت نہیں ہے۔ کہ محکم کی تاویل خدا کے سوا دُوسرے لوگ بھی جانتے ہیں بلکہ محکم آیات میں سے بھی بعض کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

خاص طور پر متشابہ آیات کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ان لوگوں نے ان کی تاویل معلوم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یا یُوں سمجھ لیجئے کہ محکم کی تاویل سمجھتے ہیں لیکن اس کی تاویل کا وقت، مقام اور صفت انہیں معلوم نہیں۔

بہت سے سلف کا قول ہے کہ محکم وُہ ہے جس پر عمل کیا جائے، اور متشابہ وُہ ہے جس پر ایمان لایا جائے اور عمل نہ کیا جاتے، جیسے کہ بہت سے آثار میں آیا ہے کہ "نَعْمَلُ بِمُحْكَمِهِ وَنُؤْمِنُ بِمُتَشَابِهِهِ" (ہم اس کے محکم پر عمل کرتے ہیں اور

اس کے متشابہ کے ساتھ ایمان لاتے ہیں)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ۔ الآیۃ ۔ (جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وُہ اس کی کما حقہ تلاوت کرتے ہیں) کی تفسیر یوں فرمائی کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وُہ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حلال اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں محکمات قرآنیہ پر عمل کرتے اور متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس بارے میں سلف کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ متشابہ ایک اضافی امر ہے۔ ایک پر وہی چیز مشتبہ ہوتی ہے جو دوسرے پر مشتبہ نہیں ہوتی۔ سو ہر ایک کے لیے لازم ہے کہ جو بات اس پر ظاہر و واضح ہو جاتے، اس پر عمل کرے اور جو بات اس پر مشتبہ ہو جائے، اُسے خدا کے سپرد کر دے۔

ثوری نے مغیرہ سے روایت کی ہے، (وُہ روایت نہیں جو ضبی نے ابو عالیہ سے روایت کی ہے) کہ "ابی بن کعب سے کہا گیا، مجھے وصیّت کرو، انھوں نے فرمایا، کتاب اللہ کو امام و رہنما بنا۔ وُہ جو فیصلہ سنائے اور جو حکم دے اس پر راضی رہ۔ تمہارے رسول نے اس کو تم میں خلیفہ بنایا ہے۔ وُہ شفیع ہے، مطاع ہے، اور شاہد ہے، اس میں تمہارے ماقبل اور تمہارے سامنے کی خبر ہیں اور تم سے پہلے واقعات و امور کا اور موجودہ کوائف کا ذکر پورے طور پر موجود ہے سفیان نے بہ اسناد کہا ہے کہ ابی نے کہا، جو بات تم پر واضح ہو جائے، اس پر عمل کرو جو بات تم پر مشتبہ ہو، اس پر ایمان لاؤ اور اسے اس کے سپرد کر دو جو اُسے جانتا ہو۔

ان میں سے بعض کا قول ہے کہ متشابہ ہی منسوخ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ

متشابہ مطلقاً خبریات کا نام ہے۔ قتادہ، ربیع، ضحاک اور سدی سے مروی ہے کہ محکم وہ ناسخ ہے جس پر عمل کیا جاتا ہے، اور متشابہ وہ منسوخ ہے جس پر ایمان لایا جاتا ہے، لیکن عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح تفسیر عوفی میں بروایت ابن عباس مذکور ہے۔ انھوں نے فرمایا: محکمات قرآن اس کے ناسخ، حلال و حرام، حدود و فرائض اور ان امور کا نام ہے جن پر ایمان بھی لایا جاتا ہے اور عمل بھی کیا جاتا ہے، اور متشابہات قرآن کریم کے منسوخات، مقدم و موخر، امثال و اقسام اور وہ امور ہیں جن پر ایمان لایا جاتا ہے لیکن عمل نہیں کیا جاتا۔

خدا بہتر جانتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قول اوّل اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے:

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ	پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی ملاوٹ کو مٹاتا ہے، پھر اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منسوخ و محکم کا مقابلہ کیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس حصے کو منسوخ کرنے کا ارادہ فرمایا جس کو شیطان القا کرے جسے اس نے نازل فرمایا ہے، اسے منسوخ کرنا مراد نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے جملہ منسوخ کو متشابہ قرار دیا، کیونکہ وہ تلاوت و نظم میں دوسری آیات سے مشابہ ہے اور وہ کلام اللہ ہے، قرآن ہے، معجز ہے اور دیگر معانی بھی اس میں موجود ہیں۔ بایں ہمہ اس کے معنی منسوخ ہو گئے ہیں۔

جتنی آیات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً منسوخ، اقسام اور امثال، وہ سب متشابہ ہیں۔ لوگ ان کی تفاصیل معلوم کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے لیے ان پر مجملاً ایمان رکھنا کافی ہے، اور جن آیات پر عمل کیا جاتا ہے، ان کا

مفصل علم حاصل کرنا ضروری ہے، اور یہ اس بات کا بیان ہے جو ساری امت پر لازم ہے۔ جس چیز پر عمل کیا جاتا ہے اس کا مفصل علم ضروری ہے تاکہ وُہ اس علم کی روشنی میں اس پر عمل کر سکیں، اور جن آیات میں انھیں خبریں دی گئی ہیں ان کا جاننا نہیں، بلکہ ان پر صرف ایمان لانا ضروری ہے، گو ان کا علم بھی اچھا ہے اور فرض کفایہ ہے لیکن فرض عین نہیں ہے اور جس پر عمل کیا جائے اس کا جاننا تو ہر انسان پر فرض ہے۔ عملیات کا علم بالتفصیل ضروری ہے۔ عملیات کے علم میں تفصیل لابدی نہیں۔

مجاہد و عکرمہ سے روایت کی گئی ہے کہ، محکم وُہ ہے جس میں حلال وحرام کا بیان ہو۔ اس کے ماسوا سب متشابہ ہے جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے، اس قول کے مطابق متشابہ وُہ ہے جو کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ الخ (الآیۃ) میں مذکور ہے، حلال وحرام کے مخالف ہے۔ اور مجاہد کے قول کے مطابق یہی ہے جس کی تاویل علماء جانتے ہیں، لیکن اس آیت کے مطابق سارا قرآن متشابہ ہے اور یہاں بعض قرآن کو متشابہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے اس سے اس قول کا ضعف پایا جاتا ہے۔ پھر یتبعون ما تشابہ منہ الآیۃ میں اتباع مشتبہات کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، لیکن اگر تشابہ کے معنی آیات کے دوسرے کی مصدق ہونے کے لیے جائیں تو اس کا اتباع ممنوع نہیں۔ آیات کے ایک دوسرے کی تصدیق کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی تاویل نہ ڈھونڈی جائے۔ کبھی اس قول کے لیے وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ والی آیت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اور خود انہیں متشابہات قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انہی آیت کا بعض حصّہ بعض کا مشابہ ہے یہ نہیں کہ دوسری آیات سے مشابہ ہیں۔ اس سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ لفظ جب دو معین جگہوں میں مذکور ہوتا ہے تو وُہ متشابہ ہو جاتا ہے

مثلاً اللہ تعالیٰ کا

اِنَّا اور نَحۡنُ فرمانا، جس کا ذکر "سببِ نزولِ آیت" میں آچکا ہے۔

اور محمد بن اسحاق نے محمد بن جعفر بن الزبیر سے روایت کی ہے کہ جب اُنھوں نے اہلِ نجران اور نزولِ آیت کا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ محکم وُہ ہے جو صرف ایک تاویل کی متحمل ہو اور متشابہ وُہ ہے جس کی تاویل کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خارج میں لفظِ محکم کی تاویل صرف ایک ہو سکتی ہے اور متشابہ کی تاویلات تو متعدد ہو سکتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مراد ان میں سے صرف ایک ہوتی ہے اور سیاقِ آیت اس مراد پر دال ہوتا ہے اور علماءِ راسخین جس طرح محکم کی مراد جانتے ہیں، اسی طرح متشابہ کی مراد بھی جانتے ہیں لیکن نفسِ تاویل جو حقیقت، وقت، حوادث وغیرہ امور پر مشتمل ہے نہ محکم کی جانتے ہیں اور نہ متشابہ کی۔

بعض کہتے ہیں کہ نصارایِ نجران نے کَلِمَتُهُ اللّٰہِ اور رُوۡحٌ مِّنۡهُ (۶:۲) سے استدلال کیا "کلمۃ اللہ" سے مراد کلام اور مخلوق بالکلام ہے، اور "رُوح منہ" میں "من" ابتدائے غایت کے لیے ہے اور اس سے بعض مراد ہے سو جب یہ کہا جائے گا کہ اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اس سے مراد حقیقت ہے۔ یعنی یہ کہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمہ سے کیونکر پیدا کیے گئے۔ اور یہ کیسے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کی طرف اپنی رُوح (جبریل) بھیجی۔ حضرت مریمؑ کو ایسا نظر آیا کہ ایک اچھا خاصہ بشر اُس کے سامنے کھڑا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام میں اپنی رُوح پھونکی

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اِذَا رَاَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ سَمَّى اللّٰهُ فَاحْذَرُوْهُمْ (جب تمہیں وہ لوگ نظر آئیں جو متشابہات کے پیچھے پڑے ہوئے ہوں۔ تو ان سے بچو، وہ لوگ خدا سے بیزاری کرتے ہیں) یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کلام نازل کیا ہو جس کا کوئی معنی نہ ہو، اور نہ یہ جائز ہے کہ رسول اور ساری امت اس کے معنی نہ جانتی ہو۔ جیسا کہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ بلا شائبۂ ریب یہ قول غلط ہے۔ خواہ اس سے مراد یہ ہو کہ تاویلِ قرآن کو راسخین علماء نہیں جانتے۔ یا یہ کہ تاویل کے دو معنی ہیں، ایک معنی جانتے ہیں اور دوسرا نہیں جانتے۔ اس نفی کی نسبت کہ رسول قرآن کے متشابہات کو نہیں جانتا تھا، یہ اثبات بہتر ہے کہ راسخین علماء، متشابہات کو جانتے ہیں۔

سارے قرآن کا علم و تدبر ممکن ہے!

کتاب و سنت اور اقوالِ سلف میں اس بات کے دلائل بکثرت موجود ہیں کہ سارے قرآن کا جاننا، سمجھنا اور اس پر غور و تدبر کرنا ممکن ہے اور اس پر قطعی طور پر یقین کرنا واجب ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی قطعی دلیل موجود نہیں ہے کہ راسخین فی العلم تفسیر متشابہ نہیں جانتے۔

سلف صالحین میں سے بہتوں نے فرمایا ہے کہ انھیں تاویل متشابہ معلوم ہے۔ ان میں سے ایک مجاہد ہیں جنھیں سلف میں بہت بلند مرتبہ حاصل ہے ان کے علاوہ ربیع ابنِ انس اور محمد بن جعفر بن زبیر بھی یہی فرماتے ہیں اور انھوں نے یہ بات حضرت ابنِ عباس سے نقل کی ہے جنھوں نے فرمایا کہ "میں اُن راسخین میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں۔"

زنادقہ و جہمیہ نے متشابہاتِ قرآن میں شکوک ظاہر کیے اور آیات کی

فائق ہیں۔ قریباً تین سو تصنیفات کے مالک ہیں۔ امام احمد و اسحاق کے مذہب کی طرف مائل اور ابراہیم حربی اور محمد بن نصر مروزی کے ہم عصر ہیں۔ اہل مغرب (مصر) کے دلوں میں ان کی عظمت تھی۔ اور وہ کہا کرتے تھے کہ جو شخص ابن قتیبہ کی حرف گیری کرے گا، اسے زندقہ (ارتداد) کا گمان ہوگا اور یہی لوگ کہتے ہیں کہ جس گھر میں ابن قتیبہ کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ اس گھر میں کوئی بھلائی نہیں۔

میں کہتا ہوں اور دوسرے لوگ بھی کہتے ہیں کہ " ابن قتیبہؒ اہل سنت کے لیے ایسے ہیں جیسے جاحظ معتزلہ کے لیے ہے۔ جس طرح جاحظ معتزلہ کا خطیب تھا اسی طرح ابن قتیبہ اہل سنت کا خطیب ہے۔

الغرض یہ قول کہ " متشابہات قرآن راسخین علماء اور رسول کو معلوم ہوتے ہیں " حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت سے بھی منقول ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قول کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص ذکر نہیں کی۔ اس لیے یہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے اور وہ اللہ رسول کی طرف لوٹایا جاتے گا۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ابتغاء فتنہ اور ابتغاء تاویلہ دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متبعی متشابہات کی مذمت فرمائی ہے اور فرمایا: کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھ پاؤ جو متشابہات کے پیچھے پڑے ہوتے ہوں تو اُن سے اجتناب کرو جب صبیغ بن عسل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متشابہ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے اسے پیٹا۔ اور اللہ تعالیٰ نے "وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ" فرمایا، اگر "و" "عطف مفرد علی المفرد کے لیے ہوتی، استئناف کے لیے نہ ہوتی جس سے جملہ کا عطف جملے پر ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ وَ یَقُوْلُوْنَ فرماتا۔

دوسرے لوگ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

غلط تاویل کی، امام احمدؒ نے اُن کا رد لکھا، جس میں انھوں نے ذکر کیا کہ جہمیہ نے بین متشابہ آیات کی تاویل کی، اس تحریر میں امام احمد نے یہ بات دلیل سے ثابت کی کہ ان کے نزدیک متشابہ قرآن کے معنی علماء کو معلوم ہوتے ہیں اور مذموم امر صرف اس کی غلط تاویل کرنا ہے۔ ایسی تفسیر کرنا جو اس کے معنی کے مطابق ہو محمود اور قابل ستائش ہے، مذموم نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ امام احمد کے نزدیک راسخین علماء صحیح تاویل جانتے ہیں۔ اور وہ سلف کے اقوال کے مطابق تفسیر ہے، اس لیے اس بات کو نہ امام احمدؒ نے اور نہ سلف میں سے کسی اور بزرگ نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن میں بعض آیات ایسی موجود ہیں جن کے معنی رسول یا کسی اور کو معلوم نہیں ہیں بلکہ لفظوں کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کے معنی سے ناآشنا ہیں۔

اس قول کو بہت سے اہل سنت نے پسند کیا ہے، جس میں ابن قتیبہ اور ابو سلیمان دمشقی وغیرہما شامل ہیں۔ ابن قتیبہ ان لوگوں میں سے ہیں جو امام احمد اور اسحاق کی طرف منسوب ہیں۔ وُہ مذاہب سنت کے موید ین میں سے ہیں۔ انہوں نے اس مسئلے میں بہت سی تصنیفات کی ہیں۔ ان کے متعلق کتاب "اَلتَّحْدِیْثُ بِمَنَاقِبِ اَهْلِ الْحَدِیْثِ" کے مصنف لکھتے ہیں، وَهُوَ اَحَدُ اَعْلَامِ الْاَئِمَّةِ وَالْعُلَمَاءِ وَالْفُضَلَاءِ اَجْوَدُهُمْ تَصْنِیْفًا وَاَحْسَنُهُمْ تَرْصِیْفًا لَهٗ زُهَاءُ ثَلَاثِ مِائَةِ مُصَنَّفٍ وَکَانَ یَمِیْلُ اِلٰی مَذْهَبِ اَحْمَدَ وَاِسْحَاقَ وَکَانَ مُعَاصِرًا لِاِبْرَاهِیْمَ الْحَرْبِیِّ وَمُحَمَّدِ بْنِ نَصْرٍ الْمَرْوَزِیِّ وَکَانَ اَهْلُ الْمَغْرِبِ یُعَظِّمُوْنَهٗ وَیَقُوْلُوْنَ مَنِ اسْتَجَازَ الْوَقِیْعَةَ فِیْ اِبْنِ قُتَیْبَةَ یُتَّهَمُ بِالزَّنْدَقَةِ وَیَقُوْلُوْنَ کُلُّ بَیْتٍ لَیْسَ فِیْهِ شَیْءٌ مِّنْ تَصْنِیْفِهٖ لَاخَیْرَ فِیْهِ۔ "اور وُہ سب سے بڑے اماموں عالموں اور فاضلوں میں سے ہیں تصنیف و ترصیف کی خوبی و جودت میں سب پر

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

جو مال کفار کی بستیوں سے تمہیں محنت کے بغیر مل جائے اس میں منجملہ دیگر حق داروں کے ان محتاج مہاجرین کا حق بھی ہے جو اپنے گھروں اور مالوں میں سے باہر نکالے گئے ہیں اور اب وہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی و خوشنودی کی جستجو میں مصروف ہیں۔

پھر فرمایا،

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ ۔ الآية۔

اور ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ہجرت سے پہلے مدینے میں آباد ہو چکے اور ایمان لا چکے تھے اور جو مومن ان کی طرف ہجرت کر کے آتا اس سے محبت کرتے تھے اور مال غنیمت میں سے مہاجرین کو کچھ دے دیا جاتا تو وہ اس کی کچھ حاجت محسوس نہیں کرتے تھے خواہ وہ تنگ دست ہی کیوں نہ ہو۔

پھر فرمایا،

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔

اور ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے اور کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو مغفرت نصیب کر جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔

اور کہتے ہیں کہ ان سب آیات میں مفرد کا مفرد پر عطف ہے اور فعل سے صرف معطوف کا حال واقع ہوا ہے۔ تاہم یَبْتَغُوْنَ، یُحِبُّوْنَ اور یَقُوْلُوْنَ کے پہلے "و" نہیں ہے، سو یہ سب آیات "وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" کی نظیریں ہیں۔ نیز اگر صرف وصف ایمان مراد ہوتی تو راسخین کی تخصیص

کی جاتی۔ بلکہ یہ فرمایا جاتا کہ: "وَالْمُؤْمِنُوْنَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ" (اور مومن کہتے ہیں کہ ہم اُس کے ساتھ ایمان لاتے) کیونکہ ہر مومن پر اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ چونکہ خاص طور پر راسخین فی العلم کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ وُہ اس کی تاویل جاننے میں ممتاز ہیں اور وُہ تاویل جانتے ہیں۔ اس لیے کہ وُہ عالم ہیں اور اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں

ان کا اس کے ساتھ ایمان لانا اور اسے جاننا کامل ترین صفت ہے

اور اس کے بعد فرمایا: "وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی خاص تذکر ہے جو "اولوالالباب" کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر مقصد اتم ایمان بالالفاظ ہوتا تو تذکر کیا ہی نہ جاتا جو انھیں متشابہات کی مراد کی طرف دلالت کرے اور اس کی نظیر ایک دوسری آیت میں موجود ہے۔

فرمایا:۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔	لیکن ان میں سے راسخین فی العلم اور مومن اُس کے ساتھ جو تیری طرف نازل ہوا اور جو تجھ سے پہلے نازل ہوا، ایمان لاتے ہیں۔

سو جب انھیں رسوخ فی العلم سے متصف فرمایا، اور وُہ ایمان بھی لاتے ہیں تو اُن کے ساتھ مومنوں کو بھی شامل کر لیا۔ اگر یہاں بھی صرف ایمان مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ یُوں فرماتا:۔ "وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ۔" (اور راسخین فی العلم اور مومنین کہتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ایمان لاتے) جیسا کہ اُس نے اس آیت میں فرمایا ہے۔ چونکہ اسے مجرد ایمان کی خبر دینا مقصود تھی اس لیے دونوں جماعتوں کو جمع کر دیا۔

تدبّرِ متشابہات و ابتغاء فتنہ میں فرق ہے

یہ لوگ کہتے ہیں کہ مذمت صرف ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ابتغاء فتنہ و تاویل کے لیے متشابہ کے پیچھے پڑتے ہیں جیسا کہ فاسد الارادہ لوگوں کا حال ہوتا ہے جو قرآن کریم میں نکتہ چینی اور عیب جوئی کا ارادہ رکھتے ہیں، سو انہیں متشابہ کے سوا اور کسی آیت کی طلب مقصود نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اسی سے وُہ قلوب میں فساد پیدا کر سکتے ہیں اور یہی فتنہ ہے۔ پھر وُہ تاویل طلب کرتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں کہ انہیں علم و ہدایت مقصود ہوتی ہے بلکہ وُہ فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن اصل کو اسی لیے پیٹا تھا کہ متشابہ کے متعلق استفسار سے اس کا قصد فتنہ جوئی تھا۔

یہ اس شخص کی طرح ہے جو دوسرے کے کلام پر مشکل سوالات وارد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز سے کیا مراد ہے؟ اس کی غرض طعن و تشکیک ہوتی ہے معرفت حق نہیں ہوتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا کہ "اِذَا رَأَیْتُمُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُمْ" تو اُن کی مراد یہی لوگ تھے، جو محکم کو تو چھوڑ دیتے ہیں اور متشابہ کے پیچھے دیوانہ وار پھرتے ہیں۔ اور ایسا وہی شخص کرتا ہے جس کی نیّت فتنہ کی ہو۔ البتہ جو شخص متشابہ کے متعلق بغرض علم و معرفت اور بہ نیّت ازالہ شبہات سوال کرے اور وُہ محکمات کو جانتا ہو، اُن کا اتباع کرتا ہو، متشابہ کے ساتھ ایمان رکھتا ہو، فتنہ کا قصد نہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت نہیں فرمائی۔

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی کی روایت کردہ مشہور حدیث کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی یہی فرمایا کرتے تھے:

حَدَّثَنَا یَزِیْدُ بْنُ عَبْدِ رَبِّهٖ قَالَ حَدَّثَنَا بَقِیَّةُ قَالَ حَدَّثَنَا عُتْبَةُ

بْنُ اِبِی حَکِیْمٍ قَالَ حَدَّثَنِی عَمَارَۃُ بْنُ رَاشِدِ الْکِنَانِیُّ عَنْ زِیَادٍ عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ رَجُلَانِ فَرَجُلٌ لَہٗ فِیْہِ ھَوًی وَّنِیَّۃٌ یَغْلِیْہِ فَلْیَ الرَّأْسِ یَلْتَمِسُ اَنْ یَّجِدَ فِیْہِ اَمْرًا یَّخْرُجُ بِہٖ عَلَی النَّاسِ اُولٰئِکَ شِرَارُ اُمَّتِھِمْ اُولٰئِکَ یَعْمِی اللّٰہُ عَلَیْھِمْ سُبُلَ الْھُدٰی وَرَجُلٌ یَقْرَأُہٗ لَیْسَ فِیْہِ ھَوًی وَّلَا نِیَّۃٌ یَغْلِیْہِ فَلْیَ الرَّأْسِ فَمَا تَبَیَّنَ لَہٗ مِنْہُ عَمِلَ بِہٖ وَمَا اشْتَبَہَ عَلَیْہِ وَکَّلَہٗ اِلَی اللّٰہِ لَیَتَفَقَّھَنَّ اُولٰئِکَ فِقْھًا مَّا فَقِھَہٗ قَوْمٌ قَطُّ حَتّٰی لَوْ اَنَّ اَحَدَھُمْ مَکَثَ عِشْرِیْنَ سَنَۃً فَلْیَبْعَثَنَّ اللّٰہُ لَہٗ مَنْ یُّبَیِّنُ لَہُ الْاٰیَۃَ الَّتِیْ اَشْکَلَتْ عَلَیْہِ اَوْ یُفَھِّمُہٗ اِیَّاھَا مِنْ قِبَلِ نَفْسِہٖ۔

معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا :" قرآن دو آدمی پڑھتے ہیں، ایک شخص خواہش نفس اور خاص غرض کے لیے پڑھتا ہے۔ وُہ قرآن کریم میں اس طرح کرید کرتا ہے جیساکہ کوئی شخص سر کو کھجلائے، اس تلاش میں رہتا ہے کہ اُسے کوئی بات ملے جس کو لے کر وُہ لوگوں پر خروج کرے۔ یہ لوگ اپنی قوم کے بدترین آدمی ہوتے ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ ہدایت کی راہیں پوشیدہ کر دیتا ہے، اور ایک شخص قرآن کسی نفسانی خواہش و غرض کے لیے نہیں پڑھتا اور قرآن کریم میں بے جا کرید نہیں کرتا۔ جو بات اُس میں سے اس پر واضح ہو جائے اس پر عمل کرتا ہے اور جو بات اس پر مشتبہ ہو اُسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے، ایسے لوگوں کو ایسی سمجھ حاصل ہو جاتی ہے جو کسی قوم کو بیس سال کے مکث و انتظار کے بعد بھی حاصل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک شخص پیدا کر دیتا ہے جو اس کی مشکل حل کر دیتا ہے یا اُسے خود بخود سمجھ آجاتی ہے۔

بقیہ کا قول ہے کہ ابن عیینہ نے عتبہ کی اس حدیث سے استرشاد کیا ہے

معلوم ہوا کہ حضرت معاذ رضؓ اسی شخص کی مذمت کرتے ہیں جو فتنہ کی نیت سے اتباعِ متشابہات کرے، لیکن جس کا ارادہ سمجھنے کا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ ایسی سمجھ عطا فرماتا ہے جو کبھی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ میں سے کسی کو جب کبھی کسی آیت یا حدیث میں کوئی شبہ لاحق ہوتا تھا تو وُہ اس کے متعلق دریافت فرما لیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے سوال کیا "کیا آپ ہمیں بتائیں گے کہ ہم کیونکر بیت اللہ شریف کی طرف آئیں اور اس کا طواف کریں؟" نیز انھوں نے پوچھا کہ "اس کی وجہ کیا ہے کہ ہم امن میں بھی ہوتے ہیں اور پھر نمازوں میں قصر کرتے ہیں؟" اور جب یہ آیت مبارکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ	اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ مکدر نہیں کیا۔

۔ ۔ ۔ نازل ہوئی تو صحابہؓ اس کی تاویل کے لیے بیقرار ہو گئے اور انھوں نے پوچھا کہ "ہم سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا" چنانچہ انھیں اس کا جواب دے دیا گیا[1]

اور جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔	اپنے دلوں کی باتیں خواہ ظاہر کرو، خواہ چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے ان کا حساب لے کر چھوڑے گا۔

---

[1] حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ رضؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ! ہم میں ایسا کون ہے جو گناہ کرنے سے اپنے نفس پر تھوڑا بہت ظلم نہیں کرتا، تو آنحضرتؐ نے فرمایا کیا تم لوگوں نے لقمان علیہ السلام کی وُہ نصیحت نہیں سنی جس میں انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ غرض یہ ہے کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ (مولانا نذیر ۔۔۔)

تو صحابہ مضطرب ہوئے، اس پر اُن کے سامنے اس کی حکمت واضح کی گئی، تو انہیں اطمینان ہو گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ" (حساب میں جس کے ساتھ مناقشہ ہوا اُسے عذاب دیا جائے گا) تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا۔	سو اُس کا آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا۔

تو آپ نے فرمایا: "یہ صرف حساب پیش کرنے کے متعلق ہے۔"

آثارِ صحابہؓ کی شہادت

جو لوگ کہتے ہیں کہ راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔ وُہ اپنے قول کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ سلف کا اس قول پر اجماع ہے۔ اور انہوں نے جمیع قرآن کی تفسیر کی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ "میں نے قرآن کریم ابتداء سے انتہا تک حضرت ابن عباسؓ کو سنایا، ہر ایک آیت پر میں ٹھہر جاتا، اور اس کے متعلق اُن سے سوال کرتا تھا۔" اور صحابہؓ نے قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا ہے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن سُلمی فرماتے ہیں، کہ جو لوگ ہمیں قرآن سنایا کرتے تھے، یعنی عثمان بن عفان رضؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ۔ انہوں نے ہم سے کہا ہے کہ جب وُہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات سیکھ لیتے تھے تو جب تک ان کے متعلق علم وعمل کے سارے پہلو مکمل نہ کر لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ سو ہم نے سارا قرآن اور اس کے متعلق سارا علم وعمل سیکھا ہے۔

صحابہ وتابعین میں سے جو اہلِ تفسیر ہیں، اُن کا کلام جمیع قرآن کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بعض کے کلام میں بعض آیات کی تفسیر مفقود ہے۔ لیکن اس لیے

نہیں کہ لوگوں میں سے کوئی ان کی تفسیر نہیں جانتا، بلکہ اس لیے کہ خود انہیں معلوم نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے مطلقاً تدبر قرآن کا حکم دیا اور اس میں سے کسی حصے کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا، کہ اس پر تدبر نہ کیا جائے۔ یہ نہیں فرمایا کہ متشابہ حصے پر تدبر نہ کرو اور تدبر بدول فہم کے محال ہے۔ اگر قرآن کا کوئی حصہ ایسا ہوتا جس کا تدبر نہ کیا جاتا تو وُہ غیر معروف ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے متشابہ و غیر متشابہ کی کوئی نمایاں تحدید نہیں فرمائی تاکہ اُس کے تدبر سے اجتناب کیا جائے، اس سے بھی وُہ دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ متشابہ ایک امر اضافی و نسبی ہے اور ایک پر ایک چیز مشتبہ ہوتی ہے، دُوسرے پر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ قرآن، بیان، ہدایت، شفا اور نور ہے۔ ان اوصاف سے قرآن کریم کا کوئی حصہ مستثنیٰ نہیں ہے معنی سمجھنے کے بغیر یہ اوصاف بھی محال ہیں۔ یہ بات بھی بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر کلام نازل کیا لیکن اس کا معنی نہ نبی سمجھتا ہے اور نہ جبریل بلکہ وُہ لوگ تو یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفات، تقدیر اور معاد وغیرہ کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے جو ان لوگوں کے نزدیک متشابہات کی نظیریں ہیں، لیکن جو کچھ نبی کہتا، اُس کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ حالانکہ یہ خیال بہت کم درجہ کے آدمیوں کے متعلق بھی نہیں کیا جاسکتا۔

باری تعالیٰ فعل عبث سے منزّہ ہے

نیز کلام سے مقصود سمجھانا ہوتا ہے۔ جب مقصود یہ نہ ہو تو کلام باطل اور بے سود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فعل باطل و عبث سے منزہ قرار دیا ہے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ باطل اور بے سود باتیں کہے اور اپنی مخلوقات پر ایسا کلام نازل کرے جس سے سمجھانا مراد نہ ہو اور یہ ملحدین کی تو مین تھی

دلیلوں میں سے ہے۔ نیز قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے معنی پر صحابہؓ و تابعین نے کلام نہ کیا ہو اور اسے بیان نہ فرمایا ہو۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ صحابہؓ و تابعین نے ان میں سے بعض کے متعلق اختلاف کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف تو انھوں نے بعض آیاتِ امر و نہی میں بھی کیا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اُن کے معنی راسخین فی العلم کو معلوم ہیں۔ یہ بات بھی اس امر پر دال ہے کہ راسخین فی العلم متشابہ کی تفسیر جانتے ہیں، کیونکہ متشابہ جس طرح آیاتِ خبر میں ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی آیاتِ امر و نہی میں بھی ہوتا ہے، اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ امر و نہی کے متشابہات راسخین علماء جانتے ہیں۔ سو متشابہاتِ خبریات بھی اسی طرح ہیں۔ جو لوگ نفی کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ متشابہ کے معنی خدا کے سوا کسی فرشتے کو، کسی رسول کو اور کسی عالم کو معلوم نہیں۔ حالانکہ جہاں تک متشابہاتِ امر و نہی کا تعلق ہے، یہ قول اجماعِ مسلمین کے خلاف ہے۔ نیز قرآن و سنت اور اقوالِ صحابہؓ اس امر پر دال ہیں کہ لفظ "تاویل" جس طرح متشابہ کے لیے آتا ہے، اسی طرح محکم کے لیے بھی آتا ہے۔ جب علماء محکم کے معنی جانتے ہیں تو متشابہ کے معنی بھی تو یہی حکم رکھتے ہیں پھر یہ کیونکر کہا جائے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کے معنی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا، حالانکہ محکم متشابہ سے افضل ہے۔

بے شک قیامت کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص رکھا ہے۔ لیکن یہ بات علم متشابہ کے لیے نظیر نہیں بن سکتی۔ قیامت کے وقت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم نازل ہی نہیں فرمایا، اور نہ قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت مذکور ہے جو وقتِ قیامت پر دلالت کرے۔ یہ بات ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض باتوں کا علم اپنے لیے خاص کر لیا ہے اپنے بندوں

کو ان کے متعلق مطلع ہی نہیں فرمایا۔ نزاع تو اس کلام کے متعلق ہے جو اُس نے نازل فرمائی، جس کے متعلق اُس نے فرمایا ہے کہ وُہ ہدیٰ ہے، بیان ہے اور شفا ہے اور جس پر تدبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اس میں سے بعض کے معنی خُدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اللہ ورسول نے یہ بھی بیان نہیں فرمایا کہ وُہ حصّہ کتنا ہے جس کے معنی کوئی نہیں جانتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس شخص کے جی میں آیا کہ فلاں آیات کے معنی پر ایمان نہ لائے، اس نے محض اپنے دعوے سے ان آیات کو متشابہ قرار دے کر اپنے کفر کے لیے آڑ بنا لیا۔

پھر غور کا مقام ہے کہ سبب نزول آیت اہلِ نجران کا قصہ ہے، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّا اور نحنُ اور کَلِمَتُہٗ مِنْہُ اور رُوْحٌ مِّنْہُ سے حجّت پکڑی تھی اور اُن کے معانی جاننے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ متشابہ کے معنی فرشتوں، نبیوں اور سلف صالحین میں سے کوئی نہ سمجھے حالانکہ وُہ خدا کا کلام ہے اور ہماری طرف نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس پر تدبر کریں، اُسے سمجھیں، اور اُس نے فرمایا ہے کہ وُہ بیان، ہدیٰ، شفا اور نور ہے۔ اس کے کلام سے مراد صرف معانی ہیں، جب معنی نہ ہوں تو ایسا لفظ بولنا جائز ہی نہیں جس کے معنی نہ ہوں۔

حسنؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ بات پسند کرتا ہے کہ وُہ جو آیت نازل کرے اُس کے متعلق معلوم کیا جائے کہ وُہ کس بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ "یہود نے بحساب جمل الٓمّٓ کے حروف معجم کے متعلق سوال کیا اور یہی سوال اس آیت کے نزول کا سبب ہے" یہ روایت باطل ہے۔ ایک اس لیے کہ وُہ کلبی کی روایت ہے، دوسرے ان لوگوں نے اس وقت کہا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اوّل اوّل مدینہ شریف

میں تشریف لائے اور سورۂ آل عمران کا صدر (حصہ اوّل) وفدِ نجران کے آنے کے بعد نازل ہوا۔ یہ دعوٰے مستفیض و متواتر روایت پر مبنی ہے۔ حج بھی اسی سوت میں فرض ہوا۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حج ہجرت کے ابتدائی ایام میں فرض نہیں ہوا بلکہ نویں، یا دسویں سال فرض ہوا تھا۔ تیسرے حروف معجم اور حروف کا اس امّت کے بقاء پر دلالت کرنا وُہ تاویل قرآن نہیں ہے۔ جس کا علم اللہ تعالےٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے۔ بلکہ یا تو یہ کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس حصے سے وُہ مراد ہی نہیں لی جو وُہ اپنے کلام سے لیتا ہے۔ بلکہ اس پر حُرف کی دلالت کا دعوٰی باطل ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ وُہ اس پر دلالت کرتا ہے اور بعض لوگ اس کے مدلول کو جانتے ہیں۔ اس صورت میں لوگوں کو یہ معلوم ہوا یا یہ دعوٰے کیا جائے گا کہ قرآن اس پر دلالت کرتا ہے، اور کوئی اسے نہیں جانتا اور یہ باطل ہے۔ نیز ملاحدہ کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ جن امور علمیہ کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے انہیں رسول نہیں جانتا تھا یا اگر وُہ جانتا تھا تو اس نے بیان نہیں کیے۔ بلکہ یہ قول تو ظاہر کرتا ہے کہ وُہ جانتا ہی نہیں تھا، کیونکہ جس چیز کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اُسے کیا نبی اور کیا غیر نبی، کوئی بھی نہیں جانتا۔

اس امر کے قطعی بطلان کے لیے دلائل بکثرت ہیں کہ قرآن کریم میں بعض ایسی آیات ہیں جن کے معنی رسول یا کوئی اور نہیں جانتا۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہوتی ہیں جنہیں دوسرے لوگ تو درکنار، بہت سے علماء بھی نہیں جانتے۔ اور یہ بات کسی معین آیت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ایک ہی آیت ہوتی ہے جو ایک شخص کو معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کو معلوم نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ کبھی یہ ہوتی ہے کہ لفظ غیر مانوس ہوتا ہے،

کبھی اس کا معنی دوسرے معنی سے متشابہ ہوتا ہے۔ کبھی خود انسان کے دل میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے جو معرفتِ حق سے مانع آتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ پورے طور پر تدبّر نہیں کیا جاتا اور اس کے علاوہ اشکال فہمِ آیات کے اور بھی اسباب ہوتے ہیں۔

سو یقین رکھنا چاہیے کہ "وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ" ــــــــــــ میں قول صحیح تر یہ ہے کہ "وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" معطوف ہے اور واؤ عطف مفرد علی مفرد کے لیے ہے یا دونوں قول حق ہیں اور وُہ دو قرأتیں ہیں، اور تاویل منفی اگر صحیح بھی ہو تو وُہ اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ "وَالرَّاسِخُونَ" کی واؤ استئناف کے لیے قرار دی جائے۔

جس تاویل کا علم خُدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں. وُہ ان کیفیات سے عبارت ہے جو اُس کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اور یہ امر بحث طلب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا، میں اُن راسخین سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں۔ اور انہی سے یہ مروی ہے کہ "راسخین اس کی تاویل نہیں جانتے" پھر اُن کا ایک اور قول ہے کہ "تفسیر کی چار صورتیں ہیں۔ ایک تفسیر جو اہلِ زبان (اہلِ عرب) جانتے ہیں، ایک تفسیر وُہ ہے جس سے کوئی شخص اپنی جہالت کی وجہ سے بھی معذور نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک تفسیر علماء کو معلوم ہوتی ہے اور ایک وُہ تفسیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہوتی، اور جو شخص اس کے علم کا دعوےٰ کرے وُہ کاذب ہے" اس قول میں دونوں قول آ گئے ہیں، ایک یہ کہ علماء اُس کی تفسیر وُہ جانتے ہیں جو اُن کے سوا دوسروں کو معلوم نہیں ہوتی۔ اور دوسرا یہ کہ اس میں بعض ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں

جو خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اِلَّا اللّٰہُ پر وقف کرنا صحیح ہے اور تاویل بمعنی تفسیر ہے وہ تو قطعاً خطاء پر ہیں۔ رہا تاویل کا تیسرا معنی، یعنی یہ کہ تاویل لفظ کو احتمال راجح سے احتمال مرجوح کی طرف پھیرنے سے عبارت ہے تو یہ اصطلاح بھی عہدِ صحابہ و تابعین بلکہ ائمہ اربعہ کے زمانے تک غیر معروف تھی۔ قرونِ ثلاثہ میں بھی اس اصطلاح کا استعمال معروف نہ تھا۔ مجھے ان میں سے کسی کے متعلق یہ علم نہیں کہ اُس نے لفظ تاویل کو اس سے مخصوص کیا ہو۔ لیکن جب لفظِ تاویل کی یہ تعبیر بہت سے متاخرین کے عرف میں مشہور ہو گئی تو انھوں نے خیال کیا کہ تاویل فی الآیۃ کے بھی یہی معنی ہیں۔ اور یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ متشابہ قرآن کے معانی اس کے مفہوم کے مخالف ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دین میں تفرقے پیدا کر دیئے اور گروہ گروہ بن گئے۔

متشابہ مذکور جو نزول آیت کا سبب ہوا اُس کا ظاہر معنی فاسد پر دلالت نہیں کرتا۔ خطا سننے والے کے فہم کی ہے۔ ہاں بعض اوقات یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ صرف یہ حکم کمال مطلوب کو بیان نہیں کرتا، بلکہ مطلوب پر اس کے دلالت نہ کرنے اور اس کے نقیض پر دلالت کرنے میں فرق ہے، موخر الذکر منفی ہے۔ یہ سارے قرآن میں قطعاً کہیں نہیں کہ کوئی آیت باطل پر دلالت کرے اور اس موضوع پر کسی دوسری جگہ میں بسط و تفصیل کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے۔

لیکن بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ "ظاہر آیت کا ایک معنی ہوتا ہے جو یا تو معتقد علیہ ہوتا ہے یا باطل۔ اگر باطل ہو تو اس کی تاویل کی ضرورت پڑتی ہے" حالانکہ فی الحقیقت ان کا قول باطل ہوتا ہے۔ آیت نہ اُن کے معتقدات

پر دلالت کرتی ہے اور نہ معنی باطل پر۔ اور ایسا اتفاق بہت ہوتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کو تاویل جدید کا بہت محتاج بنا دیتے ہیں اور تاویل جدید لفظ کو اپنے مدلول سے پھیر کر غیر مدلول کی طرف لے جانے کو کہتے ہیں۔

اسلام میں تاویل صحیح کا مقام

جو لوگ کہتے ہیں کہ راسخین فی العلم تاویل جانتے ہیں وہ صحیح بخاری وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے دُعا فرمائی "اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ" (اے اللہ! ابن عباس رضی اللہ عنہ کو دین میں سمجھ اور تاویل کا علم عطاء فرما۔

سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے لیے مطلقاً علم التاویل کی دُعا فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس نے سارے قرآن کی تفسیر فرمائی۔ مجاہد کا قول ہے کہ میں نے سارا قرآن اوّل سے آخر تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا۔ پھر میں ہر آیت پر اُن کو ٹھہرالیتا اور اس کے متعلق ان سے سوال کرتا تھا اور وُہ (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ) فرماتے تھے۔ "میں اُن راسخین سے ہوں جو اس کی تاویل سمجھتے ہیں۔ نیز نقول متواترہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جمیع معانی قرآن میں کلام فرمایا، جن میں امر و خبر دونوں شامل ہیں اور امر و نہی و احکام کے متعلق انھوں نے اس طرح بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ قرآن کے جمیع معانی بیان فرماتے تھے۔

نیز حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مَا مِنْ اٰیَۃٍ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ فِیْ مَاذَا اُنْزِلَتْ" (کتاب اللہ میں کوئی ایسی آیت موجود نہیں ہے جس کے متعلق مجھے معلوم نہ ہو کہ وُہ کس بارے میں نازل ہوئی ہے) نیز وُہ

اس پر متفق ہیں کہ آیاتِ احکام کی تاویل معلوم ہوتی ہے اور وُہ قریبًا پانچ سو ہیں۔ اور سارا قرآن اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء، وصفات یا یومِ آخرت اور جنت دوزخ یا قصص اور اہل ایمان کی عافیت اور کفر کے انجام کے متعلق ایک خبر ہے اگر یہ وُہ تشابہ ہے جس کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو قرآن کریم کے اکثر حصے کے معنیٰ، کیا رسول اور کیا جمیع امت سب سے پوشیدہ رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ علانیہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات ہے۔

نیز تاویل خواب کا علم اس کلام کی تاویل جاننے کی نسبت دشوار تر ہے جس کی خبر دی جاتی ہے، کیونکہ خواب اپنی تاویل پر اس قدر خفی اور باریک اشارہ کرتا ہے کہ جمہور اُس کی تاویل کی طرف کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان باتوں کی تاویل بتا دیتا ہے جو خواب میں دیکھتے ہیں، تو وُہ انہیں کلام عربی مبین کی تاویل تو بطریق اولیٰ واخریٰ بتائے گا کیونکہ اس کلام کو وُہ انبیاء پر نازل کرتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا:

وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ	اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھے برگزیدہ بنائے گا اور تجھے باتوں کی تاویل سکھائے گا۔

یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ۔	اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ملک دیا اور باتوں کی تاویل سکھائی۔

اور فرمایا:

لَا يَأْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيْلِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّأْتِيَكُمَا۔	تمہارے پاس ابھی وہ کھانا آئیگا ہی نہیں جو تم روزمرہ کھاتے ہو کہ میں تمہیں اس کی تاویل بتادوں گا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس طرح مذمت فرمائی۔

أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ۔	کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ قرآن جھوٹ موٹ بنالیا ہے، اے رسول اللہ! ان سے کہو کہ اگر سچے ہو تو اس کی طرح کی ایک سورت کو لے آؤ۔ جہاں تک تمہارا بس چلتا ہے خدا کے سوا سب معاونین کو بھی ساتھ ملالو اور سورت بنالاؤ بلکہ وہ اس چیز (عذاب) کو جھٹلاتے ہیں جو ان کے احاطہ علم سے باہر ہے اور جس کی تاویل ان کے پاس نہیں آئی۔

اور فرمایا:

يَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ حَتّٰى إِذَا جَاءُوْا قَالَ أَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا أَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔	جس دن ہم ہر ایک قوم سے ایک جماعت کو اٹھائیں گے جو ہماری آیات کی تکذیب کیا کرتی تھی اس جماعت کی مثلیں بنائی جائیں گی جب وہ خدا کے حضور میں پہنچیں گے تو وہ ان سے کہے گا کیا تم نے میری آیات کی تکذیب کی، حالانکہ وہ تمہارے حیطہ علم سے ورا الورا تھیں اگر ایسا نہیں تو کیا کرتے ہو۔

یہ اس شخص کی مذمت ہے جو اس چیز کی تکذیب کرے جس تک اس کا علم پہنچ نہ سکے۔

قرآن کی تفسیر و تاویل میں لوگوں نے جس قدر اقوال پیش کیے ہیں، ان میں سے کسی حصّے کی تصدیق واجب نہیں ہے اور نہ اُس کی تکذیب مناسب ہے۔ جب تک اس کا علم اس کی کنہ و حقیقت کو محیط نہ ہو جائے، اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ آیت کا مفہوم حقیقی معلوم ہو جائے تاکہ اس کے سوا باقی ہر تفسیر و تاویل کو باطل سمجھ کر جھٹلا دیا جائے۔ لیکن جب اس آیت کا معنی معلوم ہی نہ ہو اور اس میں سے کسی حصّے پر بھی علم کی دسترس نہ ہوئی ہو تو ان میں کسی کی تکذیب کرنا ناجائز ہے۔ گو اقوال متناقضہ میں سے بعض کا باطل ہونا امر قطعی ہے، اس وقت مکذب بالقرآن، مکذب بالاقوال المتناقضہ کی طرح مکذب بالحق، مکذب بالباطل کی مانند ہوگا اور فساد لازم فساد ملزوم پر دلالت کرتا ہے۔ نیز اگر کوئی شخص اپنے اس عقیدہ پر بنا رکھے کہ آیاتِ خبریہ کے معانی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اس پر قرآن کی جمیع آیاتِ خبریات کی تکذیب لازم آتی ہے جس میں ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخرت بھی شامل ہے۔ اس شخص پر اُن تمام لوگوں کی تکذیب ضروری ہے جو ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کی تکذیب بھی لازم آتے گی جو خبریات سے متعلق ہیں اور اگر وُہ کہے کہ متشابہ سے بعض خبریات مراد ہیں، تو اس پر لازم ہے کہ وُہ ایک ایسی حدِ فاصل قائم کرے جس سے واضح و بین ہو جائے کہ کن کن آیات قرآنیہ کے معنی جاننے جائز ہیں۔ اور کن کن آیات کے معنی ملکِ مقرب، نبی مرسل اور صحابہ کرام وغیرہ تک کے لیے معلوم کرنے ناجائز ہیں۔ اور یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ کوئی شخص اس بات کے لیے حدِ فاصل نہیں بنا سکتا کہ کن آیات کے معانی بعض لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں اور کونسی آیات ایسی ہیں جن کے معانی سے کوئی شخص آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص ایسی حدِ فاصل قائم کرنے کی سعی لاطائل

کرے گا، ناکام رہے گا، کیونکہ دلائل قاطعہ اس کے خلاف ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ متشابہ وہ نہیں ہے جس کے معنی کسی کو معلوم نہ ہو سکیں۔ اس مسئلے میں یہ ایک مستقل دلیل ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ (اس کے علم کا احاطہ نہ کر سکے) اور كَذَّبْتُمْ بِآيَاتِي وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا (تم نے میری آیات جھٹلائیں اور تم نے ان کے علم کا احاطہ ہی نہیں کیا) اُن کی اس بات پر مذمت ہے کہ انھوں نے احاطہ کیے بغیر تکذیب کی۔ اگر عدم احاطہ میں سارے لوگ مشترک ہوتے تو اس طریق پر اُن کی مذمت کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا، بلکہ صرف تکذیب کی بناء پر مذمت کی جاتی۔ کیونکہ یہ بات بمنزلہ اس قول کے ہے کہ أَكَذَّبْتُمْ بِمَا لَمْ تُحِيطُوا بِهِ عِلْمًا وَلَا يُحِيطُ بِهِ عِلْمًا إِلَّا اللهُ (کیا تم نے اس چیز کی تکذیب کی، جس کے علم کا احاطہ تم نہ کر سکے اور اس کے علم پر خدا کے سوا کوئی محیط نہیں ہو سکتا)

جو بات خدا کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو، اس کی تکذیب کرنے والا شخص اس چیز کی تکذیب کرنے والے شخص کی نسبت زیادہ مستحق عفو و درگزر ہے جو لوگوں کو معلوم ہو، اگر راسخین اس کے علم کا احاطہ نہ کر سکیں تو اس وصعت (تکذیب) کا ترک اس کے ذکر کی نسبت مذمت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ بات ایک اور صورت سے واضح ہو جاتے گی جو اس مسئلہ میں دلیل ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو جہل و بدنیتی سے کج روی اختیار کرتے ہیں، متشابہ کا قصد کرتے اور اس کی تاویل ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ اس کی تاویل صرف راسخین فی العلم جانتے ہیں اور یہ لوگ اُن میں سے نہیں ہیں۔ یہ لوگ فتنہ جو ہوتے ہیں، علم و حق کے طالب نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔	اگر اللہ تعالیٰ ان میں صلاحیت دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق دیتا، لیکن یہ ایسے کج سرشت واقع ہوتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو سنا بھی دے تو وہ منہ پھیر پھیر کے بھاگیں

اَسْمَعَهُمْ سے مراد اَفْهَمَهُمُ الْقُرْاٰنَ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان میں حسنِ نیت اور حق کو قبول کرنے کی صفت دیکھتا تو انہیں قرآن سمجھنے کی توفیق دیتا۔ لیکن اگر وہ سمجھ بھی لیں تو ایمان اور قبولِ حق سے منہ پھیر لیں، کیونکہ ان کی نیت بری ہے، وہ جاہل و ظالم ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے دلوں میں زیغ (کجی) ہے، وہ اس لیے مذموم ہیں کہ ایک تو ان کی نیت بری ہے، دوسرے وہ ایسے علم کے جویاں ہیں جس کے وہ اہل نہیں ہیں، اس لیے علم کی بنا پر ان لوگوں کا کوئی عیب نہیں ہے۔ کیونکہ علم سے تو وہ منع کیے گئے ہیں۔ جن کی نیت اچھی ہے اور جنھیں اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم بنایا ہے وہ اگر علم حاصل نہ کریں تو یہ بات معیوب ہے۔

اگر کہا جائے کہ اکثر سلف صالحین کی رائے میں راسخین فی العلم تاویل نہیں جانتے۔ اکثر اہل لغت کی رائے بھی یہی ہے اور یہ ابن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس، عروہ، قتادہ، عمر بن عبد العزیز، فراء، ابو عبید، ثعلب اور ابن انباری (رضی اللہ عنہم اجمعین) سے مروی ہے۔ ابن انباریؒ کہتے ہیں کہ "عبد اللہؓ کی قرأۃ میں "اِنْ تَاْوِيْلُهٗ اِلَّا عِنْدَ اللّٰهِ وَالرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" (خدا کے سوا کوئی اس کی تاویل نہیں جانتا، اور راسخین فی العلم ....) ہے۔ ابیؓ اور ابن عباسؓ کی قرأۃ میں "وَيَقُوْلُ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" (اور راسخین فی العلم کہتے ہیں ...) ہے۔ ابنِ انباریؒ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بعض ایسی چیزیں

نازل کی ہیں جن کا علم اُس نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ۔	یا رسول اللہ! ان سے کہو کہ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اور فرمایا،

وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا۔	اور اس کے مابین اور بہت سی امتوں کو ہلاک کر دیا۔

محکم اس لیے نازل ہوا کہ مومن اس پر ایمان لائے اور سعادت حاصل کرے اور کافر اس سے انکار کر کے قعر شقاوت میں گرے۔ ابن انباری ؒ کہتے ہیں کہ جس شخص نے مجاہد سے دوسری روایت کی ہے، وُہ ابن ابی نجیح ہیں، اور اس کی روایت مجاہد کے متعلق صحیح تفسیر نہیں کرتی۔ یہ کہنا لاعلمی کی دلیل ہے کہ اکثر سلف اس قول کے مؤید تھے۔ صحابہؓ میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ راسخین فی العلم متشابہ کی تاویل نہیں جانتے بلکہ ان سے ثابت ہے کہ راسخین فی العلم متشابہ کو جانتے ہیں، حضرت ابنِ مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کی قرآت کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے اس کی اسناد ہی معلوم نہیں کہ اس سے استدلال کیا جائے، اور ابنِ مسعود کے متعلق مشہور ہے کہ کتاب اللہ میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے متعلق مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وُہ کس بارے میں نازل ہوئی ہے، اور ابو عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ جو لوگ ہمیں قرآن سنایا کرتے تھے، یعنی عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، انھوں نے ہمارے سامنے یہ حدیث بیان کی ہے کہ جب وُہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات پڑھ لیتے تھے، تو وُہ جب تک اُن کے متعلق علم و عمل کے جمع منازل و مراحل حل نہ کر لیتے تھے، آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اور یہ مشہور

بات ہے۔ عامۃ الناس اور اہل حدیث وتفسیر نے اسے روایت کیا اور اس کی اسناد معروف ہیں۔ اس روایت کی طرح مجہول الاسناد نہیں جو ابن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کی قرأت کے متعلق مذکور ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وُہ فرمایا کرتے تھے، "میں اُن راسخین سے ہوں جو اُس کی تاویل جانتے ہیں۔ یہ بھی صحیح حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ ابنِ عباسؓ کو تاویل کتاب کا علم عطاء فرماتے۔ پھر انہیں تاویل کا علم کیوں حاصل نہ ہو؟

عبداللہ کی قرأۃ اِنْ تَاْوِیْلُهٗ اِلَّا عِنْدَ اللّٰهِ (اس کی تاویل خدا ہی کے پاس ہے) اس کی مناقض نہیں ہے۔ کیونکہ نفس تاویل تو خدا ہی لاتے گا۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَهٗ	کیا وُہ اس کی تاویل کے منتظر ہیں۔

اور فرمایا:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ۔	بلکہ انھوں نے ایک چیز کی تکذیب کی جس کے علم کا احاطہ نہ کر سکے اور جس کی تاویل ان کے پاس نہ آئی۔

عامہ سلف کے متعلق مشہور ہے کہ وعد و وعید متشابہ ہیں اور ان کی تاویل موعود بہ کا آنا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کے سوا کوئی نہیں سکتا اور اِنْ عِلْمُ تَاْوِیْلِهٖ اِلَّا عِنْدَ اللّٰهِ (اس کی تاویل کا علم خدا کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، قرآن کریم میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے متعلق فرمایا:

يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ، ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ ۔	اے پیغمبر! تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب واقع ہو گی؟ تم ان سے کہو کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے ۔ وہی اسے اپنے وقت پر لا دکھائے گا، وہ ساعت آسمانوں اور زمینوں میں بھاری ہو گی ۔ اور تمہارے پاس یک بیک آ پہنچے گی تم سے اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا تم وقوع قیامت کے متعلق قطعی علم رکھتے ہو ان سے کہو کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ کہو کہ میں اپنے نفس کے لیے نفع و ضرر کا مالک نہیں ہوں البتہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اگر میں غیب دان ہوتا تو کثرتِ خیر حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی ۔

اسی طرح جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا ؛

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۔	پہلی امتوں کا کیا حال ہے ؟

تو انھوں نے فرمایا ؛

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى	اس کا علم میرے پروردگار کے پاس لکھا لکھایا موجود ہے میرا رب بھولتا بھٹکتا نہیں !

اگر ابن مسعودؓ کی قرأۃ راسخین سے علم تاویل کی نفی کرتی تو وہ اِنْ تَاْوِيْلُهٗ

اِلاَّ عِندَ اللّٰہِ کے بجائے اِن عِلْمُ تَاوِیْلِہٖ اِلاَّ عِنْدَ اللّٰہِ ہوتی ۔ یہ حق ہے اور اس پر کوئی نزاع نہیں ہو سکتا ۔ دوسری قراۃ ابی اور ابن عباس سے مروی ہے لیکن ابن عباس رض ہی سے ایک اور روایت منقول ہے جو اس کی مناقض ہے۔

تفسیر میں حضرت ابن عباس رض کے اخص اصحاب مجاہد ہیں اور مجاہد ہی کی تفسیر پر اکثر ائمہ، مثلاً ثوری، شافعی، احمد بن حنبل اور بخاری اعتماد کرتے ہیں ثوری کہتے ہیں: " اِذَا جَاءَكَ التَّفْسِيْرُ عَنْ مُجَاهِدٍ فَحَسْبُكَ بِهٖ (جب تمہارے پاس مجاہد کی روایت سے تفسیر پہنچ جائے تو اُسے کافی سمجھو) شافعیؒ کی کتابوں میں بھی زیادہ تر عن ابن عیینۃ، عن ابن ابی نجیح، عن مجاھد ہی ملتا ہے ۔ بخاری بھی اپنی "صحیح" میں اسی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ " ابن ابی نجیح عن مجاہد " کی روایت صحیح نہیں، بلکہ ابن ابی نجیح عن مجاہد کی تفسیر جمیع تفاسیر سے اصح ہے ۔ اہل تفسیر کے ہاتھ میں اس سے زیادہ صحیح کوئی تفسیر نہیں ۔ البتہ صحت میں اس کی نظیر ہو تو ہو ۔ اس کے علاوہ مجاہد کے پاس اس کے قول کی تصدیق میں یہ بات موجود ہے کہ عَرَضْتُ الْمُصْحَفَ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ رض اُقِفُهُ عِنْدَ كُلِّ اٰيَةٍ وَاَسْأَلُهٗ عَنْهَا (میں نے سارا قرآن ابن عباس کے سامنے پیش کیا ۔ میں ہر آیت پر انہیں ٹھہراتا اور اُس کے متعلق اُن سے سوال کرتا تھا)

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی معلوم ہوا ہے کہ وہ متشابہات قرآن کی تفسیر فرمایا کرتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے " فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا " " اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " اور " وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ " ۔ الآیۃ کی تفسیر کی ۔ ابی بن کعب سے یہ روایت پہلی روایت کی نسبت زیادہ ثابت و صحیح ہے، کیونکہ معروف الاسناد ہے اور اس کی اسناد معلوم نہیں ۔ اُن سے متشابہات قرآنیہ کے معانی پوچھے

جاتے تھے۔ اور وہ جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے لیلۃ القدر کے متعلق سوال کیا۔

بے شک ان کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجمل کو اس لیے نازل فرمایا کہ مومن اس کے ساتھ ایمان لائے، لیکن کیا کتاب و سنت یا سلف میں سے کسی کے قول سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء، ملائکہ و صحابہ اس کلام مجمل کو نہیں سمجھتے، یا علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مجملات قرآن کے معنی سمجھے جاتے ہیں، اور ان میں جو اجمال ہوتا ہے وہ بھی معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ قیامت کی مثال سے ظاہر ہے۔ قیامت کے متعلق خبر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس قدر کلام نازل فرمایا ہے، اس کے معنی سارے مسلمان جانتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ وہ ضرور آنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کا وقت کسی کو نہیں بتایا، اسی لیے جب ایک شخص نے جو بظاہر اعرابی تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے متعلق سوال کیا کہ وہ کب ہوگی؟ تو آپؐ نے فرمایا: مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ۔ (قیامت کے متعلق مسئول سائل سے زیادہ عالم نہیں) آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ذکر قیامت میں جو کلام نازل ہوا ہے اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ یہ اجماع مسلمین کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کا قیامت اور اس کی شرطوں کے متعلق خبر دینا واضح و بین کلام ہے، جس کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں: اسی طرح وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا کے معنی بھی معلوم ہیں اللہ تعالیٰ نے بہت سی امتیں پیدا کی ہیں جن کی تعداد خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اسی طرح فرمایا: وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ۔ اس میں کون سی بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کی خبر دی ہے ان کے معنی انبیاء،

ملائک، صحابہ وغیرہ میں سے کوئی نہیں سمجھتا۔

عروہ کے متعلق جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عروہ عام آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر نہیں کرتے تھے، انھوں نے تھوڑی سی آیات کی تفسیر کی ہے جنھیں انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا۔ ظاہر ہے کہ عروہ کے تفسیر نہ جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر خلفائے راشدین اور علماء صحابہؓ ابن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ اور ابن عباسؓ وغیرہم بھی نہیں جانتے تھے۔

اہل لغت کے قول و فعل میں تناقض

اہل لغت کا رویہ بہت متناقضانہ ہے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ راسخین متشابہ کے معنی نہیں جانتے، لیکن خود قرآن کریم کی ہر آیت کی تفسیر میں کلام کرتے ہیں اور ایسی وسعت و فراخی سے بحث کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسے اقوال پیش کرتا ہے، جن کی نظیر پہلے موجود نہیں ہوتی، اور یہ خطا ہے۔

ابنِ انباری نے اس قول کی تائید میں مبالغہ کیا ہے، لیکن وُہ اُن لوگوں سے ہے جنھوں نے آیات متشابہات کے معنی میں سب سے زیادہ بحث کی ہے۔ ابنِ انباری متشابہات کے متعلق ایسے اقوال ذکر کرتا ہے جو سلف میں سے کسی سے منقول نہیں ہیں اور قرآن کی تفسیر میں سواد سلف سے استدلال کرتا ہے، اس لیے اس کا ارادہ یہ تھا کہ ابنِ قتیبہ کی تردید کرے، حالانکہ وُہ ابنِ قتیبہ کی نسبت قرآن و حدیث کے معانی کا زیادہ واقف اور سنت کا زیادہ متبع نہیں ہے۔ اور گو ابنِ انباری دنیا جہان سے زیادہ حافظِ لغت ہے لیکن اس مسئلے میں اسے ابنِ قتیبہ کی نسبت زیادہ سمجھ حاصل نہیں نصوص کا سمجھنا اور چیز ہے اور الفاظ لغت کا حفظ کرنا اور چیز ہے۔ ان لوگوں کو

ابنِ قتیبہؒ سے اس لیے پرخاش ہے کہ اُس نے ابو عبید کی تفسیر کی بعض باتوں کی تردید کی ہے اور اس معاملے میں ابنِ قتیبہ معذور تھا، اس کا یہ مسلک اس طرح کے اہل علم سے کچھ نرالا نہیں تھا۔ کیا وہ اور کیا دوسرے علماء کبھی درست بات کرتے ہیں اور کبھی خطاء بھی کرتے ہیں۔ اگر متشابہ کے معنی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا تو وُہ سب خدا کے حضور میں گستاخی کرتے ہیں، ایسی چیز کے بارے میں بحث کرتے ہیں جس کی معرفت کا کوئی امکان نہیں، اگر انھوں نے متشابہ آیات میں سے کسی ایک کا معنی بیان کر دیا اور اس میں ایک کلمہ بھی صحیح نکلا تو اُن کی یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ متشابہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مخلوق میں سے کوئی ہستی اس سے آگاہ نہیں۔ آخر ان کے کس قول کو ترجیح دی جاتی ہے؟

یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی تفسیر متشابہات ایک بڑی حد تک صحیح ہے اور اس کے بعض حصے میں اغلاط بھی ہوتے ہیں۔ قتادہؒ سے بھی منقول ہے کہ راسخین فی العلم متشابہ کی تاویل نہیں جانتے۔ لیکن اس کی کتابِ تفسیر مشہور ترین کتابوں سے ہے۔ معمر اور سعید بن عروبہ کی روایت سے اس کی نقل ثابت ہے۔ اس لیے عامہ اہلِ تفسیر اس کے قول کو صحتِ نقل کے لیے ذکر کرتے ہیں۔ بایں ہمہ اس نے کیا محکم اور کیا متشابہ سارے قرآن کی تفسیر کی ہے۔

اہل سنت کی طرف سے "لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ" کے قول کی شہرت کا اقتضاء یہ تھا کہ اہل بدعت، جہمیّہ، قدریّہ، معتزلہ وغیرہ کی طرف سے تاویلات باطلہ کا ظہور ہونے لگا تھا، یہ لوگ اپنی فاسد رائے سے تاویل قرآن پر بحث کرنے لگے اور یہ اہلِ بدعت کی مشہور و معروف اصل ہے کہ وُہ اپنی عقلی رائے اور لغوی تاویل سے قرآن کی تفسیر کرتے ہیں۔ معتزلہ کی تفاسیر ان نصوص کی تاویلاتِ باطلہ

سے بھری پڑی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی صفات اور تقدیر کا اثبات ہوتا ہے یہ تاویلات اللہ اور رسول کی مراد کے خلاف ہیں۔ سلفِ صالحین اور ائمہ مسلمین کا انکار ان تاویلاتِ فاسدہ کے متعلق ہے جیسا کہ امام احمد نے زنادقہ و جہمیہ کے رد میں کہا ہے "جن کو متشابہ قرآن میں شک ہوا اور جنھوں نے اس کی غلط تاویل کی۔ سلف و ائمہ نے ایسی تاویل سے انکار کیا ہے"۔ ان کے بعد ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو سنت کی طرف منسوب تھے، لیکن سنت اور خلافِ سنت سے انہیں پوری واقفیت نہیں تھی اور خیال کرنے لگے کہ متشابہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اُن کے خیال میں تاویل کے معنی وہی تھے جو متاخرین کی اصطلاح میں مشہور تھے۔ یعنی لفظ کو احتمال راجح سے احتمال مرجوح کی طرف پھیر دینا۔ سو وہ کہنے لگے کہ متشابہ کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر وہ کئی وجوہ سے اس قول کو توڑ بھی دیتے ہیں، ایک یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ نصوص اپنے طور پر جاری ہوتی ہیں اور وہ ظاہر معنی پر کسی اور معنی کا اضافہ نہیں کرتے، اس لیے دوسرے الفاظ میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ جو تاویل ظاہر کے خلاف ہو گی وہ باطل ہے اور ظاہر معنی کو صحیح قرار دیتے ہیں، اس کے باوجود کہتے ہیں کہ اس کی ایک ایسی تاویل ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ان کے نزدیک تاویل وہ ہے جو ظاہر کے مناقض ہو، سو ایسی تاویل کیونکر ہو سکتی ہے جو ظاہر کے خلاف ہو، اُن کے مناظرین نے ان کے اس نظریے سے انکار کیا ہے۔ حتیٰ کہ ابنِ عقیل نے اپنے شیخ قاضی ابویعلی کی مخالفت کی ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جب ان لوگوں کے سامنے نص بیان کی جاتی ہے جو کسی اصولی یا فرعی مسئلے میں ان کے قول کی مخالف ہو تو وہ اس نص کی نہایت بعید اور پُر تکلف تاویلات کرتے ہیں اور "تَحْرِيفُ الْكَلِمِ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ"

کلمہ کو اس کی جگہ سے بدل ڈالنا) کے مصداق بنتے ہیں۔ ان کی یہ تاویلات جہمیہ وقدریہ کی طرح ہوتی ہیں جو ان کے مخالف ہیں۔

ادھر تو تاویلات میں اس قدر غلو کرتے ہیں اور ادھر یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ نصوص متشابہ کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان لوگوں کی وہ کتابیں دیکھئے جن میں معتزلہ کے ساتھ ان کے مناظروں کی کیفیت درج ہے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ حسب ذیل آیات کی تاویلات کس تکلف کے ساتھ کرتے ہیں، جن میں سے اکثر فاسد ہیں:

۱۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔	اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔
۲۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ۔	اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا۔
۳۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔	اور میں نے جنوں اور آدمیوں کو محض اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں!
۴۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔	آنکھیں اسے نہیں پا سکتیں۔
۵ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔	اس کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے کہ اسے کہے ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔
۶۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ۔	اور جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا۔

اگر ان تاویلات میں سے بعض حق ہیں تو ان کی تاویلات اس بات کی حجت ہیں کہ راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل جانتے ہیں اور ان کا تناقض

ظاہر ہوتا ہے اور اگر باطل ہو تو یہ بات ان کے لیے بعید تر ہے۔

تاویلاتِ باطلہ کے خلاف احمد بن حنبل کا جہاد

جب زنادقہ جہمیہ کو متشابہ قرآن میں شکوک پیدا ہوئے اور وہ اس کی غلط تاویل کرنے لگے تو امام اہل سنت احمد بن حنبل نے ان کے رد میں کتاب لکھی، جس میں انھوں نے معانی متشابہ پر بحث کی، فتنہ و تاویل کے علمبرداران کی خوب دھجیاں بکھیریں۔ ایک ایک آیت کی کماحقہ چھان بین کی، اس کے معنی بیان کیے اور اس وضاحت سے تفسیر کی کہ ارباب زیغ و تعمق کا سارا راز طشت از بام ہو گیا۔ حجج عقلیہ و براہین سمعیہ سے ثابت کیا کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت برحق ہے۔ قرآن غیر مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے۔ مناظرہ کے وقت بھی جب مخالفین نے نصوص سے استدلال کیا تو امام احمد نے ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث کی تفسیر فرمائی اور زائغین کے فساد تاویل کی وضاحت فرمائی۔

امام وہ جلیل القدر انسان ہیں جنھوں نے حق وحدانیت کی راہ میں صبر و محنت کشی کا حق ادا کیا اور مسلمانوں نے انہیں حق و صداقت اور راہِ سنت کا معیار قرار دیا۔ جب کبھی حق و باطل کی آویزش ہو، سنت و بدعت میں اشتباہ والتباس واقع ہو تو امام احمد بن حنبلؒ ہی کے معیار پر اس کی تفریق کی جاتی ہے۔

الغرض مناظرہ کے وقت امام احمد بن حنبل ایک بے پناہ سیلاب کی طرح تعبیر کرتے گئے اور کسی نے یہ نہ کہا کہ ان آیات و احادیث کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، بلکہ ساری جماعتیں اس پر متفق تھیں کہ ان کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں۔ صرف مراد پر نزاع تھا اور یہ تو آیاتِ امر و نہی میں بھی ہوتا ہے اسی طرح ان متشابہ آیات و احادیث کی تفسیر ہے جن سے خوارج استدلال

کرتے ہیں۔ مثلاً "لَا یَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الشَّارِبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ" (زانی زنا کے وقت مومن نہیں رہتا، سارق چوری کرتے وقت مومن نہیں رہتا، اور شراب پینے والا شراب پیتے وقت مومن نہیں رہتا)

اسی طرح اور بہت سی احادیث و آیات کی تشریح کی گئی ہے۔ آپ نے مرجئہ و جہمیہ کی تردید بھی خوب فرمائی۔ یہ سب جماعتیں نصوص متشابہ سے استدلال کرتی ہیں، لیکن نہ ان میں سے اور نہ اہل سنت میں سے کسی نے کہا کہ ان احادیث و آیات کے معنی نہیں سمجھے جا سکتے۔ امام احمد اور ان کے مناظرین کی گفتگو ہوتی رہی لیکن یہ بات کسی بشر کی زبان پر نہ آئی کہ ان آیات و احادیث کے معنی صرف خدا جانتا ہے۔

امام احمدؒ ان اہل بدعت کے طریقہ کی تردید کرتے تھے جو اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرتے تھے اور ان کی اس تاویل کو باطل قرار دیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ و تابعین کے اقوال سے استدلال کیے بغیر کی جاتی تھی۔ تابعین کو صحابہ ہی نے قرآن کے الفاظ و معانی سکھائے ہیں۔ اہل بدعت نصوص کی تاویلات اس طریق پر کرتے ہیں جو اللہ و رسول کی مراد کے خلاف ہے اور دعوے کرتے ہیں کہ یہی وہ تاویل ہے جسے راسخین جانتے ہیں، حالانکہ وہ اس میں باطل پر ہیں۔ علی الخصوص قرامطہ و باطنیہ ملاحدہ کی تاویلات تو نہایت لغو ہیں، جہمیہ و قدریہ وغیرہ کے متکلمین جدید کی تاویلات بھی ایسی ہی باطل ہیں، لیکن وہ اتنا کرتے ہیں کہ کہہ دیتے ہیں کہ انہیں تاویل نہیں آتی۔ ان کی غایت یہ ہے کہ وہ اس آیت کے ظاہر کو مراد آیت نہیں سکتے، البتہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے یہ معنی ہوں اور ممکن ہے وہ ہوں۔ اور اگر ان میں سے کوئی شخص کسی آیت کی

معین تاویل بھی کرے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ ورسول کی مراد یہی ہے بلکہ ان کے نزدیک ممکن ہے کہ اللہ ورسول کی مراد اس کے سوا کچھ اور ہو۔ نصوص کتاب کی متعدد تاویلات اس بات کی مثالیں ہیں۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حسب ذیل آیات کی تاویل کرتے ہیں:

۱۔ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔	اور تیرا رب آئے گا اور اس کے ساتھ فرشتے صف بہ صف آئیں گے۔
۲۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔	اور رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔
۳۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔	اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اچھی طرح باتیں کیں۔
۴۔ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔	اُن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا
۵۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔	اور اس کا طریق یہ ہے کہ جب وُہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہوجا تو وُہ ہوجاتی ہے۔

لیکن ان کے قول کی غایت یہ ہوتی ہے کہ احتمال ہے کہ یہ مراد ہو، جائز ہے کہ فلاں معنیٰ کیا جائے۔ وقس علیٰ ہذا۔ اور یہ بات علم بالتاویل نہیں کہلا سکتی۔ جس شخص نے بھی کسی نص کے متعلق اقوال واحتمالات ذکر کیے اور اس کی مراد نہ سمجھی تو وُہ اس کی تفسیر وتاویل کا عالم نہیں ہوسکتا۔ عالم تاویل وتفسیر وُہ ہے جو اس کی مراد جانتا ہو۔

ملاحدہ میں سے بعض کا دعوٰی ہے کہ ادلہ سمعیہ مفید علم نہیں ہوسکتیں اس شخص کے قول کے مطابق کوئی شخص محکم اور متشابہ کی تفسیر وتاویل نہیں جانتا

اور یہ اُس شخص نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے، کیونکہ اس دعوے کے مطابق راسخین میں سے کوئی شخص متشابہ تو درکنار محکم کی تاویل بھی نہیں جانتا اور جب اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی شامل کر لی جائے کہ ان کا کلام سفسطہ و تلبیس سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور دلیل حق کوئی نہیں ہوتی تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان کو نہ سمعیات سے کوئی بہرہ حاصل ہوتا ہے اور نہ عقلیات سے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ دوزخ کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ کہیں گے،

لَوْكُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ	اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہلِ دوزخ میں نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف و تحسین فرمائی ہے، جن کے سامنے اُس کی آیات کا ذکر کیا جائے تو وُہ بہرے اور اندھے ہو کر اُن پر نہیں گر پڑتے۔ بلکہ سوچتے سمجھتے ہیں اور جو لوگ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں، ان کی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعدد جگہ مذمت کی ہے۔

فتنہ اختراعِ الفاظ مجملہ!

اہلِ بدعت جو کتاب و سنت کے مخالف ہیں، علم و عرفان اور تحقیق کا دعوےٰ کرتے ہیں وُہ سمعیات و عقلیات میں تمام لوگوں سے زیادہ جاہل ہیں۔ اپنے لیے مجمل و متشابہ الفاظ تراش لیتے ہیں جو حق و باطل دونوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کو تو وُہ محکم اصول قرار دیتے ہیں اور نصوصِ کتاب و سنت میں سے جو کچھ ان اباطیل کے معارض ہو، اسے متشابہ قرار دے کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے معنی کوئی نہیں جانتا۔" احتمالات سے جو تاویل کرتے ہیں وُہ مفید نہیں ہوتی۔ براہین کو شبہات اور شبہات کو براہین قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ دوسرے

مقام پر بالتفصیل مذکور ہے۔
قاضی ابویعلیٰؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے، کہ "محکم وُہ ہے جو بنفسہٖ مستقل ہو اور بیان کا محتاج نہ ہو، متشابہ وُہ ہے جو محتاج بیان ہو" امام احمدؒ نے ایک روایت میں اسی طرح فرمایا ہے۔ اور شافعیؒ سے مروی ہے کہ محکم وُہ ہے جس کی تاویل کی صرف ایک صورت ہو سکے، اور متشابہ وُہ ہے جس کی تاویل کی کئی صورتیں ہوں۔ امام احمد اور ابن انباری نے بھی کہا ہے کہ محکم وُہ ہے جس کی تاویل صرف ایک صورت ہو، اور متشابہ وُہ ہے، جس کی تاویلات بہت سی ہوں۔

سو کہا جائے گا کہ جمیع سلف و خلف امت قرآنِ کریم کے ان معانی پر بحث کرتے رہے ہیں، جن میں احتمالِ تاویلات ہوتا ہے۔ اور سب سے زیادہ بحث اُن لوگوں نے کی ہے جو اس قول کی تائید کرتے ہیں کہ راسخین فی العلم متشابہ کی تاویل نہیں جانتے۔ امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور جمیع ائمہ اسلام معانی محتملۂ تاویلات پر بحث کرتے اور اُن میں سے ایک کو دوسرے پر دلائل کے ساتھ ترجیح دیتے رہے ہیں۔ علم کے تمام اصولی و فروعی مسائل پر بحثیں ہوتی رہی ہیں اور کسی عالم سے یہ معلوم نہیں ہوا کہ کسی مسئلے میں اُس نے کسی نص سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا ہو کہ اس آیت یا حدیث کا معنیٰ کوئی نہیں جانتا، اس لیے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور اگر کسی نے ایسا کہا ہے تو اس کا یہی جواب ہوگا جو پہلے گزر چکا ہے اور جب وُہ یہ دعوےٰ کرے گا کہ ائمہ کے درمیان جو مسائل نزاع مشہور ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نص محکم ہوتی ہے جس کا معنیٰ معلوم ہے اور دوسری نص متشابہ ہوتی ہے جس کا معنیٰ کسی کو معلوم نہیں ہوتا تو اس دعوے کے جواب میں اسی کے مثل دعوےٰ پیش کیا جائے گا۔ یہ قول بھی تو مشہور ہے

کہ بعض نصوص کے معنی جلی واضح اور ظاہر ہوتے ہیں، جس میں صرف ایک صورت کا احتمال ہوتا ہے اور کوئی اشتباہ واضح نہیں ہوتا اور انہی میں سے ایسی نصوص بھی ہیں جن میں خفاء واشتباہ ہوتا ہے اور جن کے معنی صرف راسخین فی العلم کو معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات درست اور صحیح ہے۔ سو متشابہ کے متعلق خلف کے اقوال سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سارے متشابہات کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو شخص اس امر کا قائل ہے کہ ساری نصوص کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں وہ اس کے لیے دلائل بیان کرتے ہیں۔

الغرض سلف وخلف سب کے نزدیک یہی بات صحیح ہے کہ متشابہ کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ متشابہ منسوخ کو کہتے ہیں اور منسوخ کے معنی عام طور پر معلوم ہیں، اور یہ قول ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، قتادہؒ، سدیؒ وغیرہ سے مروی ہے اور ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور قتادہؒ ہی سے یہ قول بھی منقول ہے کہ راسخین فی العلم متشابہ کی تاویل نہیں جانتے۔ تمام مسلمانوں کا اس بات پر قطعی طور پر اتفاق ہے کہ راسخین منسوخ کے معنی جانتے ہیں۔ سو یہ روایت اس روایت کی مناقض ہوئی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو وہ جھوٹ ہے، ورنہ دو روایتوں میں تعارض لازم آتا ہے اور ان سے بتواتر مروی ہے کہ راسخین متشابہ کے معنی جانتے ہیں۔

اور دوسرا قول جابر ابن عبداللہ سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ "محکم وہ ہے جس کے معنی علماء کو معلوم ہوں اور متشابہ وہ ہے جس کو معلوم کرنے کا راستہ علماء کو معلوم نہ ہو۔ مثلاً قیامِ محشر کسی کو معلوم نہیں۔" اور معلوم ہے کہ قیامِ محشر کا وقت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں اور جب لفظِ تاویل سے مراد یہ ہو تو اس سے مراد یہ ہوئی، کہ اس کی تاویل کا "وقت" کوئی نہیں جانتا، اور یہ حق ہے

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیامت کے متعلق جو ذکر آیا ہے، اس کا معنی معلوم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر تاویل سے حقائق موجودہ مراد ہوں اور کہا جائے کہ اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تو اس کا ذکر بھی پہلے آچکا ہے اور یہ ان لوگوں کا قول ہے، جو وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ پر وقف کرتے ہیں۔ تاویل سے یہی معنی مراد لینا ضروری ہے اور اگر تاویل سے تفسیر اور معنی معلوم کرنا مراد لیا جائے اور إِلَّا اللَّهُ کے بعد وقف کیا جائے تو یہ قطعًا غلط اور کتاب وسنت و اجماع مسلمین کے خلاف ہے۔ متاخرین میں سے بعض نے یہ کہا ہے، لیکن ان کے اقوال متناقض ہیں، ایک ہی شخص یہ قول بھی پیش کرتا ہے اور اس کے مناقض قول بھی پیش کرتا ہے، اور یہ قول بہت سی وجوہ سے ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا مناقض ہے۔ اس سے رسالت کی تنقیص لازم آتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جن لوگوں نے یہ کہا ہے، انھوں نے اس قول کے لوازم اور اس کے اطلاق کی حقیقت پر غور نہیں کیا۔ ان کا بزرگ ترین قصد متشابہ اہل بدعت کی تاویلات کا دفعیہ کرنا تھا۔ یہ ارادہ حق ہے اور اس پر ہر مسلم ان سے موافقت کرتا ہے، لیکن باطل کا دفعیہ ایک دوسری باطل چیز سے اور بدعت کا ردّ بدعت سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے کہ اہل باطل کی تفسیر قرآن کی تردید کرنے کے لیے ہم یہ کہنا شروع کردیں کہ رسولؐ اور صحابہ متشابہاتِ قرآن کی تفسیر نہیں جانتے تھے۔ رسول اور سلف امت اسلام کی شان میں یہ ظن رکھنا اس جماعت کی غلطی سے بزرگ تر غلطی ہے جو بعض آیات کی غلط تفسیر کرتی ہے، ایک عقلمند کی شان کے شایاں نہیں ہے کہ ایک محل تعمیر کرنے کے لیے ایک شہر کو منہدم کردے۔

حروفِ مقطعات پر بحث

تیسرا قول یہ ہے کہ متشابہ وُہ حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کے شروع میں ہوتے ہیں۔ یہ حضرت ابنِ عباس رضؓ سے مروی ہے۔ اس قول کے متعلق یہ امور مدِ نظر رکھنا ضروری ہیں کہ حروفِ مقطعہ کلام تام یعنی اسمیہ اور فعلیہ جملے نہیں ہیں، یہ اسمائے موقوفہ ہیں اور اسی لیے ان پر اعراب نہیں لگائے گئے۔ کیونکہ اعراب عقدو ترکیب کے بعد لگائے جاتے ہیں۔ حروفِ مقطعہ کا تلفظ موقوف ہوتا ہے اور اسی طرح پڑھے جاتے ہیں جس طرح ا، ب، ت وغیرہ پڑھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وُہ بصورتِ اسماء نہیں، بلکہ بصورتِ حروف لکھے جاتے ہیں۔ ان کا تلفظ اسم کی طرح اور کتابت حروف کی طرح ہوتی ہے اسی لیے جب خلیل نے اپنے دوست سے پوچھا کہ زید کے حرف "ز" کا تلفظ کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا "زا" اُس نے کہا، آپ نے اس کا تلفظ کیا، حرف کا تلفظ "زہ" ہوتا ہے۔ سو یہ حروف بولنے میں اسماء ہیں اور لکھنے میں حروف مقطعہ ہیں۔

الٓمٓ، الف، لام، میم نہیں لکھا جائے گا، لیکن پڑھا اسی طرح جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر اعراب لگائے تو اس کے لیے ہر حرف کے عوض دس نیکیاں ہیں۔ مجھ سے پوچھو تو میں الٓمٓ کو حرف نہیں کہتا۔ لیکن الف، حرف ہے۔ لام حرف ہے اور میم حرف ہے۔ اور حرف رسولؐ و صحابہؓ کے لغت میں ان جمیع اقسام پر مشتمل ہے، جنھیں اہلِ نحو اسم، فعل اور حرف سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی لیے سیبویہ نے کلام کی تقسیم اسم و فعل میں کی اور حرف اس معنی میں آیا ہے کہ یہ نہ اسم ہے اور نہ فعل۔ چونکہ لغت میں مشہور تھا کہ اسم بھی حرف ہے۔

فعل بھی حرف ہے۔ اس لیے یہ تیسری قسم جسے اہلِ نحو حرف کہتے ہیں۔ اس معنی کے لیے مخصوص قرار دیتے گئے کہ وُہ نہ اسم ہے اور نہ فعل ۔ یہ حروفِ معانی ہیں جن سے کلام مرتب ہوتا ہے، اور حروفِ ہجا حرفِ مجرد کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ ان کا تلفظ غیر معرب ہوتا ہے۔ ان حروف کے متعلق معرب اور مبنی نہیں کہا جاتا، کیونکہ یہ مولف کے متعلق کہا جاتا ہے۔

جب اس قول کے مطابق ان کے سوا سب آیات محکم ہوئیں تو مقصود حاصل ہو گیا، کیونکہ مقصود صرف اللہ اور اس کے رسول کے کلام کو سمجھنا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ان حروف کے معنی کے متعلق اکثر لوگوں نے بحث کی ہے۔ سو اگر ان کا معنی معلوم ہے تو متشابہ کے معنی معلوم ہو گئے اور اگر نہ معلوم ہوا تو وُہ متشابہ رہا، لیکن اس کے ماسوا سب آیات و نصوص کے معنی معلوم ہیں۔ ہٰذا ہو المطلوب۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ	اس میں سے محکم آیات ہیں، اصل کتاب وہی ہیں اور دوسری متشابہات ہیں۔

اور جمہور علماء کے نزدیک یہ حروف آیات نہیں ہیں۔ صرف کوفی انہیں آیات میں شمار کرتے ہیں۔ اس آیت شریفہ کا سببِ نزول اس امر پر دال ہے کہ ان حروف کے علاوہ بھی متشابہات ہیں، لیکن یہ قول اس آیت کے موافق ہے جو یہود سے منقول ہے کہ حروفِ ہجا سے علم العدد کی جستجو کیا کرتے تھے۔

قولِ رابع یہ ہے کہ متشابہ وُہ ہے جس کے معنی مشتبہ ہوں۔ مجاہدؒ اس قول کے قائل ہیں۔ اکثر علماء بھی اس قول کے حامی ہیں اور وُہ سب اس متشابہ کی تفسیر

کرتے اور اس کے معنی بیان کرتے ہیں۔

پانچواں قول یہ ہے کہ متشابہ وہ ہے جس کے الفاظ بار بار آئیں، یہ قول عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ محکم وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔ مثلاً انبیاء کے قصے بیان فرماتے اور ان کی تفصیل و توضیح فرمائی اور متشابہ وہ ہے جس کے الفاظ ان قصوں کو دہراتے وقت مختلف ہو جائیں، مثلاً نوح علیہ السلام کے قصے میں ایک موقع پر فرمایا:

اِحْمِلْ فِيهَا۔	کشتی میں بٹھالو۔

اور دوسرے موقع پر فرمایا:

اُسْلُكْ فِيهَا۔	کشتی میں بٹھالو۔

موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے متعلق فرمایا:

فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى۔	ناگاہ یہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔

اور دوسرے موقع پر اسی کے متعلق فرمایا:

فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ۔	ناگاہ وہ ایک صریح اژدہا تھا۔

اس قول والے نے متشابہ اس امر کو قرار دیا ہے کہ معنی متفق ہوں اور الفاظ مختلف ہوں جیسا کہ حافظ قرآن پر ایک لفظ سے دوسرے لفظ کا اشتباہ واقع ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس متشابہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ ایک قصے کے معنی دو جگہوں میں متشابہ ہوتے ہیں۔ اس لیے پڑھنے والے کے لیے ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔ یہ تشابہ معرفت معانی کا منافی نہیں ہے۔ اس طرح کے تشابہ میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ صرف راسخین اس کا علم حاصل کر سکتے

سو اگر یہ قول صحیح ہو تو تمہارے لیے حجت ہے۔ اور اگر ضعیف ہو، تو ہمارے لیے باعثِ ضرر نہیں۔

چھٹا قول یہ ہے کہ متشابہ وُہ ہے جو محتاج بیان ہو، جیسا کہ امام احمدؒ سے منقول ہے۔

ساتواں قول یہ ہے کہ متشابہ وُہ ہے جس کی تاویل کی کئی وجہیں ہو سکیں، جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد سے منقول ہے، اور ابو درداء رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا، تجھے پوری سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآن تک کی تاویل کی کئی صورتیں ہیں۔ لوگوں نے وجوہ نظائر کے متعلق کتابیں تصنیف کی ہیں۔ نظائر لفظ وُہ ہیں جن کے معنی دو یا دو سے زیادہ مقامات پر متفق ہوں، وجوہ وُہ ہیں جن کے معنی مختلف ہوں اسماء متواطعہ و مشترکہ ان کی مثالیں ہیں، گو ان میں کچھ نہ کچھ فرق بھی ہو۔ اس کی تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔

بعض کا قول ہے کہ یہ نظائر فی اللفظ ہیں، اور ان کے معانی مختلف ہوتے ہیں۔ سو وُہ مشترک کی مانند ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے صحیح بات پہلی ہی ہے۔ سلف و خلف مسلمین نے وجوہ کے معانی بیان کیے ہیں اور انھوں نے مَا یَحْتَاجُ اِلَی الْبَیَانِ (جو محتاج بیان ہو) اور مَا یَحْتَمِلُ وُجُوْھًا (جس کی تاویل کی کئی صورتیں ہو سکیں) کی بھی تشریح کی ہے اور قطعی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ علماء سارے قرآن کے معانی معلوم کر سکتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرآن کریم کا کچھ حصّہ ایسا بھی ہے جس کے معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ وُہ شخص کتاب و سنت اور اجماعِ امت کی مخالفت کر رہا ہے۔

آٹھواں قول یہ ہے کہ متشابہ قصص و امثال کا نام ہے اور ان کے معانی بھی معلوم ہوتے ہیں۔

نواں قول یہ ہے کہ متشابہ وُہ ہے جس پر ایمان لایا جائے اور عمل نہ کیا جائے اور اس کے معنی بھی معلوم ہیں۔

دسواں قول یہ ہے کہ متشابہ آیاتِ صفات و احادیثِ صفات ہیں اور اُن کے معنی بھی معلوم ہیں، کیونکہ اکثر آیات صفات کے متعلق مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان کے معنی معلوم ہیں۔ یہ آخری قول بعض متاخرین کا ہے۔

بعض امور ایسے ہیں جن کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ سلف نے ان میں سے جہمیہ کی تاویلات کو مذموم قرار دیا اور اعلان کر دیا ہے کہ لوگوں کو ان امور کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی، چنانچہ امام مالکؒ نے فرمایا "استوا معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے"۔ امت کے تمام ائمہؒ نے یہی کہا ہے۔ سو معنی معلوم اور کیف مجہول میں فرق ہے، اگر کیف کا نام تاویل ہو تو ایسی تاویل کے متعلق یہ کہنا جائز ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے ذکر کر چکے ہیں، لیکن اگر معنی معلوم کرنے اور تفسیر کرنا تاویل قرار دی جائے تو اس تاویل کو ما سوی اللہ پر ممنوع قرار دینا جائز نہیں ہے۔

کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت جبریلؑ، صحابہ کرام اور تابعین حسب ذیل آیات کے معنی نہیں سمجھتے تھے۔

۱۔ الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔	رحمٰن عرش پر مستوی ہوا۔
۲۔ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔	تجھے اس ہستی کے آگے سجدہ کرنے سے کیا بات مانع ہوئی، جسے میں نے اپنے

	ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔
غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِم۔	اللہ تعالیٰ ان پر غصے ہوا۔

ان لوگوں کے نزدیک یہ آیت بمنزلہ کلام عجمی ہے، اور عربی تو اسے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح :

۴۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ۔	اور انھوں نے خدا کی کما حقہ قدر نہیں کی اور زمین ساری کی ساری قیامت کے دن اس کے قبضے میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔
۵۔ لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ۔	اسے آنکھیں نہیں پا سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ لیتا ہے۔
۶۔ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔	اور وہ سمیع و بصیر ہے۔
۷۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ	خدا اُن سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔
۸۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ۔	یہ اس لیے ہوا کہ انھوں نے ان باتوں کا اتباع کیا جن سے خدا ناراض ہوتا ہے اور اس کی خوشنودی اُن کو پسند نہ تھی۔
۹۔ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔	نیکی کرو، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
۱۰۔ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ	اور اُن سے کہو کہ عمل کرو، اللہ تعالیٰ،

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔	رسول اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھیں گے۔
اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا۔	ہم نے اسے عربی قرآن بنایا۔
۱۲- فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ۔	اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ کلامِ خدا سُن لے۔
۱۳- فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا۔	جب موسیٰ علیہ السلام اُس آگ کے پاس آئے تو آواز آئی کہ وہ ذات مبارک ہے جو اس نورانی آگ میں ہے اور جو اس آگ کے ارد گرد ہے۔
۱۴- هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	انکو تو اسی بات کا انتظار ہے کہ اللہ تعالےٰ بادلوں کا چھتر لگائے فرشتوں کو ساتھ لیے ہوئے ان کے سامنے آموجود ہو۔
۱۵- وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔	اور تیرا پروردگار صف بہ صف فرشتو کو ساتھ لے کر آئے گا۔
۱۶- هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ۔	وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اُن کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا پروردگار آئے یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آئیں۔
۱۷- ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ۔	پھر وہ آسمان کی طرف مستوی ہوا، اور وہ دھواں تھا۔
۱۸- اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا	اس کا کام یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا

اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ | ارادہ کرتا ہے، تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا، تو وُہ ہو جاتی ہے۔

ان آیات اور ان کی طرح کی دوسری آیات کے متعلق یہ کہنا کہ حضرت جبریل علیہ السلام، حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام علیہم الرضوان، تابعین، ائمہ مسلمین اور اجماعِ امت سے ان کے معنی پوشیدہ ہیں۔ اور جس طرح قیامت کا وقت صرف خدا کو معلوم ہے، اسی طرح یہ بھی اس کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اور جمیع مسلمین اور رسول و صحابہ کے متعلق یہ کہنا کہ وُہ ان الفاظ کو پڑھتے تھے لیکن ان کے معانی نہیں سمجھتے تھے، ساری امت پر جھوٹ باندھنا ہے۔ نقولِ روایاتِ متواترہ اس کے خلاف ہیں۔ یہ لوگ ان آیات کو بھی اسی طرح سمجھتے تھے جس طرح باقی سارے قرآن کو سمجھتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ کنہ باری تعالیٰ تک بندوں کی رسائی نہیں اور اُس کی صفات و محامد کا حساب و شمار ان کی طاقت سے باہر ہے، لیکن یہ امر اُس کا مانع نہیں ہے، کہ وُہ ربّ عزوجل کے ان اسماء و صفات سے واقف ہوں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خود انھیں سکھاتے ہیں، اسی طرح وُہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز سے واقف اور ہر بات پر قادر ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کی کیفیت بھی معلوم ہو اور وُہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احق اور موجود ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ وُہ ذاتِ باری تعالیٰ کی کیفیت سے بھی آگاہ ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ راسخین تاویل جانتے ہیں، اس بات پر سارے لوگ متفق ہیں کہ راسخین محکم کی تاویل جانتے ہیں اور یہ مسلّم ہے کہ آیات محکمات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق جو خبر دی ہے اُس کی کیفیت نہیں جانتے۔ اس سے

معلوم ہوا کہ کیفیت نہ جاننے سے علم تاویل کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ تاویل کلام کی تفسیر اور اس کے معانی کے بیان کا نام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ راسخین محکم و متشابہ دونوں کی تاویل جانتے ہیں، لیکن پروردگار کی کیفیت خواہ وہ محکم میں ہو، یا متشابہ میں، بالکل نہیں جانتے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس تاویل میں جس کے معنی تفسیر ہیں اور اس تاویل میں جو کتاب اللہ میں ہے، فرق ہے اور اب تاویل کو تفسیر کلام اور اس کے معنی کے بیان کا مرادف قرار دیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ لفظ کی تفسیر اور معنی معلوم کرنا اور قلب میں اس کا تصور کرنا اور چیز ہے اور اس کلام سے جو حقیقت موجودہ فی الخارج مراد ہے، اس کا جاننا اور چیز ہے۔

ہر ایک چیز کے چار وجود(۴)

ہر ایک چیز کا ایک وجود اعیان میں، ایک اذہان میں، ایک زبان میں اور ایک بیان میں ہوتا ہے۔ کلام ایک لفظ ہوتا ہے جس کے معنی قلب میں متصور ہوتے ہیں اور وہ خط کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ جب کلام معلوم ہو جائے، اس کا معنی قلب میں متصور ہو جائے اور زبان اس کی تعبیر بھی کر دے۔ جب بھی وہ حقیقت مستور رہتی ہے جو خارج میں موجود ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ جو شخص اول الذکر سے واقف ہو اسے ثانی الذکر بھی بعینہ معلوم ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ اہل کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت و نعت اور خبر جانتے ہیں جو اُن کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہی کلام اور اس کے معنی کا جاننا ہے اور اس کی تاویل خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنجاتِ بعثت ہیں سو اُن کو بعینہ پہنچانا اس کلام کی تاویل جاننا ہے۔ بعض انسانوں کو جج

اور مشاعرِ حج مثلاً بیت اللہ، مساجد، منیٰ، عرفہ اور مزدلفہ کا علم ہوتا ہے اور اس کے معنی سمجھتے ہیں، لیکن مقامات کو جب تک دیکھ نہ لیں، نہیں پہچانتے۔ دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ کعبہ جو کہ زیرِ مشاہدہ ہے، اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے قول:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ۔ | لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ حق ہے کہ وُہ اس گھر کا قصد کریں۔

اس طرح بعد از مشاہدہ ارضِ عرفات بھی معلوم ہو جاتی ہے، جس کا ذکر:

فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ۔ | سو جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔

میں ہے، اسی طرح مشعر الحرام کی بھی پہچان ہو جاتی ہے کہ وُہ زمین عرفہ و وادیٔ محشر کے درمیان واقع ہے۔ یہ مزدلفہ کے نام سے مشہور ہے۔ مشاہدہ کرنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ وہی مشعرِ حرام ہے جو اس آیت میں مذکور ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ | اللہ تعالیٰ کو مشعر الحرام یعنی مزدلفہ کے پاس یاد کرو۔

انسان خواب دیکھتا ہے، عابر اُسے اُس کی تاویل بتاتا ہے تو وُہ اُسے سمجھ لیتا ہے اور اس کا تصور کر لیتا ہے، عابر کہتا ہے کہ خواب کی فلاں فلاں بات اس امر پر دال ہے کہ یُوں ہوا اور یوں ہوگا اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو وُہ اس خواب کی تاویل ہوتا ہے، اس کا علم، اس کا تصور یا اس کا کلام خواب کی تاویل نہیں ہوتا۔ اس لیے یوسف صدیق علیہ الصّلاۃ والسلام نے فرمایا:

هٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِنْ قَبْلُ۔ | مجھے جو پہلے خواب آیا تھا، اس کی تاویل یہ ہے۔

اور فرمایا:

لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا۔

جو کھانا تمہیں کھلایا جاتا ہے، وُہ ابھی تمہارے پاس نہ آنے گا کہ میں تم دونوں کو اس کی تاویل اس سے پیشتر تمہیں بتا دوں گا کہ وُہ تاویل تمہارے پاس آئے۔

یوسف علیہ السلام نے تاویل آنے سے پہلے ان دونوں کو اُن کے خواب کی تاویل بتا دی، اگرچہ تاویل بعد میں واقع ہی نہ ہوئی ہو، اور اگرچہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ تاویل کب واقع ہو گی۔

سو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو وعدو وعید ذکر فرماتے ہیں، ان کی تاویل ہم جانتے ہیں، اگرچہ ہمیں یہ معلوم نہیں، کہ وُہ تاویل کب واقع ہو گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ظاہر ہے:

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ۔ الخ۔ الآیۃ۔

کیا اس کی تاویل کا انتظار کرتے ہیں جس دن اس کی تاویل آگئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ۔

ہر ایک خبر کا مستقر ہوتا ہے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی خبر کا مستقر معلوم ہے اور وُہ حقیقت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وُہ کب ہو گی اور اس کی مقدار و کیفیت کیا ہے؟ اس میں محکم و متشابہ کی تاویل دونوں برابر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔	اے پیغمبرؐ! اُن سے کہہ دو کہ وُہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں گروہ گروہ بنا دے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں تمہیں پٹوائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات ہونے والی ہے، اس کی تاویل ابھی نہیں آئی، حالانکہ اس کی تاویل معلوم ہے یعنی اختلاف و فتن واقع ہوں گے۔ گو معلوم نہیں کہ کب واقع ہوں گے اور ان کی صفت و حقیقت کیا ہو گی؟ جب وُہ "اویل" واقع ہوگی تو لوگ پہچان لیں گے کہ یہ وہی تاویل ہے جس پر آیت نے دلالت کی، کبھی معلوم نہیں بھی ہوتی، یا انسان جاننے کے بعد اسے بھول جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ یہ واقعہ قرآن کی تاویل ہے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔	اس فتنے سے بچو جو تم میں سے ظالم لوگوں ہی کے لیے مخصوص نہ ہوگا۔

تو حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ "کچھ مدت تک ہم یہ آیت پڑھتے رہے اور نہ معلوم کر سکے کہ اس آیت کا اہل کون ہے؟ اب معلوم ہوا کہ اس سے ہم مراد ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس شخص کی مذمت کی ہے جو قرآن سنتا ہے اور اس کے معنی نہیں سمجھتا اور اس پر تدبر نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مدح کی ہے جو اسے سنتا اور سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ	ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تیری باتیں سنتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وُہ تیرے

قَالُوا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا۔ | پاس چلے جاتے ہیں، اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے اُن سے پوچھتے ہیں کہ رسول ؐ نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ یہ لوگ اہلِ علم سے پوچھا کرتے تھے۔ رسول اللہ نے اس وقت کیا کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ میں سے اہلِ علم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کلام کے معانی بھی معلوم تھے جس سے دوسرے لوگ ناواقف تھے۔ اور وہی راسخین فی العلم تھے اور قرآن کے محکمات و متشابہات کے معانی جانتے تھے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔ | اور ہم لوگوں کے لیے یہ مثالیں بیان کرتے ہیں، اور انہیں صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ گو غیر عالم نہ سمجھیں لیکن عالم ان کے معنی سمجھتے ہیں اور مثالیں وُہ متشابہات ہیں جن کے ذریعہ تمثیل بیان کی جاتی اور جن کے معنی سمجھے جاتے ہیں، اور معنی سمجھنے سے مراد وُہ تاویل معلوم کرنا ہے جسے راسخین فی العلم جانتے ہیں اور ان کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مانند ہے:

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ | اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وُہ جانتے ہیں کہ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف جو کچھ نازل ہوا ہے وُہ حق ہے اور عزیز و حمید کی راہ دکھاتا ہے۔

سو اگر وُہ منزلات سماوی کے معنی نہ سمجھتے تو وُہ کیونکر سمجھ سکتے تھے کہ آیا حق ہے یا باطل۔ کیا ایسے کلام پر جس کے معنی متصور نہ ہوں، یہ کلمہ لگایا جا سکتا

ہے کہ وُہ حق ہے یا باطل؛ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا۔

کیا وُہ قرآن کریم پر غور نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

اور فرمایا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔

کیا وُہ قرآن پر غور و تدبّر نہیں کرتے اور اگر وُہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وُہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُم مَّا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ۔

کیا انھوں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا یا ان کی نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ایسی چیز آگئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ۔

میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو میرے کلام کو سن لیتے ہیں اور اس میں سے اچھی اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا۔

اور وُہ لوگ کہ جب انہیں ان کے پروردگار کی آیات سمجھائی جائیں تو وُہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہ گریں۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔

ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا تاکہ تم سمجھو۔

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ	یہ کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں اور جن کی تفصیل خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے کی گئی ہے۔
كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ الخ۔	ایسی کتاب کہ اس کی آیات تفصیل شدہ ہیں ان لوگوں کے لیے عربی قرآن ہے، جو جانتے ہیں اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔ الآخر الآیۃ۔

سو ان میں سے اکثر نے رُوگردانی کی اور سنتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردے ہیں، جس بات کی طرف ہمیں دعوت دیتا ہے، وُہ ہمارے دلوں پر اثر ہی نہیں کرتی۔ ہمارے کانوں میں گرانی ہے۔ ہمارے اور تیرے درمیان حجاب ہے تو اپنا کام کیے جا، ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

سو اگر قرآن کا کثیر یا اکثر جزو ایسا ہو کہ کوئی اس کا معنی نہ سمجھ سکے تو اس کا ایک حصّہ ہی سمجھا جائے گا۔ اور اس پر تدبّر ہو سکے گا اور یہ علی الخصوص مدلول قرآنی کے خلاف ہے۔

قرآن کریم پر تدبر کرنے کی تاکید!

مشرک عموماً آیاتِ خبریہ سے انکار کرتے تھے جو یومِ آخرت، جنت اور دوزخ کی اطلاعات پر مشتمل ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ کی شان سے شرکاء اور اولاد کی نفی کی گئی ہے، اور ذاتِ باری تعالیٰ کا نام "الرحمٰن" مذکور ہے۔ انہوں نے عام طور پر قرآن کے ایسے حصے کا انکار کیا ہے جس میں نفیاً و اثباتاً اللہ تعالےٰ نے ان آیات کو نہ سمجھنے والے اور ان پر تدبر و تفقہ نہ کرنے والے شخص کی مذمت کی ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس کو سمجھنے اور اس پر غور و تدبر کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوا لَا يَعْقِلُونَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ إِلَيْكَ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا لَا يُبْصِرُونَ۔

ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ تمہاری باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں، کیا اس سے تمہیں خیال ہونے لگا کہ وہ ایمان لانا چاہتے ہیں، کیا تم بہروں کو باتیں سناتے ہو، خواہ وہ سمجھتے بھی نہ ہوں اور ان میں سے بعض تمہاری طرف دیکھتے ہیں اس دیکھنے سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ ایمان لاتے ہیں، کیا تم اندھوں کو راستہ دکھاؤ گے گو انھیں کچھ بھی نہ سوجھ پڑتا ہو۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔

ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری باتوں کی طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیے جس سے وہ سمجھ نہیں سکتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا۔

اور جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، گاڑھا پردہ حائل کر دیتے ہیں، ان کے دلوں پر غلاف ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی سی پیدا کر دیتے ہیں۔

بعض لوگوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سوا دوسروں کے لیے صرف اسی چیز کا علم ممنوع قرار دیتا ہے جو اسی کے ساتھ خاص ہو۔ چنانچہ فرمایا :

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔	اے پیغمبر! ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی غیب نہیں جانتا۔
لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ۔	وہی اسے اس کے مقررہ وقت پر لا دکھائے گا۔
وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ۔	اور تمہارے پروردگار کے لشکر کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ حقیقت امر یوں نہیں، بلکہ یہ اس چیز کے علم کے مطابق ہوتا ہے جس کی نفی کی گئی ہو۔ جن چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر دیا ہے ان کے متعلق یہی کہا جائے گا، لیکن جو باتیں اپنے بعض بندوں کو سکھا دیتا ہے۔ ان کے متعلق حسب ذیل آیات مذکور ہیں :

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔	اس کے علم میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔
عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۔	وہ غیب جاننے والا ہے وہ اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر اپنے برگزیدہ پیغمبروں پر کچھ باتیں ظاہر کرتا ہے لیکن وہ بھی اس احتیاط سے کہ اس کے سامنے اور اس کے پیچھے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ۔

کہو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ، اور جن کے پاس آسمانی کتابوں کا علم ہے کافی گواہ ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔

اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور اہل علم بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کے ساتھ قائم ہے۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ

لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا ہے وہ اس نے اپنے علم سے تمہیں اس کا اہل سمجھ کر نازل کیا ہے!

اور ملائکہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں اور یوں تو شہادت کو ایک اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ۔

کہو کہ ان کی صحیح گنتی صرف میرے پروردگار کو اچھی طرح معلوم ہے اور بہت تھوڑے لوگ اسے جانتے ہیں۔

فرشتوں سے فرمایا:

اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

جو کچھ تمہیں معلوم نہیں ہے، مجھے معلوم ہے۔

اور فرشتوں نے کہا:

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

ہمیں صرف اتنا علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھایا ہے۔

کلام صحابہؓ میں "اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ" (اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اچھی طرح جانتے ہیں) بہت آتا ہے اور مشہور حدیث میں حسب ذیل عبارت آئی ہے:

"اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ ھُوَلَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْعَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ"۔

(میں تجھ سے تیرے ہر نام کے طفیل سوال کرتا ہوں جس سے تو نے اپنے آپ کو موسوم فرمایا اور جو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا، یا اپنے بندوں میں سے کسی کو سکھایا یا تو نے علم غیب میں اپنے پاس محفوظ رکھا) اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔	سو اگر تم کسی بات میں باہم اختلاف و نزاع کرنے لگو تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔

پہلا نزاع معانی قرآن کا نزاع ہے اور اگر خود رسول ان معانی سے آگاہ نہ ہوتے تو اُن کی طرف اس نزاع کا لوٹانا ممتنع ہوتا۔ اور صحابہ و تابعین اور جمیع ائمہ دین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سنت درحقیقت قرآن کی تفسیر و تبیین ہے، وُہ معانی و حقائقِ قرآن کو آئینہ کرتی ہے۔ اس کے اجمال کا صحیح مفہوم بتاتی ہے اور مختصر اخبار و احکام کی تشریح و توضیح کرتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَہُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ۔	لوگ ایک جماعت تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی تاکہ وُہ لوگوں کے باہمی اختلاف میں فیصلہ کیا کرے۔

اور سب سے بڑا اختلاف وُہ ہے جو ان مسائل علمیہ خبریہ میں واقع ہو جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کے متعلق ہوں، اس کے متعلق جب لوگوں کے مابین اختلاف پیدا ہو تو کتاب کا حاکم بننا لابدی ہے، لیکن اگر اس کے معنی معلوم نہ ہوسکیں تو اس کا حاکم بننا ممتنع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر دلیل نصب کی ہے، اگر اس کے معنی معلوم نہ ہوسکیں تو اسا دلیل نہیں بن سکتی جو حاکم اپنے دل کی بات بیان نہ کرے وُہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جب کہا جائے کہ فلاں شخص حاکم بالکتاب ہے تو اس کا حکم ناطق ہوتا ہے، اور اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ اور یہ بیان ہی سے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق فرمایا ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ	وُہ فیصلہ کرنے والا کلام ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہوتا ہے سو جب اس کے معنی ہی معلوم کرنے کی کوئی سبیل نہ ہو تو وُہ فیصل کیونکر ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔	اور اُن میں سے امی لوگ ہیں وُہ قرآن میں سے کچھ نہیں جانتے، صرف منہ سے بڑبڑا لینا جانتے ہیں اور ظن سے کام لیتے ہیں۔

سو اللہ تعالیٰ نے جس طرح محرفین و مکذبین کی مذمت کی ہے، اسی طرح ان لوگوں کی بھی مذمت کی ہے، اسی طرح اُن لوگوں کی بھی مذمت کی ہے جو کتاب نہیں جانتے اور صرف اپنی خواہش کے مطابق تفسیر گھڑ لیتے ہیں۔ فرمایا:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ	کیا تم اس بات کی طمع رکھتے ہو کہ وُہ تمہاری بات مانیں حالانکہ ان میں ایک فریق ہے جو

كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے اور پھر سمجھنے کے بعد اس کی تحریف ڈالتا ہے حالانکہ وُہ جانتا ہے، آخر الآیۃ۔

اور جب وُہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور پھر جب ایک دُوسرے کے ساتھ تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں، جو کچھ تورات میں اللہ تعالیٰ نے تم پر منکشف کیا ہے، کیا وُہ مسلمانوں پر ظاہر کرتے ہو کہ وُہ کل کو تمہارے پروردگار کے سامنے اس کی سند پکڑ کر جھگڑا کریں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟

یہ ایک قسم ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا : وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ الخ۔ الآیۃ۔

اس آیت میں دُوسری قسم کے لوگ مذکور ہیں۔ جو آیات کو زبانی بڑبڑا لینے کے سوا علم کتاب سے مطلقاً بہرہ یاب نہیں اور خیالی تُکّے چلاتے ہیں۔ اَمَانِیَّ سے مراد تلاوت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک تیسری قوم کی مذمت کی ہے۔ یہ قوم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں آیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ وُہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتی۔ سو فرمایا :

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔

ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ وُہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اسے تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالیں، سو اُن کے ہاتھوں کا لکھا اور اُن کے ہاتھوں کا کمایا ہی اُن کے لیے باعثِ وبال ہوگا۔

یہ تین قسمیں جمیع اہلِ بدع و ضلال پر حاوی ہیں۔ اہلِ بدعت جن کی اللہ او

اس کے رسولؐ نے مذمت فرمائی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وُہ ہوتے ہیں جو سچی بات کے عالم ہوتے ہیں اور عمدًا اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ دوسرے جاہل ہوتے ہیں اور دوسروں کا اتباع کرتے ہیں۔ اول الذکر کتاب اللہ کے خلاف کوئی بات گھڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں وُہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا جھوٹی حدیثیں بنا لیتے ہیں یا نصوص کی باطل تفسیر و تاویل کرتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ عقل ورائے اُس کے مؤیّد ہیں۔ اس سے ان لوگوں کا مقصد جاہ پسندی اور زراندوزی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کتاب اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں تاکہ اُس کو تھوڑے مول بیچ ڈالیں۔ سو وُہ اُن کے مکتوباتِ باطلہ کے ذریعہ حاصل کیا ہوا زرومال ہی ان کے لیے باعثِ ہلاک و وبال ہے۔ جب نصوص کتبِ الٰہیہ اور اُن کے اقوال باہم معارض ہو جائیں تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ یہ آیات و نصوص تمہارے خلاف ہیں، تو وُہ تاویلاتِ فاسدہ کے ذریعہ کلمات کو اپنی جگہ سے بدل ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔	کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات مان جائیں گے، حالانکہ ان میں ایک ایسا فریق بھی ہے جو اللہ کا کلام سنتا ہے اور پھر سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر تحریف کر ڈالتا ہے۔

دوسری قسم ان جہال کی ہے جو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے، کتاب کا صرف منہ سے بڑبڑا لینا جانتے ہیں اور خیالی تکّے چلایا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس و قتادہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُمّیُّون سے مراد وُہ لوگ ہیں جو کتاب کے معانی نہیں جانتے بلکہ فہم کے بغیر اُسے حفظ کر لیتے ہیں

اور زبان سے پڑھتے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کتاب میں کیا ہے اِلَّآ اَمَانِیَّ سے مراد تلاوت ہے، یعنی یہ کہ وُہ فقط کتاب سے بے بہرہ ہیں اور تلاوت سننے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

کسائی، زجاج اور ابنِ سائب نے کہا ہے کہ "وُہ نہ تو قرآن کو عمدگی سے پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں، صرف اس قدر جانتے ہیں، جتنا اُن کے علماء اُن سے کہہ دیں۔" ابو روق اور عبیدہ فرماتے ہیں کہ اَمَانِیَّ سے مراد وُہ تلاوت و قرآۃ ہے جو ظہرِ قلب سے ادا کی جائے اور کتابوں میں نہ پڑھی جائے"۔

موخر الذکر قول میں اَمَانِیَّ سے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی مراد لی گئی ہے اور اول الذکر میں تلاوتِ علماء کا سننا مراد لیا گیا ہے۔ دونوں قول حق ہیں اور آیت ان دونوں کے لیے عام ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتَابَ (کتاب نہیں جانتے) فرمایا ہے۔ لَا یَقْرَءُوْنَ (نہیں پڑھتے) اور لَا یَسْمَعُوْنَ (نہیں سنتے) نہیں فرمایا۔ پھر فرمایا، اِلَّآ اَمَانِیَّ۔ اور یہ استثنا منقطع ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی یہ ہیں۔ لیکن وُہ خود پڑھ کر یا دُوسروں کی قرآۃ سُن کر اَمَانِیَّ کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر اسے استثنائے متصل قرار دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ "یہ لوگ علمِ امانی کے سوا کتاب کا کوئی علم نہیں رکھتے" یعنی یہ کہ وُہ فقط تلاوت کا علم رکھتے ہیں۔ فہم سے بہرہ یاب نہیں ہیں، "امانی" امنیہ کی جمع ہے اور اس کے معنی تلاوت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ	اور ہم نے تم سے پہلے جب کبھی کوئی رسول اور کوئی نبی بھیجا اور اُس نے آیات پڑھیں تو شیطان نے اس کی تلاوت میں القا کیا ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ القائے شیطان

اللّٰهُ اٰیَاتِہٖ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ۔ | کو منسوخ کر دیتا اور اس کے بعد اپنی آیات کو محکم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے!

شاعر کہتا ہے :

تَمَنّٰی کِتَابَ اللّٰہِ اَوَّلَ لَیْلَۃٍ

وَاٰخِرَھَا لَاقٰی حِمَامَ الْمَقَادِرِ

ترجمہ :- رات کے پہلے حصے میں وُہ کتاب اللہ پڑھتا رہا اور رات کے آخری حصے میں جاں بحق ہو گیا۔

لفظ اُمّی کی تشریح | اُمِّیُّوْنَ امت سے منسوب ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی نسبت امّت اور مَا عَلَیْہِ الْعَامَّۃُ کی طرف ہے۔ امّی سے مراد عامی ہے، جسے کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ زجاج کہتے ہیں کہ امی وُہ ہے جو امت (قوم) کی روش پر ہو، تعلیم و تعلم میں اسے کوئی دخل نہ ہو۔ اور اپنی جبلت پر قائم ہو۔" بعض دوسرے لوگوں کا یہ قول ہے: کہ امّی کی نسبت امّت کی طرف اس لیے ہے کہ کتابت مردوں ہی میں تھی۔ عورتوں میں نہیں تھی۔ اور امی وُہ شخص ہوتا ہے جو اسی حالت میں ہو جس حالت میں اُس کی ماں نے اسے جنا۔

صحیح بات یہ ہے کہ اُمّی، امت کی طرف اس طرح منسوب ہے جس طرح عامی، عامہ کی طرف ہے۔ جس طرح عامی آدمی خواص کی طرح عامۃ الناس میں سے کسی لحاظ سے ممتاز نہیں ہوتا، اسی طرح اُمّی باقی امّت سے ممتاز نہیں ہوتا، کیونکہ وُہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ بعض کہتے ہیں کہ اُمّی وُہ ہے جو خط لکھ پڑھ نہ سکے۔ بعض کہتے ہیں کہ اُمّی وُہ لوگ ہیں جن کے پاس خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب کوئی نہ ہو جسے وُہ پڑھیں یا لکھیں خواہ غیر منزل کتابیں لکھتے پڑھتے ہوں، اس معنی میں

سارے عرب اُمّی تھے کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نازل شدہ کتاب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔

جو لوگ کتاب دیے گئے ہیں اور جو لوگ اُمّی ہیں، ان سے کہو کہ آیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟ اگر اسلام قبول کر لیں تو ہدایت پا جائیں گے۔

پھر فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔

اللہ تعالیٰ وُہ ہے جس نے امّیین میں انہی سے ایک رسُول مبعوث فرمایا۔

اہلِ عرب میں بہت سے لوگ مکتوب لکھ پڑھ سکتے ہیں، حالانکہ وُہ سب اُمّی تھے، جب اُن پر قرآن کریم نازل ہوا تو وُہ اس اعتبار سے امّی نہ رہے کہ وُہ کسی کتاب کو اپنے حفظ سے نہیں پڑھ سکتے تھے، بلکہ وُہ قرآن پڑھتے تھے۔ اور اناجیل ان کے سینوں میں تھیں لیکن وُہ اس اعتبار سے اُمّی رہے کہ وُہ اپنے دین کی کتابت کے محتاج نہیں تھے۔ بلکہ قرآن اُن کے دلوں میں محفوظ ہو گیا چنانچہ "صحیح" میں عیاض بن حمار المجاشعی کی روایت سے یہ حدیث آئی ہے: "عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ خَلَقْتُ عِبَادِيْ حُنَفَاءَ وَقَالَ فِيْهِ اِنِّيْ مُبْتَلِيْكَ وَمُبْتَلٍ بِكَ وَاَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَابًا لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ تَقْرَاُهٗ نَائِمًا وَيَقْظَانًا"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا اور اسی کے متعلق فرمایا، میں تیرا اور تیرے ذریعے

سے باقی لوگوں کا امتحان لینے والا ہوں، میں نے تجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے جسے پانی دھو نہیں سکتا، تم اسے جاگتے سوتے ہر وقت پڑھتے رہتے ہو۔

سو ہماری امت اہل کتاب کی طرح نہیں ہے جنھیں اپنی کتابیں دلوں میں یاد نہیں تھیں بلکہ اگر مصاحف معدوم ہوجائیں تو قرآن کریم امت کے قلوب میں محفوظ رہے گا، اس اعتبار سے مسلمان نزولِ قرآن اور اس کے حفظ کے بعد اُمّی قوم ہیں، چنانچہ "صحیح" میں بروایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک منقول ہے کہ اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَا نَحْسِبُ وَلَا نَكْتُبُ الشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا ۔" (ہم امی قوم ہیں، ہم مہینے کا حساب کتاب فلاں فلاں طریق پر نہیں کرتے) آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم کتاب نہیں پڑھتے اور حفظ نہیں کرتے بلکہ فرمایا ہم لکھتے نہیں اور حساب نہیں کرتے۔

سو ہمارا دین لکھنے اور حساب کرنے کا محتاج نہیں ہے، جیسا کہ اہل کتاب کا دین ہے۔ اور اپنے روزے اور فطر کے اوقات کو حساب وکتاب سے معلوم کرتے ہیں، اور ان کا دین کتابوں پر منحصر ہے۔ اگر کتابیں معدوم ہو جائیں تو وہ اپنے دین کو پہچان نہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت قرآن وحدیث کو اہلِ بدعت کی نسبت زیادہ حفظ کرتے دیکھے گئے ہیں، اور اہل کتاب میں بعض وجوہ سے مشابہت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ ۔	اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ۔

آنحضرت صلعم اسی اعتبار سے اُمّی ہیں کہ وہ نہ لکھتے اور نہ کتابیں پڑھتے تھے، اس اعتبار سے نہیں کہ وہ حفظ نہیں پڑھتے تھے، بلکہ وہ قرآن کریم اپنے حفظ سے نہایت اچھا پڑھتے تھے۔

اُمّی کے معنی فقہاء کی اصطلاح میں!

اصطلاحِ فقہاء میں اُمّی، قاری کا خلاف ہے، نہ کہ معنی اول کے مطابق کاتب کا خلاف، اور وُہ اکثر اس سے وُہ شخص مراد لیتے ہیں جو فاتحہ اچھی طرح نہ کرسکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ۔	اور ان میں سے امی ہیں جو سوائے تلاوت کے کتاب کا اور کچھ نہیں جانتے۔

یعنی وُہ کتاب سے صرف تلاوت جانتے ہیں، اس کا معنی نہیں سمجھے اور یہ معنی اس شخص پر بھی حاوی ہیں جو اپنی طرف سے اچھی طرح لکھ پڑھ نہ سکے اور وُہ سن کر امانی کا علم حاصل کرتا ہے۔ ابن السائبؒ کا قول یہی ہے۔ اس تعریف میں وُہ شخص بھی داخل ہے جو ظہرِ قلب سے قرآن پڑھے اور کتاب سے نہ پڑھے۔ الوروق اور عبیدہ کا قول اسی طرح ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ میں کتاب سے مراد خط ہے۔ یعنی یہ کہ وُہ خط اچھا نہیں لکھ سکتے۔ تلاوت اچھی کرتے ہیں۔ نیز یہ تعریف اس شخص پر صادق آتی ہے جو خط اچھا لکھتا ہے۔ لیکن جو کچھ پڑھتا یا لکھتا ہے اُسے سمجھتا نہیں، چنانچہ حضرت ابنِ عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

غَيْرُ عَارِفِينَ مَعَانِي الْكِتَابِ يَعْلَمُونَهَا حِفْظًا وَقِرَاءَةً بِلَا فَهْمٍ وَلَا يَدْرُونَ مَا فِيهِ (کتاب کے معانی نہ جاننے والے حفظ و قراۃ کے لحاظ سے تو وُہ کتاب کو جانتے ہیں لیکن اس کے مضمون کی فہم و درایت سے معرا ہیں)

کتاب سے مراد کتاب منزل من اللہ یعنی تورات ہے، اس سے مراد خط نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ۔ | وُہ صرف خیالی تکے چلاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے علمِ معانی کتاب کی نفی فرمائی ہے ورنہ کسی شخص کا اپنے ہاتھ سے لکھ نہ سکنا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کے پاس علم بھی ہو، بلکہ وُہ صرف ظن سے کام لیتا ہو، بلکہ بہت سے آدمی اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں، اُسے نہیں سمجھتے، اور بہت سے لوگ لکھتے نہیں، لیکن وُہ عالم ہوتے ہیں، جو بات دوسرے لکھتے ہیں وہ انہیں معلوم ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر مذمت کے سیاق میں کیا ہے، حالانکہ جب کوئی شخص اپنا فرض ادا کر دے محض خط نہ لکھ سکنے سے مذموم قرار نہیں دیا جا سکتا، اُن کی مذمت کی وجہ یہ ہے کہ وُہ اس کتاب کو سمجھتے نہیں جو اُن کی طرف نازل ہوئی ہے۔ اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا کہ انھوں نے اس کتاب کو لکھا پڑھا تھا یا نہیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

هٰذَا أَوَانُ يُرْفَعُ الْعِلْمُ فَقَالَ لَهُ زِيَادُ بْنُ لَبِيدٍ كَيْفَ يُرْفَعُ الْعِلْمُ وَقَدْ قَرَأْنَا الْقُرْآنَ فَوَاللّٰهِ لَنَقْرَأَنَّهُ وَلَنُقْرِئَنَّهُ نِسَاءَنَا فَقَالَ لَهُ إِنْ كُنْتُ لَأَحْسِبُكَ مِنْ أَفْقَهِ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ أَوَلَيْسَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ عِنْدَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصٰرٰى فَمَاذَا تُغْنِيْ عَنْهُمْ۔ وقت آگیا کہ علم اٹھا لیا جائے گا۔ زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، علم کیونکر اٹھا لیا جائے گا؟ حالانکہ ہم قرآن پڑھ چکے ہیں اور خدا کی قسم ہم اسے خود پڑھا کریں گے اور اپنی عورتوں کو پڑھایا کریں گے۔ آنحضرت صلعم نے اُن سے فرمایا، میں تو تمہیں اہلِ مدینہ میں سب سے زیادہ فہیم وفقیہ سمجھتا تھا، تم نے یہ بات کہہ دی؟ کیا یہود ونصاریٰ کے پاس تورات وانجیل نہیں ہیں، اُن کو ان سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ یہ معروف

حدیث ہے۔ اور اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔

اور اُن میں سے ایک جماعت ہے جو کلام اللہ کو سنتی ہے اور سمجھنے کے بعد باوجود علم کے اس کی تحریف کر دیتی ہے۔

ان لوگوں نے قرآن کریم کو سمجھا اور اس کی تحریف کی، یہ لوگ اگر قرآن کو حفظ کریں، اُسے لکھیں اور اُسے یا د پڑھ لیں یا اُن میں سے کوئی صفت نہ رکھتے ہوں، ہر حالت میں مذموم ہیں، جو لوگ اسے سمجھتے ہیں اور جو لوگ امانی (تلاوت) کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، ان سب کا ذکر کرنا مناسب تھا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کو متشابہ اور مثانی کتاب نازل فرمایا ہے اور اس میں اقسام و امثال مذکور ہیں۔ اقسام کے بالاستیعاب ذکر سے وُہ مثانی اور امثال کے ذکر سے متشابہ ہو جاتا ہے اور یہ لوگ خواہ لکھتے پڑھتے رہیں، وُہ اہل کتاب ہیں سے اُمی رہیں گے، جیسا کہ ہم ایسے شخص کو جو معنی نہ سمجھے، اُمی، سادہ اور عامی کہتے ہیں، اگرچہ وُہ قرآن حفظ کرے اور مکتوب پڑھا کرے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی بھی مذمت کی ہے جو قرآن کریم کی تلاوت کے سوا اور کچھ نہیں جانتے اور اُن لوگوں کی بھی مذمت فرمائی ہے جو سمجھنے اور جاننے کے بعد اُس کی تحریف کر ڈالتے ہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ دونوں قسم کے لوگ مذموم ہیں، وُہ جاہل بھی بُرا ہے جو نصوص کے معانی نہ سمجھے اور کاذب بھی مذموم ہے جو کلمات کو اپنی جگہ سے محرف کر ڈالتا اور اُن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتا ہے۔

اور ان باتوں سے قرآن کی تاویل کرتا ہے جنھیں وُہ اللہ تعالیٰ سے منسوب کرتا

ہے۔ یہ لوگ کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اپنے مقالاتِ بتدعہ کے متعلق کہتے ہیں کہ یہی حق ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ہے، سلف صالحین اسی رائے پر تھے، وغیر ذالك من الاكاذيب

سو ان مقالات کے معارضہ میں جو نصوص سامنے آئیں، ان کی تحریف کر ڈالتے ہیں۔ جب یہ لوگ عمدًا ایسا کریں اور دل میں یہ جانتے ہوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ رسول کے مخالف ہے تو وہ اُن یہود کی جنس سے ہیں اور یہ بات بہت سے ملاحدہ میں پائی جاتی ہے اور اُن میں سے بعض باتیں دوسروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور جن لوگوں کا مقصد باطنی وظاہری اتباعِ رسول ہو اور کتابت وتاویل میں غلطی کریں وہ ان لوگوں کی جنس سے نہیں ہیں، لیکن اُن کی غلطی کے سبب سے باطل معرضِ وجود میں آتا ہے، چنانچہ کہا گیا ہے، اِذَا زَلَّ عَالِمٌ زَلَّ بِزَلَّتِهٖ عَالَمٌ (جب عالم لغزش کھاتا ہے تو اُس کی لغزش سے سارا جہان راہِ حق سے پھسل جاتا ہے)۔ اس امت کے متاولین کا یہی حال ہے اور جو شخص مقلد اور اُمّی ہو، کتاب سے اُس کو صرف اسی قدر علم ہو جو ان لوگوں سے سُن پائے یا خود تلاوت کرے اور امانی (تلاوت) کے بغیر کچھ نہ سمجھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی مذمت کی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ قرآن کے معانی نہیں سمجھتے، اس پر عقل وتدبّر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بھی مذمت کی ہے چنانچہ قرآنِ کریم میں کئی مقام پر ان لوگوں کی مذمت بالتصریح مذکور ہے۔

حقائق کی موجودگی میں یہ بات ممتنع ہے کہ قرآن کے اکثر یا کثیر حصّے کے معانی مخلوقات میں سے کسی کو معلوم نہ ہوں، اور لوگوں کو صرف امانی (تلاوت) کا علم ہو۔ حضرت جبرئیل، حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام علیہم الرضوان

اور جمیع مسلمین کو قرآن کے کسی حصے کے معانی سے ناواقف قرار دینا (معاذ اللہ) انہیں اُن لوگوں سے مشابہ قرار دینا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے عدم علم ہی کی بنار پر مذمت کی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر مسلم پر ہر آیت کا معنی جاننا واجب نہیں ہے، تو کہا جائے گا کہ بیشک! لیکن سارے قرآن کے معانی بیان کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور لابدی مسائل کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان لوگوں کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ وُہ کتاب کی تلاوت ہی جانتے ہیں، معانی نہیں جانتے اور ظن کے سوا اُن کے پاس کچھ نہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔	اور وُہ اس سے پریشان کر دینے والے شک میں ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض مفسرین نے "اِلَّا اَمَانِيَّ" کی تفسیر "اِلَّا مَا يَقُوْلُوْنَهُ بِاَفْوَاهِهِمْ كَذِبًا وَّبَاطِلًا" (مگر وُہ جو اپنے منہ سے جھوٹ اور باطل کہتے ہیں) کی ہے اور یہ بعض سلف سے بھی مروی ہے، فرار نے اسے پسند کیا ہے اور اُس نے کہا ہے کہ "امانی' اکاذیب مفتعلہ (من گھڑت جھوٹ) کو کہتے ہیں"۔ ابن دأب ایک مرتبہ حدیث بیان کر رہے تھے تو بعض عربوں نے اُن سے کہا: "اَهٰذَا شَيْءٌ رَوَيْتَهُ اَمْ تَمَنَّيْتَهُ" (کیا یہ بات آپ نے روایت کی ہے یا خود بنالی ہے؟) سو اُس نے امانی سے وُہ چیزیں مراد لی ہیں جو اُن کے علماء نے اپنی طرف سے لکھی تھیں اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا تھا، چنانچہ انھوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ تبدیل کر کے لکھ دیا، اور یہ مشہور کیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حلیہ نازل ہوا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ "امانی" اُن لوگوں کی وُہ باطل اور جھوٹی آرزوئیں ہیں جن

کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ خدا انہیں پورا کرے گا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے :

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً۔	ہمیں صرف چند دن آگ چھوئے گی۔
لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصَارٰی۔	جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا ہرگز کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ	ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں۔

یہ قول بھی بعض سلف صالحین سے مروی ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ دونوں قول ضعیف ہیں اور پہلا قول درست ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ۔	ان میں سے اُمّی ہیں جو کتاب میں سے امانی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

استثناء کی بحث و امثلہ

یہ استثناء یا متصل ہو گا یا منقطع، اگر متصل ہو تو کتاب سے کذب کا یا خواہشات قلب کا استثناء جائز نہیں، اور اگر منقطع ہو تو استثنائے منقطع اس میں ہوتا ہے جو بعض وجوہ سے مذکور کی نظیر یا شبیہ ہو اور وہ اس چیز کی جنس سے ہو، جو لفظوں میں مذکور ہو۔ شے مذکور کی جنس سے نہ ہو، اسی لیے جس مقام پر استثنائے مفرغ درست ہو، اس مقام پر استثنائے منقطع بھی درست ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ	اس میں وہ موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے

اِلَّا مَوْتَةَ الْاُوْلٰی۔	صرف پہلی مرتبہ مرنا ہوگا۔

یہ استثنائے منقطع ہے اور یہی عبارت استثنائے منفرغ کی صورت میں بھی یہی مفہوم پیدا کرسکتی ہے اور وُہ اس طرح ہے: "لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً۔" (تجارت کے سوا اور کسی صورت میں ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ)

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔	اُن کو علم تو ہے نہیں، البتہ ظن کا اتباع کر رہے ہیں۔

یہ استثنائے منقطع استثنائے مفرغ کی صُورت میں اس طرح ہوگا: "وَمَا لَهُمْ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ" (اُن کے پاس اتباع ظن کے سوا کچھ نہیں) اسی طرح

لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّا اَمَانِیَّ۔	کتاب نہیں جانتے، البتہ امانی جانتے ہیں۔

اس طرح بھی پیش کیا جاسکتا ہے: "لَا يَعْلَمُوْهُ اِلَّا اَمَانِیَّ" (وُہ امانی کے سوا اس سے اور کچھ نہیں جانتے) کیونکہ وُہ اس کی تلاوت جانتے ہیں، اُسے پڑھتے ہیں، سنتے ہیں۔ اس طرح کہنا صحیح نہیں ہے، "لَا يَعْلَمُوْنَ اِلَّا مَا تَتَمَنَّاهُ قُلُوْبُهُمْ" (وُہ نہیں جانتے، البتہ باتیں جانتے ہیں جن کی آرزو اُن کے دلوں میں پیدا ہوتی ہو) یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ "لَا يَعْلَمُوْنَ اِلَّا الْكِذْبَ" (وُہ جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں جانتے) کیونکہ انھیں بعض سچی باتیں بھی معلوم ہیں، اپنے علماء سے جو کچھ سیکھتے ہیں، وُہ سارے کا سارا جھوٹ ہی نہیں ہوتا، البتہ جو شخص کتاب کے معنی نہیں سمجھتا، وُہ تلاوت کے سوا کچھ نہیں سمجھتا۔

نیز وُہ امانی باطلہ جن کی آرزو اُن کے قلوب میں تھی اور جن کا اظہار وُہ اپنی زبانوں کے ساتھ کرتے تھے، اُن کی مذمت صرف اُمّی لوگوں کے ساتھ خاص نہیں تھی، بلکہ وُہ سب ان آرزوؤں میں مشترک تھے۔ اس میں ان کی مذمت صرف اس حیثیت سے نہیں کی گئی کہ وُہ اُمی ہیں اور نہ اس لحاظ سے مذمت کی گئی ہے کہ اُن کو کتاب کا علم حاصل نہیں، بلکہ جو لوگ اُن آرزوؤں کو باطل سمجھتے ہیں، وُہ ان لوگوں کی نسبت زیادہ مستحق مذمت ہیں جن کو یہ معلوم نہیں کہ یہ امانی باطل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان آرزوہائے باطلہ کی وجہ سے ان لوگوں کی مذمت کی تو کسی فریق کو مخصوص نہیں کیا، بلکہ وُہ سب کے لیے عام کی گئی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔	کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے سوا جنت میں ہرگز کوئی داخل نہ ہو سکے گا۔ یہ اُن کی امانی ہے، اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ دو، کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لاؤ۔

نیز فرمایا:

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ	وُہ محض خیالی تکے چلاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کی مذمت اس بات پر کی گئی ہے کہ وُہ علم نہیں رکھتے۔ اور اُن کے پاس ظن ہی ظن ہے اور یہ حالت اس شخص کی ہے جو معانی کتاب سے ناواقف ہو۔ اس شخص کا حال یہ نہیں ہے جو یہ جانتا ہو نہ وُہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ صفت ان لوگوں کی نہیں ہے

جو اپنے منہ سے جھوٹ اور باطل کہتے ہیں، اگر اس سے یہ مراد ہوتی تو کہا جاتا: "لَا يَقُولُونَ إِلَّا أَمَانِيَّ" (وہ محض امانی کہتے ہیں) یہ نہ کہا جاتا۔

لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ۔ | کتاب میں سے وہ امانی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

بلکہ یہ صنعت ان لوگوں کی ہے جو کلمات کو اپنی جگہ سے محرف کر ڈالتے ہیں۔ کتاب پڑھتے ہوئے اپنی زبانوں کو مروڑتے توڑتے ہیں تاکہ خیال گزرے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ درحقیقت کتاب میں درج ہے، حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں، تاکہ اس کے عوض میں تھوڑی قیمت وصول کریں، سو وہ کتاب کے معانی کی تحریف کرتے ہیں اور جو شخص کتاب سے واقف نہ ہو اس کے سامنے تو لفظ کی بھی تحریف کر دیتے ہیں اور تلفظ و کتابت میں جھوٹ استعمال کرتے ہیں۔

عدم علم کتاب، امم مغضوبہ سابقہ کی سنت ہے

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، کہ انھوں نے فرمایا: "لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ" (تم اُن لوگوں کا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، اس طرح اتباع کرو گے جس طرح ایک پر تیر کا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے سوراخ میں داخل ہوتے تو تم بھی داخل ہوتے) لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا، "اور کون؟" یہ بھی صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "لَتَأْخُذَنَّ أُمَّتِيْ مَا أَخَذَ

الْاُمَمُ قَبْلَهَا شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ " (میری امت بھی اُن علاقوں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ذراع لے کر رہے گی جو اس سے پہلی قومیں لے چکی ہیں) انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس سے فارس وروم مراد ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کے سوا اور کون لوگ ہیں۔ ؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کے جن اطوار کی مذمت کی گئی ہے وُہ اس امت کے بعض لوگوں میں بھی پائے جائیں گے اور یہ سچ ہے، اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔

ہم انھیں آفاق میں اور اُن کے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ وُہ حق ہے کیا یہ تمہارے اطمینان کے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کی فرمائی ہوئی خبروں پر تدبر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بہت سی بلکہ اکثر باتیں واقع ہو چکی ہیں اور یہ اس امر پر دال ہے کہ باقی باتیں بھی واقع ہونے والی ہیں۔

کتاب و سنت خلافِ عقل نہیں ہے!

یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر جو کتاب و حکمت نازل فرمائی ہے اُس کے علم کی جستجو اور اس کے معانی معلوم کرنا جب ہے۔ صحابہ و تابعینؒ اور اُن کے مسلک پر چلنے والے اسی عقیدے پر قائم تھے، اللہ اور رسول نے لوگوں کی تمام دینی ضروریات کی تشفی بخش تشریح کر دی ہے اصولِ توحید و ایمان کی تشریح تو بطریق اولیٰ و اخریٰ کی گئی ہے جو کچھ رسولؐ

نے بیان کیا ہو، اس سے واقف ہونے کے بعد لوگوں کے اقوال پر غور کیا جائے گا کہ ان سے اُن کی کیا مراد تھی؟ پھر وُہ کتاب وسنت کے سامنے لائے جائیں گے، اور عقلِ صریح ہمیشہ رسول کے موافق ہوتی ہے، ہرگز مخالفت نہیں کرتی، میزان کتاب اللہ کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نے کتاب حق و میزان کے ساتھ نازل فرمائی ہے۔ لیکن لوگوں کی عقلیں اس کی تفصیل جاننے سے قاصر رہتی ہیں جو رسول لاتا ہے۔ رسول وُہ چیز لاتا ہے جس کی معرفت سے وُہ عاجز آجاتے اور ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ وُہ ایسی چیز ہرگز نہیں لاتا جو لوگوں کے نزدیک عقلاً معلوم البطلان ہو۔ رسل ربانی علیہم الصلوٰۃ والسلام محیّراتِ عقول کی خبر دیتے ہیں نہ کہ محالاتِ عقول کی۔ ہدایت، سنت اور علم کی راہ یہی ہے، گمراہی، بدعت اور جہالت کی راہ اس کے برعکس ہے اور وُہ یہ ہے کہ لوگوں کی رائے اور اُن کی تاویلات سے ایک بدعت نکالی جائے اور شریعتِ رسول کو اس کا تابع بنایا جائے اس کے الفاظ کی تحریف کی جائے، اہلِ بدعت کی باتوں کو اصول قائم کر کے شریعت کو اُن کے مطابق کرنے کے لیے تاویل کی جائے، حالانکہ وُہ لوگ خود شریعتِ نبوی پر اعتماد نہیں کرتے، اس سے ہدایت نہیں سیکھتے، جو کچھ اُن کے موافق ہوتا ہے اسے قبول کر لیتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں کہ انھیں اس پر یقین و اعتماد ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ وُہ اسے حجت بنانا چاہتے ہیں، اور جو بات اُن کے مخالف ہو اس کی تاویل کرتے ہیں اور ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں جو "یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ" کے مصداق بن کر اپنی پیشانیوں پر شقاوت کا داغ لے کر رخصت ہو گئے ہیں یا وُہ "مَا جَآءَ بِہِ الرَّسُوْلُ" کو چھوڑ ہی دیتے ہیں۔ یہ لوگ "لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ" کے مصداق ہیں۔ یہ لوگ رسول کی شریعت سمجھنے سے یا تو عجز کے باعث محروم رہتے ہیں یا تفریط کے باعث۔

شریعتِ نبوی کے دو مقدمات ہیں، ایک یہ کہ رسول نے کیا فرمایا؟ اور دوسرا یہ کہ اُس کی مراد اس سے کیا تھی؟ اول الذکر کے متعلق عامۃ الناس کو یقین ہے کہ رسول اللہؐ قرآن لائے ہیں، اگرچہ غلاۃ اہل بدعت اس کے بعض حصے میں شک کرتے ہیں۔

فرقِ باطلہ کی تفصیل اور اُن کے مدارجِ ضلالت

لیکن احادیث سے عامہ اہلِ بدعت جاہل ہیں، اُن کا خیال ہے کہ ان احادیث کو آحاد نے روایت کیا ہے اور اُن کے نزدیک اُن کا جھوٹ کہنا یا خطا کرنا ممکن ہے۔ اُن کو معلوم نہیں ہوتا کہ احادیث بہت سے طریقوں سے مروی ہوتی ہیں اور وہ رجالِ احادیث کی صفات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ جس طرح اہل علم و محدثین ان اسباب سے واقف ہوتے ہیں جو تصدیق احادیث کو واجب کر دیتے ہیں، اس طرح یہ جہال واقف نہیں ہوتے۔ محدثین کا قطعی فیصلہ ہے کہ صحیحین کے عامہ متون یقیناً صحیح ہیں، جیسا کہ ہم دوسری جگہ اس پر تفصیلاً لکھ چکے ہیں۔

دوسرے مقدمے کے متعلق ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے معانی نہیں جانتے۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظی دلیلیں مرادِ متکلم کے متعلق یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ کسی دوسری جگہ پر ہم اس قول کی تردید میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ مذہب کے متعلق اپنے موافقین کے اقوال کو قرآن و حدیث کی تفسیر سمجھ لیتے ہیں، اُن کی تاویلات قبول کر لیتے ہیں اور جو نصوص اُن کے موافق ہوں اُن سے حجت گیر ہوتے ہیں، اور جو اُن کے مخالف ہوں اُن کی تاویل کر ڈالتے ہیں، ان میں بہت سے لوگ ایسے

ہوتے ہیں جن کا منشا ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ نص کی پیروی کی جائے۔ یہ شیوہ رافضہ، جہمیہ وغیرہ کبار اہل بدعت کا ہے، کیونکہ جس نے رفض اختیار کیا ہے، وُہ زندیق ہے، اس نے صریحاً جھوٹا کام شروع کر دیا اور وُہ جانتا بھی ہے کہ وُہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ یہ فرقہ یہود کے اُس فرقے کی طرح ہے جس کے متعلق آیۃ

يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔	وُہ اللہ پر جھوٹ افتراء باندھتے ہیں حالانکہ وُہ جانتے ہیں۔

نازل ہوئی ہے۔ یعنی یہ کہ وُہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں، حالانکہ وُہ جانتے ہیں۔ اُن مفتریات کے متعلق جنھیں سچ کا گمان ہوا اُن کے متعلق فرمایا کہ وُہ شک میں پڑے ہوئے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ	ان کے بعد جن لوگوں کو علم دیا گیا، وُہ بھی پریشان کر دینے والے شک میں ہیں۔

جہمیہ کی بھی یہی حالت ہے، ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے علو علی العرش اور دیگر صفات کی نفی کے لیے نص آیت وحدیث موجود نہیں ہے اور جس نے عقیدۂ نفی کی ہے اُس کا مقصود اتباعِ انبیاء نہیں تھا، بلکہ یہ عقیدہ اسی طرح وضع ہوا جس طرح بتوں کی عبادت اور دیگر ادیانِ باطلہ کی ابتداء ہوئی، جن کے موجدین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ مذاہب پیغمبروں کے مسلک کے خلاف ہیں اور بعد میں یہ عقائدِ فاسدہ اُن لوگوں تک بھی پھیل گئے جنھیں ان کی اصل وحقیقت معلوم نہیں تھی۔

جن یہود نے توراۃ کی تحریف کی، انھیں معلوم تھا کہ وُہ مذہب میں تبدیلی کر رہے ہیں، لیکن بعد میں ناواقف لوگ اس مبدل ومحرف دین کو اصلی آسمانی

دین سمجھنے لگے۔ بدعتِ خوارج کی حقیقت اس کے خلاف ہے۔ انھوں نے اُس کی بنا۔ اس پر رکھی جو انھوں نے قرآنِ کریم سے سمجھا، البتہ انھوں نے فہم میں غلطی کھائی ظاہراً و باطناً ان کا مقصد یہی تھا کہ قرآن کی پیروی کی جاسکے وُہ زندیق نہیں تھے۔

قدریہ کی بھی یہی حالت ہے، ان کا اصلی مقصد امر و نہی، وعد و وعید اور شریعت نبوی کی تعظیم تھا، قرآن کریم میں سے جو کچھ اس حقیقت پر دال تھا اس کی وُہ پیروی کرتے تھے، عمرو بن عبید و امثالہ کا اصل مقصود رافضہ کی طرح رسولؐ کی معاندت نہ تھا۔ فرقہ ارجائیہ کا بھی مقصد مخالفتِ رسولؐ نہیں تھا، وُہ دراصل سارے اہلِ قبلہ کو کفار نہیں بلکہ مومن بنانا چاہتے تھے، خوارج و معتزلہ کے مقابلے میں آتے تو دوسری طرف ہو گئے۔ متوسط تشیع بھی ایسا ہی ہے، اس کا مقصد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو دوسروں پر تفضیل و ترجیح دینا اور اس طرح کے دیگر امور ہیں، زنادقہ کی طرح نص کی مخالفت اور معصومین کی توہین نہیں ہے جو نص و عصمت کی مخالفت کرتا ہے وُہ منافق اور زندیق ہے۔ اسی لیے عبد اللہ بن مبارک اور یوسف بن اسباط وغیرہما نے کہا ہے" اصول بدعت چار ہیں۔ شیعہ خوارج، قدریہ اور مرجئہ۔ وُہ کہتے ہیں کہ جہمیہ بہتر فرقوں سے نہیں ہیں۔

ابو عبد اللہ بن حامدؒ نے اس مسئلے میں امام احمدؒ کے دوستوں سے دو قول ذکر کیے ہیں جن میں سے ایک یہی ہے۔ مسلکِ جہمیہ سے ان کی مراد وُہ خالص تجہم ہے جس پر جہم خود اور اس کے تابعین تھے۔ وُہ اسماء وصفات کی نفی کرتے تھے۔ اسماء حسنیٰ میں کسی کو نہیں مانتے تھے۔ خدا تعالیٰ کو کوئی چیز اور کوئی موجود وغیرہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس سے منقول ہے کہ وُہ خدا کو قادر کے نام سے موسوم کرتا تھا، کیونکہ اُس کے خیال میں ان سب ناموں سے تشبیہ لازم آتی ہے جن سے مخلوق موسوم ہو سکے۔ لیکن قادر سے تشبیہ لازم نہیں آتی۔ وُہ جبریہ

کا سزاوار تھا۔ اس کے نزدیک بندے کو کوئی طاقت حاصل نہیں، اور وہ کوئی فعل نہیں کر سکتا۔ غیر اللہ کو قادر کے نام سے موسوم نہیں کرتا تھا، ان سے بدتر وہ ملاحدہ فلاسفہ و قرامطہ ہیں جو اسماء وصفات کی نفی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں سارے ائمہ، ملاحدہ منافقین کہتے ہیں، بلکہ اُن میں ایک ایسا باطنی کفر ہے جو کفر یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا ہے۔

بلاشبہ یہ لوگ بہتر فرقوں سے نہیں ہیں اور جب وہ اظہارِ اسلام کرتے ہیں تو ان کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ منافقین بنیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقین ان منافقین کی نسبت اسلام سے قریب تر تھے کیونکہ وہ اسلام کے ظاہری شعائر و شرائع کی پابندی کرتے تھے اور یہ کہتے ہیں کہ ان باتوں کی کوئی ضرورت نہیں، صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ بے حقیقت چیزیں ہیں لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ عہد اول کے منافقین پر حجت رسالت ان لوگوں کی نسبت زیادہ قائم ہوتی ہے۔

تجسم کے بعض عقائد رکھنے والے لوگ مثلاً معتزلہ وغیرہ جو باطناً وظاہراً دینِ اسلام کے پیرو ہیں۔ وہ بلاشبہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہیں اسی طرح اُن لوگوں سے بہتر لوگ کلابیہ و کرامیہ ہیں، حضرت علی کو فضیلت دینے والے شیعہ میں سے جو لوگ نص و عصمت کے قائل ہیں، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر باطناً وظاہراً یقین رکھتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ ان کا مسلک دینِ اسلام کے مطابق ہے وہ اہلِ ضلال و جہل ہیں لیکن امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج نہیں ہیں، البتہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انھوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کر دی اور گروہ گروہ بن گئے۔ ان لوگوں میں عام لوگ فتنہ و تاویل کی غرض سے متشابہاتِ قرآنیہ کے درپے

رہتے تھے، جیسا کہ منافقین و کفار میں سے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں، اسی لیے مفسرین کی ایک جماعت، جس میں ربیع بن انس شامل ہیں، کہتی ہے کہ وُہ نصاریٰ نجران کی طرح نصاریٰ ہیں" کلبی اور اس کی ہمخیال جماعت کا خیال ہے کہ وُہ یہود ہیں۔ ابن جریج اور اس کے ہم خیال لوگ کہتے ہیں کہ وُہ منافق ہیں۔ حسن اور اس کی جماعت کا قول ہے کہ وُہ خوارج ہیں، قتادہ اور اُس کی جماعت کا خیال ہے کہ وُہ خوارج شیعہ ہیں۔ قتادہ جب آیہ شریفہ "فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ" (آل عمران) پڑھا کرتے تھے تو کہتے تھے؛ بشرطیکہ وُہ حروریہ وسبائیہ نہ ہوں، مجھے معلوم نہیں کہ وُہ کون ہیں۔ سبائیہ فرقہ عبداللہ بن سبا سے منسوب ہے جو رافضہ کا سردار تھا۔

منکرینِ اسما وصفات پر بحث

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق "اَحَدٌ" اور "وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ" اور "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا" (مریم) (کیا تمہیں اس کا کوئی ہم نام معلوم ہے؟) اور اسی طرح کی اور بہت سی آیات نازل فرما کر ثابت کیا کہ اس کا کوئی شریک و مثیل نہیں۔ یہ معانی صحیحہ کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور عقل اُن کی تائید کرتی ہے۔

جو شخص احد یا صمد وغیرہ اسماء کے یہ معنی کرے کہ اللہ تعالیٰ وُہ ذات ہے جو منقسم و متفرق نہ ہو سکے اور مرکب وغیرہ نہ ہو۔ اگر اُس کی مراد یہ ہو کہ وُہ تفرق و انفصال قبول نہیں کرتا تو یہ حق ہے، اور اگر مراد یہ ہو کہ کسی حال میں اس کی طرف اشارہ نہیں ہو سکتا، یا اُسے جوہر فرد کی جنس سے سمجھیں کہ اس کے کسی حصے کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے حصے سے اس کا امتیاز ہو تو اُس کا وجود اکثر عقلاء کے نزدیک ممتنع ہے۔ یہ صرف ذہن میں فرض کیا

جا سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب اہل عرب "واحد" اور "احد" کے لفظ کو نفیاً یا اثباتاً استعمال کرتے ہیں تو وہ اس سے یہ مراد نہیں لیتے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ۔	اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو۔

اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہیں تھی جو ان لوگوں نے واحد اور احد کی تفسیر سے کی ہے۔

وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ۔	اگر ایک لڑکی ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔

اس میں بھی احد اور واحد کے معنی نہیں لیے گئے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ۔	اور اس کے لیے کوئی کفو نہیں ہے۔

اگر یہاں واحد سے مراد وہ چیز ہے جس کا کوئی جزو دوسرے سے متمیز نہ ہو سکے۔ اور اس کے کسی حصے کی طرف اشارہ نہ ہو سکے تو موجودات میں نام نہاد جوہر فرد کے سوا اور رب العالمین کے سوا کوئی چیز احد نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں موجودات سے کسی چیز کے متعلق اس امر کی نفی نہ کی جاتی کہ وہ پروردگار کے لیے کفو (مقابل) ہو سکتی ہے کیونکہ وہ چیز احد کے منطوق میں داخل ہی نہیں، ہم ان مباحث عقلیہ وسمعیہ میں جن کا ذکر منکرین صفات، جہمیہ اور ان کے اتباع نے کیا ہے اس مسئلے پر اپنی کتاب "بیان تلبیس الجہمیہ فی تاسیس بدعہم الکلامیہ" میں بسط و شرح کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

جب جہمیہ نے امام احمد وغیرہ سلف صالحین کے سامنے اسم واحد سے نفی صفات کا استدلال کیا تو امام احمد نے فرمایا "وہ کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ بات نہ کہو کہ اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی چیز نہیں، اس وقت تک تم ہرگز موحد نہیں ہو سکتے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی چیز نہیں، لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی صفات کے ساتھ قائم ہے۔ تو کیا ہم ایک معبود کا وصف بیان نہیں کرتے؟ ایک کھجور کا درخت تنے، جگن، چھلکے، شاخوں، پتوں اور گودے پر مشتمل ہوتا ہے تاہم اس کا نام ایک چیز ہوتا ہے اور وہ اپنی جمیع صفات کے باوجود "نخل" سے موسوم ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بزرگ ترین اوصاف کے باوجود ایک معبود ہے۔ ہم نہیں کہتے کہ وہ کسی خاص وقت میں ہوا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا علم کب پیدا ہوا؟ لیکن ہم کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ قادر اور مالک رہا ہے، "کب" اور "کس طرح" کو یہاں کوئی دخل نہیں۔"

سورۃ اخلاص کا سبب نزول

مفسرین نے اس سورت کا جو سبب نزول بیان کیا ہے وہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے، انہوں نے اس کے نزول کے متعلق بہت سے اسباب ذکر کیے ہیں، ایک وہ جو گزر چکا ہے اور جو ابی بن کعبؓ سے مروی ہے، کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمارے سامنے اپنے پروردگار کی تعریف بیان کرو۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

دوسرا یہ کہ عامر بن طفیل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "اے محمدؐ! آپ ہمیں کس کی طرف دعوت دیتے ہیں"؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی طرف"۔ اس نے کہا کہ "اس کے اوصاف مجھے سنائیے کہ وہ سونے سے

بنا ہوا ہے، یا چاندی سے یا لوہے سے"؟ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ یہ روایت ابو ظبیان اور ابو صالح نے حضرت ابنِ عباسؓ سے کی ہے۔

تیسری روایت یہ ہے کہ بعض یہود نے کہا کہ خدا کون سی جنس سے ہے، دُنیا اسے کس کے ورثہ میں ملی ہے اور اس کا وارث کون ہوگا؟ اس پر یہ سورت نازل ہوئی، یہ قتادہ و ضحاک کا قول ہے۔ ضحاک، قتادہ اور مقاتل کا بیان ہے کہ علمائے یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے، اے محمدؐ! ہمیں اپنے پروردگار کے اوصاف سنائیں تاکہ ہم آپ پر ایمان لائیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں اس کی تعریف نازل فرمائی ہے، سو ہمیں بتائیں کہ وُہ کس چیز سے بنا ہُوا ہے۔ اور کس جنس سے ہے، سونا ہے، تانبا ہے، پیتل ہے، لوہا ہے یا چاندی ہے، نیز کیا وُہ کھاتا پیتا ہے؟ دُنیا اُسے کس کے ورثہ میں ملی ہے اور اس کا وارث کون ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سُورت نازل کی، اور یہ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے۔

چوتھی روایت جو ضحاک نے حضرت ابنِ عباسؓ سے کی ہے وُہ یہ ہے کہ وفدِ نصاریٰ نجران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جس میں حرث بن کعب کی اولاد سے سات پادری شامل تھے۔ سردار سے لے کر ادنیٰ درجے کے آدمی تک اس وفد میں موجود تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے، ہمیں اپنے رب کے اوصاف بتاؤ وُہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرا رب کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا؟ اور وُہ اشیاء سے بائن (جدا) ہے، سو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا:
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ | کہو کہ وُہ اللہ تعالیٰ ایک ہے۔

پھر ان لوگوں نے پوچھا کیا وُہ اجناسِ مخلوقات میں کسی جنس سے ہے۔؟ اور کیا وُہ مادہ سے پیدا ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ وُہ ایک ہے اور

مخلوقات سے کسی چیز کی جنس سے نہیں ہے، وُہ صمد ہے، مادہ سے نہیں بنا نہ وُہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس سے کوئی پیدا۔

جب اس کے متعلق مادہ والد سے پیدا ہونے کی نفی کی گئی ہے تو دیگر تمام مواد سے پیدا ہونے کی نفی بطریق اولیٰ و اخریٰ ثابت ہوتی ہے کیونکہ مولود کا اپنی نظیر کے مادہ سے پیدا ہونا دوسرے مادہ سے پیدا ہونے کی نسبت کامل تر ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام کیچڑ سے پیدا کیے گئے، اس لیے جس مادے سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے وُہ مادے سے افضل ہے جس سے وُہ خود پیدا ہوتے، اس لیے اس کی پیدائش زیادہ عجیب ہے۔ سو جب پروردگار اعلیٰ مادے سے منزہ ہو تو وُہ ادنیٰ مادے سے بطریق اولیٰ منزہ ہے۔ جب وُہ اس امر سے منزہ ہے کہ کوئی چیز اس کے برابر کی (کفو) ہو تو وُہ اس سے بطریق اولیٰ و اخریٰ منزہ ہے کہ کوئی اس سے افضل ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت تنزیہ و تحمید اور نفی و اثبات کی جمیع اقسام پر مشتمل ہے، اس لیے وُہ ثلث قرآن کے برابر ہے۔ صمدیت ایسا کمال ثابت کرتی ہے جو نقائص کے منافی ہے اور احدیت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کمال صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس طرح جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اس بات سے منزہ قرار دیا ہے کہ اس سے کوئی اولاد پیدا ہو۔ اور اس سے اولاد کی صورت میں کوئی مادہ خارج ہو تو اولاد کے سوا کسی اور صورت میں مادہ خارج ہونے سے وُہ بطریق اولیٰ منزہ ہے، کیونکہ جس مادے سے اولاد پیدا ہوتی ہے وُہ اشرف المواد ہے۔ جب اس سے مخلوقات کے لیے مواد خارج نہیں ہو سکتے تو اس سے فضلات کیونکر خارج ہو سکتے ہیں جن میں مادہ بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔

انسان سے اولاد کی صورت میں بھی مادہ خارج ہوتا ہے چنانچہ اس کے پسینے اور رطوبت سے جوئیں اور کیڑے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں اللہ اس سے تھوک

اور نزلہ وغیرہ خارج ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کو اس بات سے منزہ کیا ہے کہ ان سے اس طرح کے فضلات خارج ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "وہ بول و براز اور تھوک اور آب بینی سے منزہ ہیں، ان سے فضلہ کا خروج اس طرح ہوگا جس طرح کستوری جھڑتی ہے، جس عضو سے وہ جماع کریں گے وہ ایسا نہ ہوگا کہ اس کو چھپانے کی ضرورت داعی ہو، ان کی شہوت کبھی منقطع نہ ہوگی منی نہ ہوگی، اور جب اُن میں سے کوئی اولاد کی خواہش کرے گا تو تھوڑی ہی مدت میں حمل و وضع ہو جائے گا"۔

الغرض، اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو اولاد سے منزہ قرار دینا اس امر کو متضمن ہے، مخلوقات سے جو اور چیزیں خارج ہوتی ہیں اس سے، وہ بھی خارج نہ ہوں اور یہ بات صمد کے معنی میں داخل ہے، چنانچہ اس لفظ کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ صمد وہ ہے جس سے کچھ خارج نہ ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو اس بات سے منزہ قرار دینا کہ وہ کسی کی اولاد ہو اور اس کا مولود منہ اس کی مثل قرار پائے، اس بات کی بیّن تر دلیل ہے کہ وہ جمیع مواد سے منزہ ہے۔

ابی بن کعب کی حدیث میں یہ پہلے آچکا ہے کہ "جو چیز پیدا ہوگی وہ ضرور مرے گی اور جو چیز مرتی ہے اس کا کوئی وارث ہوتا ہے" یہ یہود کے اس قول کا رد ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے دنیا کس کے ورثہ میں حاصل کی ہے اور اس کا وارث کون ہوگا" اسی طرح نصاریٰ کا یہ قول ہے کہ اپنے رب کی تعریف بیان کرو کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ میرا پروردگار کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا اور وہ اشیاء سے بائن ہے۔ اسی طرح مشرکین و یہود کا یہ سوال ہے کہ خدا چاندی سے بنا ہوا ہے، یا سونے، یا لوہے سے؟

انھوں نے یہ سوال اس لیے کیے کہ وہ جن معبودان غیر اللہ کی پرستش کیا کرتے

تھے، وُہ مواد سے پیدا ہوتے تھے۔ بت پرستوں کے بت سونے چاندی اور لوہے وغیرہ کے ہوتے تھے۔ بشر پرستوں کے معبود بھی مواد سے پیدا ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے معبود تھے جنھوں نے اپنی پرستش کا حکم نہیں دیا تھا۔ مثلاً مسیح وعزیز علیہما السلام۔ اور بعض ایسے تھے جنھوں نے اپنی پرستش کا حکم دے رکھا تھا مثلاً فرعون نے کہا تھا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں، میرے سوا تمہارا اور کوئی رب مجھے معلوم نہیں، (اے موسیٰ) اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنایا، تو میں تجھے قید کر دوں گا"، معبودین ملعونین میں سے دوسری مثال اس شخص کی ہے جس نے ابراہیم علیہ السلام سے محض اس وجہ سے شیخی میں آکر جھگڑنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک اور بادشاہت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وُہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو وُہ کہنے لگا کہ میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ تیسری مثال اس شخص کی ہے جو خدائی کا دعوےٰ کرے گا۔ اور آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامِ محشر تک فتنۂ دجال سے بڑا فتنہ کوئی نہ ہو گا۔

بُت پرستی کی ابتداء

پھر اُن لوگوں کی مثال ہے جو کہتے تھے:

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔	اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ وَدّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔

سلف صالحین سے متعدد افراد کا قول ہے کہ یہ نیک لوگوں کے نام ہیں۔ جو اس قوم سے تھے، جب وُہ مر گئے تو اُن لوگوں نے اُن کی قبروں پر اعتکاف شروع کر دیا، ان کی مورتیں بنا لیں۔ اور اُن کی پُوجا کرنے لگے۔ سب سے پہلے بُتوں

کی پرستش یہاں سے شروع ہوئی اور یہی بت عرب کی طرف گئے۔ بخاری نے اپنی "صحیح" میں ذکر کیا ہے۔

ابن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ "جو بت نوح علیہ السلام کی قوم میں تھے وہ بعد میں عرب میں آ گئے تھے۔ "ودّ" قلعۃ "دومۃ الجندل" میں کلب کے پاس تھا "سواع" ہذیل کے پاس تھا "یغوث" پہلے مراد کے پاس تھا پھر "سبا" کے قریب جرف کے مقام میں بنی غطیف کے پاس آ گیا، "یعوق" قبیلۂ ہمدان کے پاس تھا اور "نسر" حمیر کے پاس تھا اور آلِ ذوالکلاع، اس کی پرستش کرتی تھی۔ یہ قوم نوح کے صالح مردوں کے نام تھے۔ جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کو بہکایا کہ وہ جن مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے اُن کی طرف نشان کھڑے کر دو اور اُن کے ام پر اُن کے نام رکھو، انہوں نے ایسا کیا، لیکن اس وقت اُن بتوں کی عبادت نہیں شروع ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ ہلاک ہو گئے اور علم منسوخ ہو گیا تو ان کی عبادت کی جانے لگی۔ نوح علیہ السلام اپنی قوم میں نوسو پچاس سال رہے اور انہیں توحید کی دعوت دیتے رہے۔ اہلِ زمین کی طرف جتنے رسول مبعوث ہوتے ہیں، ان میں نوح علیہ السلام سب سے اول مبعوث ہوئے ہیں۔ جیسا کہ "صحیح" میں ثابت ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور یہ دونوں مرسل ان بتوں کے پجاریوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ جو نیک آدمیوں کی صورت پر بنائے گئے تھے اور اُن کی پرستش سے مقصود اُن نیک آدمیوں کی پرستش تھا۔

مشرکین اہلِ کتاب اور اس امت کے مبتدعین وضالین کے شرک وضلال کی غایت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ، عیسیٰ اور اس کی ماں کے سوا جن انسانوں کی عظمت کرتے ہیں اُن کی [illegible] اپنے گرجوں میں بناتے ہیں، مثلاً مارجرجس وغیرہ کی تصویریں کثرت [illegible] جاتی ہیں اور نصاریٰ ان تصویروں کی پرستش کرتے ہیں

اُن سے حاجتیں مانگتے اور دُعائیں کرتے ہیں، اُن کے ناموں کے وظیفے پڑھتے اور نذریں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان نیک انسانوں کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ رہتی ہے۔ شیاطین ان لوگوں کو اس طرح گمراہ کرتے ہیں جس طرح کبھی مشرکین کو گمراہ کرتے تھے۔ شیطان اس شخص کی صورت بن کر آجاتا ہے جسے پکارا جاتا اور جس کی عبادت کی جاتی ہے، پکارنے والا خیال کرتا ہے کہ وُہ شخص آگیا اور خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو اُس کی صورت دے کر بھیجا ہے چنانچہ نصرانی قید وغیرہ مصائب میں مارجرس وغیرہ کو پکارتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وُہ ہوا میں اُن کے پاس آگیا ہے۔ ان کے بعض بطریقوں سے پوچھا گیا کہ ان مقامات پر مارجرس وغیرہ کیونکر دکھائی دیتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ کو اس کی صورت دے دیتا ہے جو شخص اُسے بلائے، اس کی فریاد سنتا ہے ان شیاطین نے مشرکین کو گمراہ کیا۔ اسی طرح بہت سے اہل بدعت و ضلال اور مشرکین جو اس امت سے منسوب ہیں، ان کا بھی یہی خیال ہے ان میں سے کوئی شخص جب اپنے مردہ شیخ سے دُعا کرتا اور اس کے آگے فریاد کرتا ہے یا اُس کی قبر کے سامنے فریاد کرتا اور اُس سے سوال کرتا ہے، اُس کے نام کی نذر مانتا اور اس طرح کی دُوسری حرکتیں کرتا ہے تو اُسے وُہ شخص ہوا میں نظر آتا ہے اور وُہ دیکھتا ہے کہ وُہ اس کی کسی مصیبت کو دُور کرتا اور اس کی حاجات کے متعلق اُس کے ساتھ کلام کرتا ہے، اسی طرح اگر شیخ زندہ ہو تو وُہ گمان کرتا ہے کہ وُہ خود آیا ہے۔

گمراہ مشائخ کی قسمیں

مجھے ان لوگوں کی ایسی جماعتیں بھی معلوم ہیں، جو خود اپنے شیخ کے پاس جاتی ہیں جس سے انھوں نے فریاد کی ہوتی ہے اور جسے انھوں نے ہوا میں اپنی طرف آتا دیکھا ہوا ہے

اور اس کے پاس جاکر اس واقعہ کا ذکر کرتی ہیں۔ سو کبھی وُہ پیر خود اس واقعہ سے بے خبر ہوتا ہے اور اگر وُہ جاہ پسند ہو تو خاموش ہو جاتا اور انہیں وہم دلاتا ہے کہ وُہ بلا ریب اُن کے پاس آیا ہے اور اُس نے اُن کی فریاد رسی کی ہے اور اگر اس میں سچائی ہو، لیکن جاہل اور گمراہ ہو تو وُہ کہتا ہے کہ "یہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے میری صورت میں رُونما کیا ہے" یہ صالحین کی کرامتیں ہوتی ہیں، اور جو شخص صالحین سے فریاد کرے اور انہیں اپنے دستگیر و ارباب بنالے، یہ فرشتہ اُن کی حاجت روائی کرتا ہے اور جب وُہ بزرگوں سے فریاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتے نازل فرماتا ہے جو فریاد خواہ کی حاجت پوری کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اکابر شیوخ میں جن سے مجھے واقفیت حاصل ہے صدق، زہد اور عبادت ہوتی ہے، لیکن چونکہ اس کا خیال ہوتا ہے کہ یہ بات کراماتِ صالحین میں داخل ہے اس لیے ان میں بعض اپنے مریدں کو یہ وصیت کرنے لگ جاتے ہیں کہ "جب تم میں سے کسی کو کوئی حاجت پیش آئے تو اُسے چاہیے کہ وُہ مجھ سے فریاد خواہی کرے اور مجھ سے حاجت طلب کرے"، وُہ پیر یہ بھی کہتا ہے کہ "میں اپنی موت کے بعد بھی وُہ باتیں کر سکتا ہوں جو میں اپنی زندگی میں کیا کرتا تھا" اس بیچارے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شیاطین ہوتے ہیں جو اُن کی صورتیں اختیار کر لیتے ہیں، تاکہ اسے اور اس کے متبعین کو گمراہ کریں اور خُدا کے ساتھ شرک اور غیر اللہ سے دُعا و فریاد ان کو اچھا کام معلوم ہو، کبھی شیاطین پیر کے دل میں القا کر دیتے ہیں کہ "ہم تیری موت کے بعد بھی تیرے دوستوں (مریدوں) کی وہی گت بنائیں گے جو ہم تیری زندگی میں بناتے تھے"، وُہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ الہامِ الٰہی ہے، سو وُہ اپنے دوستوں کو اس کا حکم دیتا ہے۔

شیاطین ان پیروں میں سے بعض کی خدمت کرتے رہتے ہیں، اُن کے فریاد خواہ دوستوں سے باتیں کرتے اور ان کی مدد وغیرہ کرتے ہیں اور جب وُہ پیر مر جاتا ہے تو وُہ شیاطین ان میں سے کسی مرید کی طرف شیخ کی صورت میں آتے ہیں اور اُسے سمجھاتے ہیں کہ وُہ نہیں مرا اور اس کے دوستوں کی طرف خطوط بھی بھیجتے ہیں اس شیخ کے بعض مریدوں سے میری ملاقات بھی ہوتی تھی، وُہ زہد و عبادت کے پروانے تھے، مجھ سے بھی محبت کرتے تھے اور اس شیخ سے بھی محبت رکھتے تھے، وُہ ان باتوں کو کرامات شمار کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا شیخ (پیر) نہیں مرا۔ مجھے وُہ کلام بھی سناتے تھے جو اُن کے خیال کے مطابق اُن کے پیر نے مرنے کے بعد ان کے پاس بھیجا ہوتا ہے، جب وُہ اس کلام کو پڑھتے تھے تو میں معلوم کر لیتا تھا کہ یہ بعینہٖ شیاطین کا کلام ہے۔ خود میرے متعدد دوست آشناؤں نے مجھ سے ذکر کیا کہ انھوں نے مجھ سے فریاد خواہی کی تو مجھے ہوا میں اپنی طرف آتے ہوتے دیکھا اور انھوں نے دیکھا کہ میں اُن کے پاس پہنچا اور انہیں ان شدائد و مصائب سے نجات دلائی جنھوں نے اُن کو نصاریٰ ارمن کے احاطہ و محاصرہ کی صورت میں گھیر رکھا تھا، ایک دوسرے شخص نے مجھ سے ذکر کیا کہ دشمنوں نے اسے گھیر لیا اور اس کے پاس بعض دوستوں کے ملفوف خطوط تھے، اگر وُہ دشمن ان خطوں کو دیکھ پاتے تو اسے قتل کر دیتے۔ اس موقعہ پر اس کے خیال میں میں نے اس کی مدد کی اور اس مشکل سے نجات دلائی۔ میں نے اس سے ذکر کیا کہ مجھے تو اس ماجرا کے متعلق ہرگز علم نہیں، میں نے قسمیں کھا کھا کر اسے یقین دلایا کہ میں ان باتوں کو اپنی کرامات سمجھ کر چھپا نہیں رہا ہوں بلکہ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وُہ غیر مشروع اور ناجائز ہے۔ بلکہ وُہ شرک و بدعت ہے، بعد میں یہ حقیقت مجھ پر کھلی اور میں نے ان پر واضح کی کہ یہ شیاطین ہوتے ہیں

جو اس شخص کی صورت بن کر آجاتے ہیں، جس سے فریاد کی جاتی ہے۔ شیوخ کے بہت سے دوستوں نے مجھ سے کہا ہے کہ جن لوگوں نے اُن سے فریاد کی ہے، ان کے ساتھ یہی ماجرا ہوا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ حکایت کی ہے کہ انھوں نے مردوں اور زندوں دونوں سے فریاد کی اور یہی ماجرا نظر آیا۔ اور جب تک اُن پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوتی کہ یہ شیاطین ہیں اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے، وُہ انسان کو گمراہ کرتے ہیں، اس وقت تک یہ لوگ اسی فتنہ میں مبتلا رہتے ہیں، اگر یہ لوگ دین اسلام سے واقف نہ ہوں تو انہیں شرک ظاہر اور کفر محض کے گڑھے میں پھینک دیتے ہیں، اُسے حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرو، مجھے سجدہ کرو، میرے نام پر ہی ذبیحے کرو، مردہ جانور اور خون کھاؤ، اور بُرے بُرے کام کرو۔

جن ملکوں میں خالص کفر ہوتا ہے یا کفر بھی ہوتا ہے اور ضعیف سا اسلام بھی ہوتا ہے، اُن میں یہ واقعات کثرت سے ہوتے ہیں۔ اسلامی شہروں میں بھی جن جن مقامات کے باشندوں کے ایمان ضعیف ہو جائیں، یہ واقعات پیش آتے ہیں حتیٰ کہ مصر و شام میں بے شمار قسموں کی بدعات و ضلالات پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی تشریح بخوفِ طوالت نظر انداز کی جاتی ہے۔

ظہورِ اسلام سے پہلے تاتاریوں میں یہ رسوم بکثرت تھیں، جب ان میں اسلام کا ظہور ہوا اور وُہ اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو ان میں آثارِ شیاطین کم ہو گئے، اگر کوئی شخص مسلمان ہو اور ظلم و فواحش کو پسند کرتا ہو تو یہ شیاطین ظلم و فواحش میں اس کی اعانت کرتے ہیں، یہ نہایت کثرت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جن ملکوں میں اسلام و جاہلیت اور برّ و فجور، دوش بدوش موجود ہیں، اُن کی نسبت بھی اسلامی ملکوں میں یہ بات زیادہ پائی جاتی ہے۔

اگرچہ پیر میں اسلام اور دینداری ہو، لیکن شریعتِ نبویؐ کی حقیقت سے

پورے طور پر آگاہی نہ ہو، اُسے مجمل طور پر یہ معلوم ہو، کہ اولیاء کے لیے کرامات ہوتی ہیں، لیکن کمال ولایت اور انتہائے ایمان و تقویٰ سے اُسے آگاہی نہ ہو وُہ رسول صلعم کے اتباع ظاہری و باطنی سے ناواقف ہو، صرف اس کا مجمل سا علم رکھتا ہو، ایمان باطن کے حقائق اور اسلام کے ظاہری شرائع نہ جانتا ہو تو وُہ احوالِ رحمانیہ اور احوالِ نفسانیہ و شیطانیہ کے مابین فرق نہیں کر سکتا، جس طرح خوابوں کی تین قسمیں ہیں، ایک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، ایک خواب وُہ ہوتا ہے جو کوئی شخص عالمِ بیداری میں اپنے دل میں کوئی خیال کرے اور وُہ خواب میں اسے نظر آجائے اور ایک خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔

محض وقوفِ عرفات خدا کی عبادت نہیں ہے

احوال کی بھی یہی حالت ہے۔ جب دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت سے اس شخص کو کم واقفیت ہو تو شیاطین اسے کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو وُہ اس کا انکار نہیں کر سکتا، کبھی وُہ اُسے ہوا میں اٹھائے جاتے ہیں اور عرفات میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں، پھر اُسے اس کے شہر کی طرف لوٹاتے ہیں، حالانکہ وُہ اپنے عام کپڑوں میں رہتا ہے۔ میقاتوں کے محاذات میں پہنچنے کے وقت وُہ احرام نہیں باندھتا، ان چیزوں سے علیحدہ نہیں ہوتا جن سے احرام باندھنے والے کو علیحدہ ہونا ضروری ہے۔ وقوفِ عرفات کے بعد اسے یہ نہیں کہتے کہ طواف اضافہ کرو اور رمی جمار کر کے حج کی تکمیل کرو، وُہ خیال کرتا ہے کہ عرفات پر کھڑا ہونا ہی عبادت ہے جو کہ اس نے کر دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے دینِ اسلام سے بہت تھوڑی واقفیت ہے، اگر اسے دینِ اسلام سے واقفیت ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ یہ جو کچھ اُس نے کیا ہے، خدا کی عبادت نہیں ہے، ورنہ جو شخص اسے حلال سمجھے وُہ مرتد ہے اور اس کا قتل واجب ہے۔

مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ میقات کے پاس احرام باندھنا واجب ہے، احرام باندھنے والے شخص کے لیے حالتِ احرام میں عذر کے سوا کپڑے پہننا جائز نہیں ہے اور وقوف (کھڑا ہونا) کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ کہ طواف اضافی لابدی ہے۔ مشعر حرام کے پاس پہنچنا اور حجرِ عقبہ پر سنگریزے پھینکنا بھی لازمی ہے۔ البتہ اس میں اتنا اختلاف ہے کہ بعض اسے رُکن قرار دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ رکن نہیں بلکہ واجب ہے اور ایک جانور کی قربانی سے اُس کی تلافی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ ایامِ منیٰ میں بھی رمی جمار کی جائے کبھی ایسے شخص کو جن اٹھا کر لے جاتے ہیں اور بیت المقدس وغیرہ کی زیارت کرا لاتے ہیں، اسے ہوا میں اڑاتے ہیں، پانی میں چلاتے ہیں، اُسے دکھاتے ہیں کہ وُہ اسے اولیاؔ کے شہر کی طرف لے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی اسے دکھاتے ہیں کہ وُہ جنت کے میوے کھا رہا ہے اور اس کی نہروں سے پانی وغیرہ پی رہا ہے۔ یہ سب باتیں اور اس طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو میرے آشناؤں تک کو پیش آئی ہیں، لیکن یہ ایک طویل بات ہے جس کی تفصیل کا مقام یہ نہیں ہے۔

مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ دُنیا میں شرک کی اصل و بنیاد نیک آدمیوں کی عبادت رہی ہے، اُن کی مورتیں پُوجی جاتی تھیں لیکن مقصود عبادت وُہ ہوتے تھے شرک کی ایک قسم وُہ ہے جس کی اصل کواکب پرستی ہے۔ سورج چاند یا دیگر کواکب کے طلسماتی اصنام بنائے گئے۔ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے، قومِ ابراہیم کا شرک اسی قسم کا تھا، یا کم از کم اس قوم کا کچھ حصّہ اس طرح کے شرک کا حامل تھا۔

شرک کی ایک اور قسم ملائکہ یا جن کی پرستش ہے، اُن کے لیے اصنام وضع کیے جاتے تھے ورنہ نفس اصنام جمادیہ کی پرستش لذاتہٖ نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان اسباب

کے لیے پرستش ہوتی تھی جو اس کے مقتضی ہوتے تھے، عرب کا شرک یوں تو ان جمیع اقسام پر حاوی تھا، لیکن زیادہ تر وہاں قسم اول کا شرک رائج تھا عمرو بن لحی نے سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کا دین تبدیل کیا، شام میں آیا تو دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کے پاس بلقاء کے مقام پر اصنام رکھے تھے، جن سے جلب منافع کی استدعا کرتے اور مضرتوں کا دفعیہ کرتے تھے، یہ دیکھ کر اس نے بھی اسی طرح کے بت بنا کر مکہ میں رائج کیے۔ قریش سے پہلے ولایت کعبہ، قبیلہ خزاعہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس قبیلے کا سردار تھا۔ صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو اپنی انتڑیاں آگ میں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے" دینِ ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے اسی نے تبدیل کیا۔ بحیرہ[1] اور سائبہ کی رسم بھی سب سے پہلے اسی نے نکالی۔ قوم نوحؑ کا شرک اسی طرح کا تھا۔ واللہ اعلم، اگرچہ اس کا مبدا، نیک لوگوں کی پرستش تھی لیکن شیطان لوگوں کو اس پرستش سے دوسری قسموں کے شرکوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

قبروں میں نماز پڑھنے کی ممانعت کیوں ہوئی؟

بشر پرستی انسانوں سے زیادہ قریب ہے، کیونکہ وہ نیک آدمیوں کو پہچانتے ہیں، اُس کی برکت اور دُعا سے آگاہ ہوتے ہیں، اسی لیے اُس کی قبر پر گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی اس سے سوال کرتے ہیں اور کبھی اس کے توسط سے اللہ تعالیٰ کے آگے دُعا کرتے ہیں، اس

---

[1] بحیرہ اس کن پھٹی اونٹنی کو کہا جاتا تھا جسے مشرکینِ عرب بتوں کے نام پر کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے تھے اور پھر اس کو کوئی دوہ نہیں سکتا تھا۔ سائبہ بھی اسی طرح کی معمولی سانڈ ہوتی تھی جس سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ (مترجم بحوالہ ترجمۃ القرآن از مولانا نذیر احمد مرحوم)

کی قبر کے پاس دُعا کرنے کو مساجد و بیوت میں دعا کرنے کی نسبت بہتر و افضل سمجھتے ہیں۔

چونکہ یہ مبدا شرک تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دروازے کو بھی اسی طرح بند کر دیا جس طرح آپؐ نے کواکب پرستی کا دروازہ مسدود کیا تھا۔ صحیح مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے وفات سے پانچ روز پہلے فرمایا: "اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَهُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ فَاِنِّیْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ" (تم میں سے پہلے لوگ قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے۔ خبردار تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا میں تمھیں اس بات سے منع کرتا ہوں)

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اُن کی خدمت میں ملک حبش کے ایک گرجا کی خوبصورتی اور اُس کی تصاویر کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا ہے تو اُس کی قبر پر مسجد بنا ڈالتے ہیں اور اس میں یہ تصاویر بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوقات ہوں گے۔"

صحیحین میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض موت میں فرمایا، "لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ" (یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا دیا) جو کچھ انھوں نے کیا اسے ممنوع قرار دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر نمایاں کی جاتی۔ لیکن انھوں نے اس بات کو بُرا سمجھا کہ آپؐ کی قبر سجدہ گاہ بن جائے۔

مسند امام احمدؒ اور صحیح ابو حاتم میں مذکور ہے کہ سب لوگوں سے بُرے وہ

لوگ ہیں جن پر قیامت آجاتے گی اور وہ زندہ ہوں گے اور جو لوگ قبروں کو مسجدیں بناتے ہیں۔

سنن ابی داؤد وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِي عِيدًا وَصَلُّوا عَلَيَّ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِي" (میری قبر کو میلہ گاہ نہ بنانا اور جہاں کہیں ہو مجھ پر درود بھیجتے رہو کیونکہ تمہارا درود مجھے پہنچتا ہے)

مؤطا امام مالکؒ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِي وَثَنًا يُعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ" (اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ پوجی جاوے، جن لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنایا، ان پر اللہ تعالیٰ کا سخت قہر و غضب نازل ہوا!)

صحیح مسلم میں ہے کہ ابوالہیاج الاسدیؒ روایت کرتے ہیں کہ ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا "کیا میں تمہیں وہ کام تفویض نہ کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تفویض فرمایا ہے۔ آنحضرتؐ نے مجھے اس بات پر مامور فرمایا ہے کہ جہاں کہیں میں بلند قبر دیکھوں اُسے ہموار کردوں، جہاں کہیں مورت دیکھوں اس کو مٹا دوں، سو انھوں نے ابوالہیاج الاسدی کو اس بات پر مامور فرمایا کہ دونوں قسم کے بتوں کو ہٹا دیں۔ ایک وہ جو میّت کی صورت پر بنایا جاتے اور دوسرا وہ جو اُس کی قبر کے اُوپر کو اُٹھا ہُوا ہو۔ کیونکہ ان سے شرک پیدا ہوتا ہے۔

فتنۂ آثار و مشاہد اور اسوۂ سلف

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق ثابت ہے کہ ایک مرتبہ وہ سفر پر گئے تو انھوں نے ایک قوم کو دیکھا کہ باری باری سے ایک مکان میں

نماز کے لیے جاتے ہیں، آپ نے پُوچھا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اس مکان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو لوگ تم سے پہلے تھے وُہ اسی وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کے آثار کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ جو شخص نماز کے وقت اس مقام سے گزرے وُہ نماز پڑھ لے، اگر نماز کا وقت نہ ہو تو گزر جائے۔" پھر انہیں خبر ملی کہ کچھ لوگ اس درخت کی طرف جاتے ہیں جس کے نیچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ سے بیعت لی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کے کاٹ ڈالنے کا حکم دے دیا۔

ابو موسےٰؓ نے اُن کی خدمت میں یہ پیغام ارسال کیا کہ تستر میں دانیالؑ کی قبر ظاہر ہوئی ہے، اور اس کے پاس ایک مصحف (کتاب) ہے جس میں آئندہ کی خبریں ہیں اور جب اُن لوگوں پر خشک سالی آتی ہے تو وُہ اس قبر کو کھودتے ہیں تو اُن پر بارش ہو جاتی ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم بھیجا کہ دن کے وقت تیرہ قبریں کھودی جائیں اور رات کو "دانیالؑ"، اُن میں سے ایک میں دفن کر دیا جائے تاکہ نہ لوگ اسے پہچان سکیں اور نہ اس سے مبتلائے فتنہ ہوں۔"

اگر قبروں پر مسجدوں کی عمارتیں نہ بھی بنائی جائیں، جب بھی اُن کو سجدہ گاہ بنانا حرام ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ قبروں پر مسجدیں بنانا حرام ہے اور جو مسجد کسی قبر پر بنائی جائے اس کا منہدم کر دینا واجب ہے، اگر کسی میت کی قبر کسی مسجد میں بن چکی ہو اور اس پر مدت طویل گزر چکی ہو تو قبر زمین کے ساتھ ہموار کر دی جائے، حتیٰ کہ اس کی صورت ظاہر نہ ہو، کیونکہ جب قبر کا نشان ظاہر ہوتا ہے تو شرک کا بیج پھلنے پھُولنے لگتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ جہاں اب مسجد نبویؐ ہے، وہاں پہلے مشرکین کا مقبرہ تھا جس میں کھجور کے درخت اور تودہائے ریگ

تھے۔ قبریں اکھیڑ دی گئیں، درخت کاٹ دیے گئے اور ٹیلے ہموار کر دیے گئے اور مقبرے کی جگہ مسجد بنا دی گئی۔ چونکہ قبروں کا مسجدیں بنانا اور ان پر مسجد کی تعمیر کرنا حرام ہے اس لیے عہدِ صحابہ و تابعین میں اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ کسی کی قبر مسجد ہرگز نہیں بنی۔ جس غار میں حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام مدفون ہیں وہ مسدود ہے، اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا، اس کی طرف صحابہ شدِ رحال (سفر) نہیں کرتے تھے اور نہ اس کے سوا کسی اور قبر کی طرف جاتے تھے، کیونکہ صحیحین میں ابوہریرہ اور ابوسعید رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَ مَسْجِدِیْ هٰذَا" (تین مسجدوں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری اس مسجد کے سوا کسی اور مقام کی طرف سفر نہ کیا جائے) صحابہؓ میں سے جن کا ارادہ ہوتا تھا، وہ مسجدِ اقصےٰ میں آتے اور نماز پڑھ کر واپس چلے جاتے اور مغارۂ خلیل یا کسی اور مقبرے کی طرف نہیں جاتے تھے۔ پہلے مغارۂ خلیل بند رہا لیکن جب چوتھی صدی کے اواخر میں نصاریٰ نے شام پر قبضہ کیا تو انھوں نے دروازہ کھول دیا اور اس مقام کو کینسہ قرار دیا۔ پھر جب ان ملکوں کو مسلمانوں نے فتح کیا تو بعض لوگوں نے اسے مسجد بنا لیا، اور اہلِ علم اس کو بُرا سمجھتے تھے۔

حدیث اسراء کے متعلق یہ روایت جھوٹ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ یہ پاک جگہ ہے اتریئے اور نماز ادا کیجیے، اور وہ اترے اور انھوں نے نماز ادا کی یا یہ کہ یہ آپ کے باپ ابراہیم کی جگہ ہے، اتریئے اور نماز ادا کیجیے۔ اس رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ اقصیٰ کے سوا کہیں نماز نہیں پڑھی، جیسا کہ "صحیح" میں ثابت ہے اور اسی مسجد میں وہ اترے۔ یہی وجہ ہے

کہ شام میں اس قدر صحابہ آئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اُن کی تعداد شمار نہیں کر سکتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتح دمشق کے وقت آئے۔ پھر جب فتح شام کے بعد انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ جزیہ اور دیگر مشہور شرائط پر صلح کی۔ اس وقت آئے اور تیسری مرتبہ پھر آئے جبکہ وُہ سرغ تک پہنچے اور اُن کے ساتھ اکابر سابقین اولین یعنی مہاجرین وانصار موجود تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی مغارہ خلیل یا شام کے آثار انبیاء میں کسی اور مقام کی طرف نہیں گیا۔ بیت المقدس، دمشق اور دیگر مقامات میں بہت سے آثار تھے، جبل قاسیون کے مغرب میں ایک پہاڑی عیسےٰ علیہ السلام سے منسوب ہے۔ مشرق میں ایک مقام ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہے اور اُس کے وسط میں اُوپر کے حصّے کی طرف مغارہ دم (غار خون) ہے، جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس مقام پر قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔ ان مقامات اور اس طرح کے دیگر مقامات کی طرف پہلے لوگ نہیں جایا کرتے تھے، ان مقامات کی نہ زیارت کرتے تھے اور نہ ان سے کسی برکت کی امید رکھتے تھے، کیونکہ وُہ شرک کے مقام تھے اور وہاں بہت سے شیاطین موجود تھے، بہت سے لوگوں نے بصورتِ انسان دیکھا ہے کہتے ہیں کہ ان شیاطین کے قبضے میں رجال الغیب (غیب کی خبریں لانے والے رجال) ہیں، ان کا خیال ہے کہ وُہ انسان ہیں لیکن آنکھوں سے پوشیدہ ہیں، حقیقت میں وُہ جن ہیں اور جنوں کو بھی رجال کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا	انسانوں میں سے کچھ لوگ بعض جن لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے جس سے جنوں کا غرور بڑھ گیا۔

انسان اس لیے انس کہلاتے ہیں کہ وُہ دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا۔ | میں نے آگ دیکھی۔

اور جن اس لیے جن کہلاتے ہیں کہ وُہ آنکھوں سے پوشیدہ اور مستتر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْہِ اللَّیْلُ۔ | جب رات نے اُسے چھپا لیا (یعنی اُس پر رات چھا گئی اور اسے ڈھانپ لیا۔

کوئی انسان، انسانوں کی آنکھوں سے ہمیشہ مستور نہیں رہتا۔ بعض انسان البتہ بعض حالات میں مستور ہو جاتے ہیں لیکن یہ کرامت، سحر یا عمل شیطان کے باعث ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان فرق بیان کرنے کا مقام دُوسرا ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ صحابہ و تابعین نے کسی نبی یا نیک آدمی کی قبر پر ہرگز مسجد نہیں بنائی اور نہ اُسے مشہد و مزار بنایا۔ نبیوں کی فرودگاہ، نماز پڑھنے یا کوئی اور کام کرنے کی جگہ یا کسی قسم کے دوسرے آثار انبیاء پر اس لیے مسجد بنانے کا ارادہ نہیں کیا گیا کہ وُہ انبیاء و صالحین کے آثار ہیں۔ جس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کا قصد نہ فرمایا ہو بلکہ اتفاقاً وہاں اتر پڑے ہوں اور نماز ادا کر دی ہو، جمہور مسلمین نماز کا قصد نہیں کرتے تھے بلکہ ائمۂ مسلمین حضرت عمر بن الخطابؓ وغیرہ ایسے مقام پر نماز کا قصد کرنے سے منع فرماتے تھے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً پڑھی ہو۔

حضرت ابن عمرؓ کے متعلق منقول ہے کہ وُہ اس جستجو میں رہتے تھے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں کہاں چلے ہیں، اس مقام پر وُہ بھی چلتے تھے اور جہاں آپ نے نزول فرمایا ہو وہاں وُہ بھی اترتے اور نماز پڑھتے تھے، اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد یہ نہ ہو کہ اُس مقام پر وُہ یہ کام کریں گے بلکہ اتفاقاً

وُہ کام ہو گیا ہو۔ حضرت ابنِ عمرؓ ایک نیک مرد تھے، اتباع میں تشدد اور انتہا پسند تھے۔ ان کی راستے میں یہ بات بھی اتباع تھی، لیکن اُن کے والد اور سارے صحابہؓ، خلفائے راشدین، عثمان و علی اور تمام عشرۃ المبشرینؓ، ابن مسعودؓ معاذ بن جبل اور ابی بن کعب وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین ابن عمرؓ کی طرح نہیں کرتے تھے اور جمہور کا قول زیادہ صحیح ہے۔

متابعتِ صحیحہ کی تعریف

متابعت اس بات کا نام ہے کہ جس طریق پر اور جس غرض سے متبوع نے کوئی کام کیا ہو، اسی طرح اور اسی غرض سے وُہ کام کیا جائے جب وُہ کسی معین جگہ میں نماز و عبادت کا قصد کرے تو اُس مکان میں نماز و عبادت کا قصد کرنا اس کی متابعت ہے، لیکن اگر اس نے اُس جگہ کا قصد نہ کیا ہو تو اس کا قصد کرنا اس کی متابعت نہیں بلکہ مخالفت ہو گی، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ مزدلفہ پر اور جمرتین کے مابین کھڑا ہونے اور ذکر و دُعا فرمانے کا قصد فرمایا ہے اس لیے ان جگہوں کا قصد کرنا رسُول کی متابعت ہے۔ اسی طرح چونکہ آپ نے طواف فرمایا اور مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی ہے اس لیے یہ کام کرنا اُس کی متابعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفا و مروہ پر ذکر و دُعا کے لیے چڑھے، اس لیے اس کا قصد بھی اتباعِ رسولؐ ہے۔

سلمہ بن الاکوع قصداً ستون کے پاس نماز پڑھتے تھے، کیونکہ وُہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کے پاس قصداً نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ سو چونکہ اُنھوں نے آنحضرتؐ کو نماز کے لیے اُس جگہ قصد کرتے دیکھا ہے، اس لیے نماز کے لیے اُس جگہ کا قصد کرنا متابعت ہے۔ اسی طرح جب عتبان بن مالک نابینا ہو گئے تو انھوں نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میری آرزو ہے کہ آپ میرے پاس تشریف لائیں اور میرے ڈیرے پر نماز پڑھیں اور میں اس جگہ کو اپنی جائے نماز مقرر کر لوں۔

ایک روایت میں ہے کہ عتبان بن مالک نے درخواست کی کہ آپ تشریف لائیں اور میرے لیے مسجد کا نقشہ بنائیں۔ سو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور اُن کے ساتھ چند صحابہ بھی تھے، اور ایک روایت میں یوں ہے کہ عتبان بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ "دوسری صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، حضرت ابوبکر صدیقؓ اُن کے ہمراہ تھے، دن اچھا خاصا چڑھ چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اُن کو اجازت دی، جب وُہ گھر میں داخل ہوئے، تو ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نے فرمایا کہ تمہارے گھر کے کس حصے میں میں نماز پڑھوں؟ میں نے گھر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوتے اور اُن کے پیچھے ہم سب کھڑے ہو گئے اور انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیرا۔" (الحدیث)۔

عتبان بن مالک رضؓ نے اس بات کا قصد کیا کہ مسجد تعمیر کریں، ان کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں نماز پڑھیں اور اس مقام پر مسجد تعمیر کریں جہاں آپؐ نے نماز پڑھی ہو۔ مقصود مسجد بنانا تھا، ارادہ یہ تھا کہ جس جگہ مسجد بنے اس جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھیں، نماز کا قصد مسجد کے لیے کیا گیا۔ تعمیرِ مسجد کا قصد اس لیے نہیں کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اتفاقاً نماز پڑھی ہے، اس مکان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا قصد کیا تاکہ وُہ مسجد بن جائے، اس لیے اس میں نماز کا قصد کرنا رسول اللہ

کی متابعت ہے، لیکن اگر قصد کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاقاً نماز ادا کر دی ہو تو اُس مقام پر قصداً نماز ادا کرنا متابعت نہ ہو گی۔

دو شنبہ اور جمعرات کو قصداً روزہ رکھنا متابعت ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو دنوں کے روزوں کا قصد کیا تھا۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر جمعرات اور دو شنبہ کو جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اُس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ البتہ جس شخص کو اپنے بھائی کے ساتھ دشمنی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ دونوں باہم صلح نہ کر لیں، اُس وقت تک انتظار کرو۔

مساجدِ ثلاثہ اور مسجدِ قبا

مسجد قبا میں بھی ارادۃً نماز پڑھنا متابعت ہے، کیونکہ صحیحین میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شنبہ کو قبا میں سوار ہو کر اور پیدل تشریف لایا کرتے تھے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ۔

البتہ جو مسجد پہلے دن سے تقویٰ کے اساس پر بنائی گئی ہے وُہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں نماز کے لیے کھڑے ہو۔

مسجد نبویؐ اس وصف کی زیادہ مستحق تھی۔ "صحیح" میں ثابت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ مسجد موسس علی التقویٰ کونسی ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ وُہ میری مسجد ہے"۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ مسجدِ نبویؐ۔ اس وصف میں مسجد قبا کی نسبت زیادہ

کامل ہے اور مسجد قبا بھی موسس علی التقوٰے ہے اور اس کے متعلق آیت نازل ہوئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فِيهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔	اس میں ایسے مرد ہیں جو پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اہلِ قبا باوضو رہتے اور ہمیشہ غسل کرتے تھے، پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے اور یہ طریقہ انھوں نے اپنے ہمسایہ یہود سے سیکھا تھا، عرب اس طرح نہیں کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال گزرا کہ لوگ یہ خیال نہ کر بیٹھیں کہ صرف مسجدِ قبا موسس علی التقوٰے ہے مسجد نبویؐ نہیں ہے تو آپؐ نے ذکر فرمایا کہ اُن کی مسجد اس وصف کی زیادہ مستحق ہے۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى۔ مسجدِ نبویؐ، مسجدِ قبا اور تمام دُوسری مساجد پر صادق ہے، جن کی بنیاد تقوٰی پر ہوتی ہے نہ کہ ضرار پر۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین ایسی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے تھے جس میں ضرار کا شبہ ہو اور وُہ عتیق (پرانا) کو جدید سے افضل سمجھتے تھے، کیونکہ عتیق میں جدید کی نسبت اس بات کا احتمال کم ہے کہ وُہ ضرار پر مبنی ہو، جدید میں اس کا خطرہ رہتا ہے۔ مسجد کا عتیق ہونا اچھا ہوتا ہے، اس لیے فرمایا:

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ	پھر اُن کے حلال کرنے کی جگہ پُرانا گھر ہے۔

اور فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ۔	سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے وُہ مکہ ہی میں ہے۔

یہ اس لیے ہے کہ اس کا پرانا ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ اس میں عبادت زیادہ ہوئی ہے۔ نیز پرانا ہونا اس کی زیادتِ فضل کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے سلف نے مدینہ اور دوسرے مقامات سے باشندوں کا مسجد نبوی کے بعد مسجد قبا کے سوا اور کسی مسجد یا مزار کی طرف بالقصد جانا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کا بالتعین قصد نہیں کیا۔ مدینہ میں بہت سی مسجدیں تھیں، ہر ایک قبیلے کی جدا مسجد تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے میں کسی خاص مسجد کو دوسری مساجد پر فضیلت نہیں تھی، البتہ مسجدِ قبا مدینہ کی اولین مسجد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصداً اس کی طرف گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر یہ قول مروی ہے کہ "جو شخص اپنے گھر میں وضو کر کے صرف نماز کے ارادے سے مسجدِ قبا میں آئے، اُسے عمرے جیسا ثواب ملے گا۔" بایں ہمہ اس کی طرف سفر نہ کیا جائے لیکن جب انسان مدینہ میں موجود ہو تو اس کی طرف آئے، اُس کی طرف انشاء سفر کا قصد نہ کرے انشاء سفر کا قصد صرف تین مسجدوں کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسٰجِدَ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا" (تین مسجدوں مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی کے سوا کسی اور جگہ کا قصدِ سفر نہ کیا جائے) اسی لیے اگر مسجدِ قبا کی طرف جانے کی نذر مانی جائے تو ائمہ اربعہ اور دوسرے اماموں کا یہی قول ہے کہ وہ نذر پوری نہ کی جائے۔ مسجدِ حرام کی طرف سفر کرنے کی نذر مانی جائے تو اس کا پورا کرنا باتفاقِ ائمہ واجب ہے اور اُن کے اصح قول کے مطابق مسجدِ نبوی اور بیت المقدس کا بھی یہی حکم ہے، امام مالک،

امام احمد کا مذہب یہی ہے اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی اسی کا مؤید ہے اور امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ان کے سفر کی نذر پوری کرنا واجب نہیں ہے۔ البتہ جائز و مستحب ہے، کیونکہ اُن کی اصل یہ ہے کہ نذر صرف اس چیز کی واجب ہے جو شرعاً واجب ہو اور اکثر کا قول ہے کہ اُن تمام چیزوں کی نذر پوری کرنا واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں داخل ہوں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ نَذَرَ اَنْ يُّطِيْعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ وَمَنْ نَذَرَ اَنْ يَّعْصِىَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهٖ" (جو شخص یہ نذر مانے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا، اُسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی چاہیئے اور جو شخص یہ نذر مانے کہ وہ اس کی نافرمانی کرے گا تو یہ نذر پوری نہ کرے۔)

بقیع کی قبروں اور شہداء جنگِ اُحد کی قبروں کی زیارت اس غرض سے مستحب ہے کہ ان کے لیے دُعا کی جائے اور مغفرت مانگی جائے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ قصد فرمایا کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بات تمام مسلمان مُردوں کے لیے مشروع ہے، چنانچہ اُن پر سلام بھیجنا، اُن کے لیے دُعا کرنا اور مغفرت مانگنا مستحب ہے۔ اسی قصد سے زیارتِ قبور مستحب ہے اور اس میں انبیاء و صالحین اور دوسرے مسلمانوں کی قبریں برابر ہیں۔ جب عبداللہ بن عمر رضؓ مسجد میں داخل ہوتے تو کہا کرتے تھے "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَا بَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَتِ" (اے رسول اللہ آپ پر سلام، اے ابوبکر رضؓ آپ پر سلام، اے میرے باپ آپ پر سلام) یہ کہہ کر واپس چلے جاتے۔

لیکن انبیاء و صالحین کی قبروں کی زیارت اگر اس غرض سے کی جائے کہ ان سے حاجات طلب کی جائیں، اُن سے دُعا کی جائے اور انہیں اس بات کی قسمیں دی جائیں کہ وُہ خدا کے حضور میں اُن کی سفارش کریں یا یہ خیال ہو کہ

ان کی قبروں کے پاس دُعا کرنا یا نماز پڑھنا مسجدوں اور گھروں میں دُعا کرنے یا نماز پڑھنے کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتا ہے، ائمۂ مسلمین کا اتفاق ہے کہ یہ بات گمراہی، شرک اور بدعت ہے۔ صحابہؓ میں سے کوئی ایسا نہیں کرتا تھا، جب وُہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتے تو کھڑے ہو کر اپنے لیے دُعا نہیں کرتے تھے اس لیے امام مالک اور دیگر علماء نے اس بات کو مکروہ سمجھا ہے، کیونکہ وہ بدعت ہے۔ سلف صالحین نے ایسا فعل کبھی نہیں کیا۔ ائمہ اربعہ اور دیگر سلف صالحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب کوئی شخص دُعا کرنے کا ارادہ کرے، وُہ سب قبلے کی طرف منہ کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی طرف منہ نہ کرے لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجے تو ان میں سے اکثر کا قول ہے کہ قبر کی طرف منہ کرے، امام مالکؒ، امام شافعی اور امام احمد کا یہی قول ہے حضرت ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ قبلہ کی طرف بھی منہ کرے اور قبر بائیں طرف ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پیٹھ قبلہ کی طرف ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے جبل ثور کی غار کی طرف گئے، یہ غار مدینہ کی راہ میں نہیں تھی بلکہ یمن کی جانب کو تھی اور مدینہ شام کی سمت کو ہے، لیکن وُہ تین دن تک اُس غار میں روپوش رہے تاکہ مشرکین کو ان کی خبر نہ مل سکے اور انہیں یہ نہ معلوم ہو سکے کہ وُہ دونوں کس طرف گئے ہیں؟ مشرکین انہیں ڈھونڈھ رہے تھے اور اُن کو ڈھونڈنے والے کو اُن کی دیت انعام دینے کا اعلان کر دیا گیا تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دوستوں کے پاس مدینے پہنچنے سے روکا جائے اور انہیں مکہ سے نہ نکلنے دیا جائے، بلکہ جب وُہ اُن کے قتل سے عاجز آ گئے تو اُن کو مکہ میں محبوس رکھنے کا قصد کیا، اگر ابتداء ہی آنحضرتؐ راستے

پر چلتے رہتے تو پکڑے جاتے، اس لیے وُہ تین دن غار میں رہے۔ مکہ سے مدینے جانے والا مسافر اگر اس غار کی طرف جائے اور وہاں سے واپس آنے کا ارادہ کرے تو یہ مستحب نہیں بلکہ مکروہ ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت میں ساحل کے راستے گئے تھے۔ یہ راستہ لمبا ہے اور اس میں چکر ہے لیکن وُہ عمرے اور حج کے لیے سیدھے راستے چلتے تھے جو مکہ کے قریب تر ہے۔ ہجرت کے موقع پر آپ ساحل کے راستے سے گئے کیونکہ وُہ مشرکین کے قصد سے بعید تر تھا، وسط کا راستہ مدینہ کی طرف کا قریب ترین راستہ ہے، اس لیے اُن کو خیال ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی راستے سے مدینہ گئے ہوں گے، اسی طرح جب وُہ کسی غزوے کا ارادہ کرتے تھے تو لشکر کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کا مالِ غنیمت جعرانہ میں تقسیم کیا تو اس مقام سے عمرہ کیا اور جب مشرکین نے انہیں مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو وُہ حدیبیہ میں اُترے اور عمرے کا احرام مدینہ کی میقات ذوالحلیفہ سے باندھ چکے تھے اور جب آئندہ سال عمرۂ قضاء ادا کیا تو انھوں نے ذوالحلیفہ سے احرام باندھا اور کعبہ کے اندر نہ حج میں داخل ہوتے اور نہ عمرہ میں۔ بلکہ اس دن داخل ہوئے جس دن مکہ فتح ہوا اور اُن کے داخل ہوتے ہی تصاویر کعبہ محو کر دی گئیں۔

کسی فعل کی مشروعیت کے لیے قصد شارع شرط ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں دو رکعت نماز ادا کی، فتح کے دن آپ نے چاشت کے وقت آٹھ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ اُمّ ہانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ

چاشت کی نماز کا قصد بدوں کسی سبب کے نہیں کرتے تھے، مثلاً سفر سے آئے، مسجد میں داخل ہوتے اور دو رکعتیں پڑھ لیں، یا کبھی نیند اور مرض کے باعث قیامِ لیل سے قاصر رہے اور دن میں بارہ رکعت نماز ادا کر دی، رات کو آپؐ گیارہ رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے سو وقتِ وتر کے فوت ہو جانے کی معذرت کے طور پر بارہ رکعت پڑھتے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مغرب دن کی نماز کا وتر اس لیے رات کی نماز کو بھی وتر کرو۔ اور رات کی آخری نماز وتر ہو" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ رات کی نماز دو دو رکعت پڑھو اور جب صبح قریب آجائے تو وتر ایک رکعت پڑھ لو"

سلف سے ماثور ہے کہ جب وُہ وتر کی نماز پڑھنے کے بغیر سو جاتے تھے، تو وُہ صبح کی نماز سے قبل وتر پڑھ لیتے تھے اور ما بعد الصلوۃ تک انہیں موخر نہیں کرتے تھے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی نماز کبھی نہیں پڑھی اور میں پڑھتی رہتی ہوں۔ وُہ کئی کام کرنے پسند کرتے تھے لیکن اس خوف سے نہیں کرتے تھے کہ لوگ انہیں کرنے لگ جائیں اور مبادا اُن پر فرض ہو جائیں "صحیح" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ابوہریرہ اور ابو درداءؓ کو چاشت کی دو رکعتوں کی وصیت کی اور اس کے بارے میں احادیث موجود ہیں، لیکن یوم فتح میں جو آٹھ رکعتیں پڑھی گئی ہیں، انہیں بعض علماء نے چاشت کی نماز قرار دیا ہے اور دُوسرے علماء کہتے ہیں یہ آٹھ رکعتیں صرف یومِ فتح میں پڑھی گئی ہیں اس لیے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آٹھ رکعتیں فتح کے باعث پڑھی ہیں۔ اور علماء اس امر کو مستحب سمجھتے تھے کہ کسی شہر کے فتح ہونے کے وقت امام

فتح کے دن آٹھ رکعتیں شکریہ کے طور پر پڑھے اور اسے وُہ "صلوٰۃ الفتح" سے موسوم کرتے ہیں، وُہ کہتے ہیں کہ اتباع میں قصد کا اعتبار کیا جاتا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کا قصد وقت کے لیے نہیں کیا تھا اور اگر وُہ وقت کا قصد کرتے تو ہر روز یا اکثر ایام میں یہ نماز پڑھا کرتے جس طرح وُہ فجر کی دو رکعتیں ہر روز پڑھا کرتے تھے، اسی طرح وُہ ظہر کے بعد دو رکعتیں اور اس سے قبل دو یا چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور اگر ظہر کے بعد اُن کی دو رکعتیں فوت ہو جاتیں تو وُہ عصر کے بعد انہیں پُورا کرتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب غزوۂ خیبر میں سوئے رہے اور نمازِ فجر اُن سے فوت ہوگئی تو انھوں نے طلوعِ آفتاب کے بعد دو دو رکعتیں دو مرتبہ پڑھیں۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ نماز ہمیشہ کے لیے فجر کے وقت کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ انھوں نے یہ نماز بطورِ قضا پڑھی تھی، ایامِ خندق میں ایک مرتبہ آپؐ کی عصر کی نماز فوت ہو گئی تو آپ نے اسے غروبِ آفتاب کے بعد ادا کیا۔ ایک روایت ہے کہ آپؐ کی ظہر کی نماز بھی فوت ہو گئی تو آپ نے پہلے ظہر کی نماز ادا کی، پھر عصر کی اور پھر مغرب کی نماز پڑھی "کسی نے نہ کہا کہ مغرب و عشاء کے مابین گیارہ رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے کیونکہ یہ نماز قضا تھی، بلکہ آپؐ سے کسی نے یہ نقل ہی نہیں کی کہ آپؐ نے عشائین کے مابین کوئی نماز مخصوص کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول "نَاشِئَةَ اللَّيْلِ" ۲۹ : ۱۳) (رات کا اُٹھنا) اکثر علماء کے نزدیک اس نماز کے متعلق ہے جو نیند کے بعد کوئی شخص اُٹھ کر پڑھے۔ اس سے مراد اول شب کی نماز نہیں ہے اور یہی قول درست ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی رات کے وقت نماز پڑھا کرتے تھے اور اس کے متعلق متواتر احادیث موجود ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیند کے بعد اُٹھا کرتے تھے

عشاءین کے مابین یہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔

اکل و شرب اور اتباعِ رسول ؐ

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کھانا ملتا تھا، کھا لیتے اور جو پہننے کی چیز موجود ہوتی وہ پہن لیتے تھے۔ یہ چیزیں یا تو مدینہ طیبہ میں موجود ہوتی تھیں یا یمن وغیرہ ممالک سے آتی تھیں۔ کھجور، جو کی روٹی، تازہ میوے، سبز خربوزہ اور ککڑی کھاتے اور یمن کے کپڑے پہنتے تھے، کیونکہ کھانے اور پینے کی یہی چیزیں اُن کو اپنے شہر میں میسر آسکتی تھیں، اُن چیزوں کی خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استعمال کے لیے داعی نہیں ہوتی تھی، اس لیے اگر کسی دوسرے شہر یا ملک میں گندم، جوار، انگور، انار وغیرہ خوراک میسر آتی ہو اور یمن کے بُنے ہوئے کپڑوں کی جگہ کوئی اور کپڑے دستیاب ہوتے ہوں تو جو شخص اپنے شہر کی خوراک، میوے اور لباس چھوڑ کر تکلف و عسرت کے ساتھ دُوسری اشیائے خوردنی و پوشیدنی مہیا کرنے کا قصد کرے، وُہ متبع رسولؐ نہ ہوگا، خواہ وُہ چیزیں جو بہ تکلف مہیا کی جائیں، کھجور، چھوہارے یا جو کی روٹی ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔

سو معلوم ہوا کہ متابعتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں قصد و نیت کا لحاظ لابدی ہے "فَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى" (اعمال نیات پر منحصر ہیں اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اُس نے نیت کی ہوگی)

معلوم ہوا کہ جس مسئلے پر جمہور و اکابر صحابہؓ کا اتفاق ہے، وہی صحیح ہے اور اُس کے باوجود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اس جگہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ جس جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول و قیام کی جگہ پر نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور نہ کوئی صحابیؓ اس غار

کی زیارت یا اس میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے تھے جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے حالانکہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھی (ابوبکرؓ) تین دن اُس غار میں رہے اور پانچوں وقت اسی غار میں نمازیں پڑھتے رہے۔ حرا کی طرف بھی صحابہؓ نہیں جایا کرتے تھے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوّت سے پہلے اس میں عبادت کیا کرتے تھے اور سب سے پہلے اسی مقام میں آپؐ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اسلام سے پہلے باقی لوگ بھی یہاں عبادت کرتے تھے۔ حرا اس مقام کی بلند ترین پہاڑی ہے۔ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اوپر دس سال مکہ شریف میں رہ چکے تھے اور اس کے بعد کئی مرتبہ وُہ مکہ تشریف لے گئے لیکن حرا کی طرف نہ وُہ خود تشریف لے جاتے تھے اور نہ آپؐ کے اصحابؓ جاتے تھے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کرتے تھے تو رکنِ یمانی سے استلام کرتے تھے اور رکنِ شامی سے نہیں کرتے تھے، کیونکہ شام کے دونوں رکن قواعدِ ابراہیمؑ پر تعمیر نہیں ہوئے۔ حجر کا اکثر حصّہ بیت اللہ میں داخل ہے۔ حجرِ اسوَد سے استلام بھی کرتے اور بوسہ بھی دیتے تھے، رکنِ یمانی سے استلام کرتے لیکن اسے بوسہ نہیں دیتے تھے۔ مقامِ ابراہیم میں نماز پڑھتے تھے لیکن استلام وتقبیل نہیں کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رکنِ یمانی کے سوا کعبہ کی دیواروں میں سے کسی سے تمسح کرنا اور حجرِ اسود کے سوا کسی اور جگہ کو بوسہ دینا سنت نہیں ہے اور نہ مقامِ ابراہیمؑ کا استلام وتقبیل سنت ہے، جب خود کعبہ اور مقامِ ابراہیمؑ کا یہ حکم ہے تو باقی ساری مسجدوں کی حرمت تو کعبہ سے کم ہے۔ شام میں بھی ایک مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ لیکن یہ مقام اور اس کے علاوہ دیگر انبیاءؑ کے مقامات اس مقام سے کم درجہ رکھتے ہیں جس کے متعلق اللہ تعالےٰ

لیے فرمایا ہے :

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى۔	مقامِ ابراہیمؑ کو نماز گاہ بناؤ۔

سو معلوم ہوا کہ جس طرح سارے مشاہد کا حج یا استلام وتمسّح نہیں کیا جاتا اس طرح سارے مقامات کا نماز کے لیے قصد نہیں کیا جائے گا۔ مقاماتِ انبیاء ومساجد اور چٹانوں وغیرہ کو بوسے نہیں دیے جاتے اور حجرِ اسود کے سوا رُوئے زمین کی کسی اور جگہ کو بوسہ نہیں دیا جا سکتا۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ شریف میں مسجدِ حرام کے سوا اور کسی مسجد میں نماز نہیں پڑھی، اور مشاعرِ منیٰ، مزدلفہ اور عرفہ کی طرف عبادت کے لیے نہیں آیا کرتے تھے، اسی لیے ائمہ علماء کا یہی مسلک ہے کہ مکہ شریف میں مسجدِ حرام کے سوا کسی اور مسجد کا نماز کے لیے قصد کرنا مستحب نہیں ہے اور جن مشاعر کا قصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اُن کے سوا کسی اور جگہ کی زیارت کا قصد نہ کیا جائے۔

جب انبیاء وصالحین کے آثار کے متعلق یہ حکم ہے تو مقابر کا حکم کس قدر شدید ہوگا جنھیں مسجد بنانے والے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اور خبر دی ہے کہ وُہ قیامت کے دن سارے لوگوں سے بُرے ہوں گے۔ دینِ اسلام یہ ہے کہ مسجد کے سوا کوئی جگہ نماز کے لیے مقصود نہ ہو۔ اس لیے مشاعرِ حج کا قصد، مناسکِ حج کے لیے کرنا چاہیے نہ کہ نماز کے لیے۔ عرفہ میں کوئی نماز مشروع نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یومِ عرفہ کو ظہر وعصر کی نماز عرفہ میں پڑھی لیکن وُہ اس لیے کہ وہاں خطبہ پڑھا، پھر نماز پڑھی اور پھر نماز کے بعد عرفات کی طرف گئے اور وہاں کھڑے ہوئے، اسی طرح عرفات میں، مزدلفہ میں قزح کی

پہاڑی پر، صفا و مروہ پر، جمروں کے درمیان، رمی کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور دُعا کی جاتی ہے اور نماز کے لیے ان مقامات کا قصد نہ کیا جاتے۔ مساجد اور مشاعر حج کے سوا نہ نماز کے لیے کسی مقام کا قصد کیا جاتے اور نہ ذکر و دُعا کے لیے بلکہ جہاں کہیں نماز کا وقت آجاتے، وہیں نماز پڑھ لی جائے۔ البتہ جن مقامات میں نماز پڑھنا ممنوع ہے وہاں نہ پڑھی جاتے اور جس مقام پر آسانی ہو، وہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے اور اُس سے دُعا و مناجات کی جاتے۔ کسی خاص جگہ کی تعیین نہ کی جاتے۔

مشاہد وغیرہ میں سے کوئی جگہ نماز کے لیے مخصوص کرنا ایسا ہی منع ہے، جیسا مقبرے میں نماز پڑھنا منع ہے۔ میت پر سلام دینے کے وقت اُس کے لیے اور مسلمانوں کے لیے دُعا کر دی جاتے تو البتہ جائز ہے۔ یہ دُعا اس طرح ہونی چاہیے جس طرح جنازے کی نماز میں کی جاتی ہے۔ قبر مومن کی زیارت صلوٰۃِ جنازہ کی جنس سے ہے اور جو کچھ زیارتِ قبر میں کیا جاتا ہے وُہ بھی اس کی جنس سے ہے جو کہ جنازے میں کیا جاتا ہے۔ دُعا سے وہاں بھی وہی مقصد ہوتا ہے جو یہاں ہوتا ہے۔

جمرۂ عقبہ سے پرلی طرف ایک وادی ہے، اس میں عقبہ کی رات کو انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی، کیونکہ وُہ ایک پست جگہ ہے، جو شخص اس میں ہو وُہ لوگوں کی نظروں سے مستور رہتا ہے۔ ستر انصار نے اپنی مشرک قوم کی معیت میں حج کیا تھا، کیونکہ اسلام سے پہلے اور پیچھے ہمیشہ لوگ مکہ کا حج کرتے رہے ہیں۔ سو وُہ اپنی قوم کے ہمراہ حج کے لیے منیٰ کی طرف آتے اور رات کے وقت اس جگہ وادی عقبہ والیں آجاتے۔ لیکن وُہ اس مقام کی کسی فضیلت کے باعث یہاں نہیں آتے تھے، بلکہ اس لیے آتے تھے

کہ وُہ پردے کی جگہ تھی۔ کسی فضیلت کے باعث انھوں نے اس کی تخصیص و تعیین کا قصد نہیں کیا۔ اسی لیے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے صحابہ رض حج کرتے تھے تو وُہ اس مقام کی طرف نہیں جاتے تھے۔ اور نہ اس کی زیارت کرتے تھے۔ وہاں مسجد بن چکی ہے، لیکن وُہ بعد کے زمانے میں بنی ہے۔ مسجد حرام کے سوا مکہ اور اس کے نواح میں جس قدر مسجدیں بنی ہیں وُہ بعد کی بنی ہوئی ہیں۔ خود منیٰ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی مسجد بنی ہوئی نہیں تھی، لیکن آپ نے فرمایا دمنیٰ میں جو شخص پہلے آجائے۔ یہ اُسی کی جگہ ہے، مسلمان وہاں ڈیرے لگاتے تھے اور آپ مسلمانوں کے ساتھ منیٰ اور غیر منیٰ میں نماز پڑھتے تھے آپ کے بعد آپ کے خلفاء بھی اسی طرح کرتے۔ حاجیوں کا جس قدر اجتماع منیٰ میں ہوتا ہے، اتنا کسی اور جگہ نہیں ہوتا وہ اس مقام پر چار دن رہتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ اور عمرؓ منیٰ اور غیر منیٰ میں لوگوں کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے اور منیٰ، عرفہ اور مزدلفہ میں قصر کیا کرتے تھے اور مزدلفہ میں ظہر و عصر اور مغرب وعشاء کو جمع کر لیتے تھے۔ سارے حاجی خواہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا کسی اور جگہ کے، اُن کے ساتھ نماز پڑھتے اور مشاعر میں سارے کے سارے قصر کرتے تھے اور عرفہ و مزدلفہ میں سارے جمع کرتے تھے۔

علماء نے اہل مکہ اور اس کی طرح کے مقامات کی نسبت اختلاف کیا ہے کہ وہاں قصر یا جمع کی جائے یا نہ؟ کہا گیا ہے کہ وُہ قصر نہ کریں اور نہ جمع کریں۔ اصحاب شافعیؒ واحمدؒ کا یہی قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لوگ جمع کریں لیکن قصر نہ کریں۔ یہ قول ابوحنیفہؒ، احمدؒ اور اُن کے اور شافعیؒ کے اُن دوستوں کا ہے جنھوں نے اُن سے موافقت کی ہے۔ یہ قول بھی ہے

کہ جمع بھی کریں اور قصر بھی۔ یہ قول مالک، ابن عیینہ، اسحٰق بن راہویہ، احمد کے بعض اصحاب اور دیگر سلف کا ہے اور یہی درست ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ اہلِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز یہاں جمع و قصر کرکے پڑھی ہے۔

صلوٰۃِ قصر کی مشروعیت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ یا عمرؓ نے منیٰ یا عرفہ یا مزدلفہ میں یہ نہیں کہا کہ اہلِ مکہ اپنی نماز پوری کر لو۔ ہم مسافر لوگ ہیں۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ نے جوفِ مکہ میں یہ کہا تھا، "سنن" میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ انھوں نے جوفِ مکہ میں غزوۂ فتح میں یہ فرمایا تھا اور یہ اس امر کی قوی ترین دلیل ہے کہ قصر ہر مسافر کے لیے مشروع ہے، اگرچہ اس کا سفر ایک برید (منزل) ہو۔ عرفہ، مکہ سے ایک برید یعنی بارہ میل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفاء نے مکہ شریف میں نمازِ عید نہیں پڑھی بلکہ دُوسرے سفروں میں بھی آپ نے عید کی نماز کبھی نہیں پڑھی اور نہ انھوں نے کسی سفر میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز اس طرح پڑھائی کہ پہلے خطبہ پڑھا ہو اور اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھی ہو، بلکہ جس طرح اور دنوں میں دو رکعت نماز (سفر میں) پڑھتے تھے، اسی طرح جمعہ کے دن بھی پڑھتے تھے۔ اسی طرح جب وُہ عرفہ میں ظہر و عصر پڑھتے تھے تو دیگر ایام کی طرح دو رکعت ہی پڑھا کرتے تھے۔ کسی نے یہ روایت نہیں کی کہ آنحضرتؐ نے سفر میں جمعہ کی نماز کی قرأۃ عرفے یا کسی اور دن میں با جہر پڑھی ہو۔ سفر میں جمعہ کے دن عرفہ کے بغیر آپؐ نے خطبہ کبھی نہیں پڑھا۔

معلوم ہوا کہ جمہور سلف، ائمہ اربعہ اور دیگر علمائے امت کا یہی مسلک

سنہ ہے کہ مسافر جمعہ وغیرہ کی نماز نہ پڑھے، جمہور امت کے نزدیک یہ ہے کہ سفر میں عید بھی نہ پڑھی جائے۔ مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور احمدؒ کی ایک روایت اسی طرح ہے۔ یہی درست ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف مقام پر عید کی نماز پڑھا کرتے تھے، سفر میں نہیں پڑھتے تھے اور ایک ہی جگہ باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ امام مسلمانوں کو لے کر صحرا کی طرف لے جاتا تھا اور وہاں نمازِ عید پڑھاتا تھا اور سارے مسلمان اس کے پیچھے پڑھتے تھے۔ کوئی مسلمان قبیلے کی مسجد میں یا اپنے گھر میں عید کی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ جمعہ کی نماز بھی قبائل کی مسجدوں میں نہیں پڑھی جاتی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے خلفاء کے زمانے میں کوئی شخص قربانی کے دن کی عید کی نماز مکہ میں نہیں پڑھتا تھا، بلکہ ان کی عید مشعر حرام سے اتر کر منیٰ میں ہوتی تھی اور اُن کے لیے جمرہ عقبہ کی رمی شہروں کے سارے لوگوں کی نماز عید کی طرح ہے۔ وہ رمی کرنے کے بعد قربانی شروع کر دیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ سے چل کر محصّب (سنگریزے بچھانے کی جگہ) میں اترتے تھے۔

آنحضرتؐ کے اصحاب کا اس بات میں باہم اختلاف ہے کہ آیا تحصّب (سنگریزے بچھانا) سنت ہے یا نہیں؟ اور یہ اختلاف اس اختلاف پر مبنی ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے محصّب میں اترنے کا قصد فرمایا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ آپ اس میں اس لیے اترے کہ وہاں سے نکلنا سہل تر تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک متابعت میں مقاصد معتبر ہے۔

عمرۂ قضا میں حکم "رمل فی الطواف" کی علم

جب آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عمرۂ قضاء ادا

کیا تو اس وقت مکہ شریف مشرکین کے قبضے میں تھا، ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ مشرکین مکہ کو یہ خیال تھا کہ ارضِ یثرب کے بخار نے مسلمانوں کو ضعیف و ناتوان کر دیا ہوگا۔ چنانچہ مشرکین قعیقعان یعنی جبلِ مردہ کے پیچھے بیٹھ کر مسلمانوں کی طرف دیکھنے لگے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ تین طواف کود کود کے اور دوڑ دوڑ کے کریں تاکہ مشرکین پر ان کی صحت و توانائی اور پھرتی اور چالاکی کی دھاک بیٹھ جائے۔ روایت ہے کہ جنھوں نے اس طرح کود کود کر طواف کیا، ان کے حق میں آنحضرتؐ نے دُعا فرمائی تھی۔ رکنوں کے مابین رمل نہیں کیا گیا، کیونکہ اس جانب سے مشرکین نہیں دیکھتے تھے، اس وقت رمل (کود کود کر طواف کرنا) سے جو امر مقصود تھا وُہ مقصودِ جہاد کا ہم جنس تھا، اس لیے بعض متقدمین کا خیال ہے کہ رمل مناسکِ حج میں داخل نہیں، کیونکہ یہ خاص قصد سے کیا گیا تھا اور اب وُہ قصد زائل ہو گیا ہے۔

لیکن "صحیح" میں ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب جب حج کرتے تھے تو حجرِ اسود سے حجرِ اسود تک رمل کرتے تھے اور دونوں رکنوں کے مابین رمل کو پورا کرتے تھے۔ اور یہ حصّہ اس رمل سے زائد ہے جو عمرۂ قضاء میں کیا گیا تھا۔ آپؐ نے حجۃ الوداع میں بھی اسی طرح کیا، حالانکہ اس وقت آپؐ کے ساتھ حج کرنے والے صرف مسلمان تھے اور امن کا زمانہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ رمل، حج کی سنت بن گیا تھا۔ پہلے وُہ مقصودِ جہاد کے لیے کیا گیا تھا۔ اور بعد میں مناسکِ حج میں داخل ہو گیا، جس طرح سعی ہاجرہ اور رمی جمار اور ذبح کبش کے متعلق روایت ہے کہ اوّل اوّل خاص مقصود کے لیے یہ فعل کیے گئے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں شرائع حج میں داخل فرما دیا اور عبادت بن گئے، لیکن یہ اس وقت تو اِنے

اللہ تعالیٰ اُسے مشروع کر دے اور اُس کا حکم کر دے، جس بات کو اللہ تعالیٰ نے مشروع نہ کیا ہو، اس کو مشروع کرنے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ جس طرح کعبے کے گرد سات مرتبہ طواف کیا جاتا ہے اسی طرح میں صخرہ کے گرد طواف کرنا مستحب قرار دیتا ہوں اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مقام ابراہیم کو مصلّے بناؤ۔ اسی طرح میں مقام موسیٰ و عیسیٰ کو مصلّیٰ بنانا پسند کرتا ہوں تو یہ بات اس کے لیے جائز نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی جن جن وجودوں کو مختص کرنا چاہتا ہے، مختص کرتا ہے اور افعال اُن احکام کے ساتھ ہوتے ہیں جو کسی وجود سے مخصوص ہوں اور اُن احکام کے ساتھ کسی دوسرے وجود کو اس پر قیاس کرنا منع ہے۔ اس کی وجہ اکثر اہل علم کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی وجود کسی خاص معنی (حقیقت) کے لحاظ سے مختص ہوتا ہے جو دوسرے وجود میں نہیں پایا جاتا۔ اور بعض علماء کے نزدیک اس اختصاص کی وجہ محض تخصیص مشیت ہے، جیسا کہ حج و طواف کے لیے کعبہ، کھڑے ہونے کے لیے عرفات، رمی جمار کے لیے منیٰ، تحریم کے لیے اشہر الحرام (عزت والے مہینے) اور صیام و قیام کے لیے ماہِ رمضان مخصوص ہیں۔

ابراہیم و محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام دونوں اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست) ہیں۔ صحاح میں متعدد وجوہ سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِیْ خَلِیْلًا کَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلًا" (جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو دوست بنایا ہے، اس طرح مجھے بھی دوست بنایا ہے)

صحیح میں ثابت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "یَا خَیْرَ الْبَرِیَّةِ" (اے بہترینِ مخلوقات) تو آپ نے فرمایا کہ "وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں" ابراہیم علیہ السلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے بعد ساری مخلوقات سے افضل ہیں۔ آپؐ کا یہ فرمانا کہ خیر البریہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، بطور تواضع ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح میں ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا، "انا سید ولد آدم ولا فخر آدم فمن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ ولا فخر" (میں سردار بنی آدم ہوں اور یہ فخر کے طور پر نہیں کہہ رہا، آدم علیہ السلام اور اُن کے نیچے کی ساری مخلوقات قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گی اور یہ بھی محض اظہار حقیقت ہے، نمود و غلو نہیں)

اس کے علاوہ اور بہت سی نصوص ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل المخلوقات اور اپنے پروردگار کے نزدیک ساری مخلوقات سے زیادہ عزیز و مکرم ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وُہ امام ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا۔	میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

اور وُہ اُمّۃ یعنی قدوہ (مقتدا) ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيفًا۔	ابراہیم علیہ السلام لوگوں کے پیشوا ہو گزرے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے تھے جو اسی کے ہو رہے تھے۔

آپؑ وہی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف میں جگہ دی اور حکم دیا کہ لوگوں کو حج کی دعوت دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اور اسماعیل علیہ السلام کی زبان پر حرمتوں کی تحریم قائم کی، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ان کی معیت میں نبی بنایا جو ذبیح ہیں، جنھوں نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دی تھی۔ جو امتحان میں ثابت قدم رہے جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ بدلائل کثیرہ بیان کر

آستے ہیں، اُن کی ماں بی بی ہاجرہ وُہ جلیل القدر خاتون ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ابراہیم کی اطاعت ایسی حالت میں کی جب وُہ بے یار و مددگار اپنے بیٹے کے ہمراہ ایک وادی میں پڑے تھے، جیسا کہ حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔

اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی کچھ اولاد تیرے معزز گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لاکر بسائی ہے جہاں کھیتی باڑی نہیں ہے۔

ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو محبت تھی ان میں اطاعتُ عبادت کا جو پُر گداز ذوق تھا اور خُدا کے ساتھ جس قدر اُن کا ایمان راسخ تھا۔ وُہ ان کے سوا دوسرے لوگوں میں نہیں تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کے بنائے ہُوئے گھر کو وُہ خصائص عطاء فرمائے جو اس کے سوا کسی اور گھر میں نہیں پائے جاتے۔ اُن کے افعال کو لوگوں کے لیے نمونہ اور واجب الاتباع عبادت قرار دیا اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سعی، رمی جمار اور وقوفِ عرفات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے مشروع فرمائے اور یہ اس وقت مشروع فرمائے جس وقت بی بی ہاجرہ اور اسماعیل علیہما السلام کا معاملہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ اور ذبح اسماعیل وغیرہ واقعات صفحۂ دہر پر نہ مٹنے والی یادگار قائم کر چکے تھے۔ یہ مناسکِ ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی اسی طرح مشروع ہوئے تھے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رمل فی الطواف مشروع ہُوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں میں حجِ بیت اللہ

کی منادی کریں، حج کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عاجزی اور خضوع کیا جاتے۔ اسی لیے اس کا نام "نسک" کے ساتھ مخصوص ہُوا ہے۔

لفظ "نسک" کی تحقیق

نسک، لغت میں عبادت کو کہتے ہیں، جوہری کا قول ہے کہ "نسک" عبادت کو اور "ناسک" عابد کو کہتے ہیں۔ قَدْ نَسَكَ یا قَدْ تنسّک کے معنی ہیں، قَدْ تَعَبَّدَ (اس نے عبادت کی) اور نَسُكَ کے معنی ہیں وُہ ناسک (عابد) بنا، پھر نسک کا لفظ حج کے لیے مخصوص ہوگیا، کیونکہ جس قدر حج میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں بندوں کی عاجزی وانقیاد کا اظہار ہوتا ہے اتنا اور کسی عبادت میں نہیں ہوتا۔ اس لیے اس میں بعض افعال ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے حضور میں عاجزی کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ مثلاً رمل، رمی الجمار کہ ان سے امتثالِ امر کے سوا اور کچھ مقصود نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رمی جمار اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کے احکام اس لیے مشروع ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر قائم کیا جائے "إِنَّمَا جُعِلَ رَمْيُ الْجِمَارِ وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ لِإِقَامَةِ ذِكْرِ اللهِ" (رواه الترمذی)

ذبح فدیہ بھی حج کے ساتھ مخصوص ہوگیا، لیکن مطلق ذبح کرنا مخصوص نہیں ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے خون بہانا اس کی عبادت اور اس کے سامنے عاجزی کا ایک ایک بلیغ تر مظہر ہے۔ اسی لیے ہم سے پہلے لوگ نذر و نیاز کھایا نہیں کرتے تھے، بلکہ آسمان سے آگ آیا کرتی تھی جو اُسے کھا جاتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا	جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے اللہ تعالیٰ نے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک کوئی

بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ، قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔

رسول ہمارے سامنے کوئی ایسی نذر و نیاز نہ لائے جسے آگ کھا جائے ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے اے پیغمبر ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر پیغمبر آئے اور جو بات تم نے کہی ہے وہ بھی لائے تو پھر اُن کو تم نے کیوں قتل کر دیا؟ یہی تمہاری صداقت ہے؟

اسی طرح جب مال غنیمت حاصل کرتے تھے تو اسے جمع کر کے رکھ دیتے تھے۔ پھر آگ آیا کرتی تھی تو اُسے کھا جاتی تھی۔ تاکہ اُن کا قتال، مالِ غنیمت کے لیے نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اُن کا ذبیحہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، نہ کہ اُن کے کھانے کے لیے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر اُن کے کمالِ یقین و اخلاص کی وجہ سے فراخی کر دی گئی اور یہ امر مسلّم ہو گیا کہ یہ امت خواہ غنیمت کا مال استعمال کرے یا نذر و نیاز کھائے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہاد کرتی اور اسی کی رضا کے لیے ذبح کرتی ہے۔

شیطان و اصنام کی پرستش کرنے والے بھی اپنے معبودوں کے لیے جانور ذبح کیا کرتے تھے، معبود کے لیے کسی جانور کو ذبح کرنا اس معبود کے سامنے عابد کی بدرجہ غایت عاجزی دولت کا اظہار ہے اسی سے غیر اللہ کے لیے ذبیحہ جائز نہیں اور نہ یہ بات جائز ہے کہ ذبیحوں پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اس ذبیحے کو حرام کیا ہے جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جائے، یعنی یہ کہ غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے۔ نیز وہ ذبیحہ بھی حرام ہے جس پر

خدا کے نام کے سوا اور کوئی نام لیا جائے، اگرچہ اس سے قصد گوشت کھانا ہو۔ نذر نیاز نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو غیر اللہ کے لیے ذبح کرے۔

آپ نے جنوں کے ذبیحوں سے منع فرمایا، اُن وقتوں میں رواج ہو گیا تھا، کہ جنوں کے لیے جانور ذبح کیے جاتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس ذبیحے کو مطلقاً حرام کیا ہے، جس پر اللہ کا نام ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس پر کتاب و سنت کی متعدد نصوص دال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔	اپنے پروردگار کے لیے قربانی کرو اور نماز پڑھو۔

یعنی اپنے پروردگار کے لیے قربانی کرو جس طرح حضرت ابراہیم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔	میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، اور میرا مرنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

جب حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ شریف کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ان دونوں نے کہا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا۔	اے ہمارے پروردگار، ہم سے قبول کر تو سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار، اور ہم دونوں کو اپنے سامنے سرفگندہ کر دے اور ہماری اولاد کو بھی اپنا فرماں بردار گروہ بنا دے، اور ہمیں

مشاعر حج سکھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ۔

اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے عبادت کے طریقے قائم کر دیئے ہیں، جن پر وہ چلتے ہیں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْاَنْعَامِ۔

ہم نے ہر امت کے لیے طریق عبادت مقرر کر دیا ہے تاکہ مویشی چارپائے جو اس نے انھیں دے رکھے ہیں، اُن پر وہ اللہ کا نام لیا کریں۔

اور فرمایا:۔

لَن يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ

اللہ تعالیٰ کے پاس اُن قربانیوں کے گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتے اس کے پاس صرف تمہارا تقوٰے پہنچتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ۔

اور جس شخص نے اُن چیزوں کا ادب ملحوظ رکھا جو اللہ سے نامزد ہو گئی ہیں تو اسے اپنی فلاح پر مسرور و مطمئن ہونا چاہیے کیونکہ یہ دلوں کے تقوٰے کی علامت ہے۔

مقصود یہ ہے کہ دلوں میں اللہ تعالیٰ کا تقوٰی (ڈر) ہو اور تقوٰے کے معنی یہ ہیں، کہ صرف ایک خدا کی عبادت ہو اور کسی کی نہ ہو اور عبادت سے غرض

غایت اس کی عبودیت (غلامی) ہو۔ عبودیت میں انتہائی محبت، بدرجۂ غایت عاجزی وانکسار اور اخلاص کے معنی ہیں۔ یہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کا مسئلہ ہے اور اس سارے مسئلے سے واضح ہوتا ہے کہ اصل الاصول دلوں کی عبادت ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ" (جسم میں ایک پارۂ گوشت ہے، جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور سنو کہ وہ پارۂ گوشت، قلب ہے)

نیت وقصد دل کے عمل ہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں نیت وقصد کا لحاظ لابدی ہے۔

کیا علاج بالاحتجام مسنون ہے؟

یہ بات بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احتجام (بدن پر پچھنے لگوانا) کیا، اس کا حکم بھی دیا، اور صحیح حدیث میں فرمایا کہ میری امت کی شفا پچھنہ لگانے، شہد پینے یا آگ کے ساتھ داغ دینے میں ہے۔ اور میں اپنے لیے اکتوا کا علاج پسند نہیں کرتا۔"

یہ معلوم تھا کہ پچھنے سے مقصود زائد خون کا اخراج ہے جو بدن کے لیے مضر ہے۔ اور یہی مقصود ہے۔ احتجام (پچھنا) کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ گرم ممالک میں خون بدن کی سطح پر نکل آتا ہے اور پچھنے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس لیے حجاز اور اس کی طرح کے گرم ممالک میں پچھنے سے استفراغ خون کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور سرد ممالک میں خون رگوں میں گھس جاتا ہے اس لیے فصد وغیرہ کے ذریعے رگیں کاٹنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ بات حس و

تجربہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈے موسم میں بدن کے اندرونی حصے گرم ہو جاتے ہیں اور ظاہر والے حصے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، کیونکہ کسی چیز کے مشابہ چیز اُس کی طرف کھنچ کر چلی جاتی ہے۔ جب ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے، اجسام اور زمین کا وُہ حصہ جو ہوا سے ملاقی ہوتا ہے، ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور اُن اجسام میں جو حرارت ہوتی ہے وُہ اپنی ضد یعنی سردی سے بھاگ کر اجسام کے اندرونی حصوں میں چلی جاتی ہے، اس لیے باطن ارض اور اجوافِ حیوانات گرم ہو جاتے ہیں، حیوان سردی کے مارے گرم جگہوں میں پناہ لیتے ہیں۔ سردی میں انسان زیادہ کھانا کھاتا ہے اس لیے کہ اندرونِ جسم میں حرارت زیادہ ہوتی ہے اور وُہ کھانے کو پکاتی اور اُسے گردش میں لاتی ہے۔ موسم سرما میں چشموں کا پانی گرم ہوتا ہے، کیونکہ جوفِ زمین میں سخونت و حرارت ہوتی ہے۔ خون گرم ہوتا ہے اس لیے موسم سرما میں رگوں میں ہوتا ہے، سطح جلد میں نہیں ہوتا، اگر پچھنہ لگایا جائے تو اُسے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات الٹا نقصان ہوتا ہے اور موسم گرما اور ممالکِ حارہ میں اجسام کے بیرونی حصے گرم ہوتے ہیں، اندر کے حصے ٹھنڈے ہوتے ہیں، اس لیے جس طرح موسم سرما میں کھانا ہضم ہوتا ہے، اس طرح گرمیوں میں نہیں ہوتا۔ اندرونِ زمین سرد ہوتا ہے، اس لیے چشموں اور کنوؤں کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور حیوانات سخونتِ ہوا کے لیے خشکی میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اس موسم اور ان ممالک کے لوگوں کو فصد نافع نہیں بلکہ مضر ہوتا ہے، اس لیے ان کے لیے پچھنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث "شِفَاءُ اُمَّتِیْ الخ" کا اشارہ اس امت کی طرف ہے جو اس وقت موجود تھی، اور وُہ صرف حجاز میں تھی جس طرح آپ نے فرمایا، "مشرق و مغرب کے مابین قبلہ ہے۔" اُس وقت ان کا قبلہ یہی تھا

کیونکہ اس وقت مسلمان مدینے اور اس کے مضافات میں تھے۔ اسی طرح جب نویں یا دسویں سال حج فرض ہو چکا تو تین میقاتیں مقرر ہوئیں، ایک مدینہ کے لیے، ایک نجد کے لیے اور ایک شام کے لیے اور جب یمن فتح ہوا تو اہل یمن کے لیے یلملم کی میقات مقرر ہوئی، پھر اہلِ عراق کے لیے ذاتِ عرق کی میقات مقرر ہوئی۔ اسی طرح مسلمان مردوں اور عورتوں پر خواہ وُہ چھوٹے ہوں، خواہ بڑے کھجور یا جو کی ایک صاع کے برابر صدقۂ فطر فرض ہُوا، یہ فرض اہلِ مدینہ پر تھا، کیونکہ جو اور کھجور اُن کی خوراک تھی۔ اسی لیے جمہور علماء کا یہ خیال ہے کہ جن لوگوں کی خوراک چاول اور جوار ہوں، وُہ ان میں سے صدقۂ فطر نکالیں، امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ جب جو اور کھجور کسی شخص کی خوراک نہ ہو تو اُس کے لیے اس میں صدقۂ فطر نکالنا جائز ہے یا نہیں۔ اس مسئلے کے متعلق علماء کے دو[۲] قول ہیں۔

آلاتِ حرب اور اتباعِ سلف

صحابۂ کرام تیر اندازی کے لیے عربی کمان استعمال کرتے تھے جو بہت لمبی اور دھنتے کی کمان کے مشابہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے اُسی کے ذریعے اُن سے ملک فتح کرائے۔ آثار مروی ہیں کہ بعض سلف فارسی کمان سے تیر اندازی کرنا اس لیے مکروہ سمجھتے تھے کہ وُہ کفار کا شعار تھی۔ لیکن جب مسلمان اُس کے عادی ہو گئے تو اُن میں اس کا رواج بہت ہو گیا اور عربی کمان کی نسبت یہ قوس جہاد میں زیادہ نافع بھی ہے تو علماء کا مشہور ترین قول یہ ہے کہ وُہ مکروہ نہیں رہی، کم از کم اکثریت علماء تو اسی طرف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم | اور اُن کے لیے جس قدر سامان تیار کر

مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ | سکتے ہو، کرو۔ سپاہیانہ قوت پیدا کرو اور گھوڑے باندھ رکھو۔

اور بلاشبہ اس فارسی کمان میں قوت زیادہ ہے۔ صحابہؓ کے پاس یہ موجود نہیں تھی۔ اس لیے اُن کو لامحالہ عربی کمان استعمال کرنی پڑی، اس کے سوا اُن کے پاس کوئی تھی ہی نہیں۔

اب دیکھا جائے گا کہ تیراندازی سے اُن کا کیا قصد تھا، کیا وُہ اس لیے اس کے ساتھ تیراندازی کرتے تھے کہ ان کے پاس اس کے سوا اور موجود نہیں تھی یا اس میں کوئی ایسی حقیقت تھی جس کے باعث اس کے ساتھ تیراندازی مقصود تھی؟ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ جو شخص اس کے ساتھ تیراندازی کرنا بُرا سمجھتا ہے کس حقیقتِ لازمہ کے باعث بُرا سمجھتا ہے جس طرح کفر یا وُہ چیز جو مستلزم کفر ہو بُری سمجھی جاتی ہے یا وُہ اس تیراندازی کو شعارِ کفار سمجھتا اور اُن سے تشبہ کرنا مکروہ سمجھتا ہے، جس طرح کفار یہود و نصاریٰ زرد اور نیلی غیار[ا] پہنتے تھے۔ اس لیے اس کا پہننا ممنوع قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اُن کے ساتھ تشبہ ہوتا تھا۔ اگر وُہ کپڑا اس صفت (تشبہ) سے خالی ہو جائے تو مکروہ نہیں ہے۔ جن ملکوں میں یہ پارچات کفار کے سوا اور کوئی نہیں پہنتا وہاں اُن کے پہننے کی ممانعت ہے اور جہاں مسلمان اُن کے پہننے کے عادی ہو چکے ہیں وہاں اُن کے پہننے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی وجہ سے امام احمد نے لباسِ سواد کو مکروہ سمجھا، کیونکہ اس میں ظالموں اور اُن کے معاونین سے تشبہ ہوتا تھا، آپ نے ان لوگوں کے ہاتھ اس کپڑے کو بیچنا بھی مکروہ قرار دیا ہے جو اسے پہن کر ظلم پر مدد حاصل کرتے ہیں۔

[ا] غیار، یہود کا خاص قومی لباس تھا۔ جسے وُہ مونڈھے کی جگہ ٹانکتے تھے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص قومِ یہود سے ہے۔ (مترجم بحوالہ منتخب اللغات)

لیکن جب اس کپڑے میں برائی کوئی نہ ہو تو یہ ممنوع نہیں۔

بعض صحابہ و تابعینؓ نے خراجی زمین کا بیچنا مکروہ سمجھا، کیونکہ اس زمین کا خریدار جب اس کا خراج ادا کرتا ہے تو التزامِ جزیہ میں ذمی لوگوں کا مشابہ ہو جاتا ہے خراج، زمین کا جزیہ ہوتا ہے اور اگر وہ اسے ادا نہ کرے تو وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے کیونکہ وہ اُن کے حقِ ارضی کو ساقط کرتا ہے۔ یہ زمین وقف ہونے کی وجہ سے مکروہ نہیں ہے، کیونکہ وقف کا بیع ممنوع ہے اور بیع سے وقف باطل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقف کا بیع، ہبہ اور ورثہ نہیں ہو سکتا اور خراجی زمین بہ اتفاقِ علماء وارث کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اس کا ہبہ جائز ہے۔ متّہب اور مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوتے ہیں اور اس کا خراج ادا کرتے ہیں، اور اس کی بیع میں مستحقینِ خراج کے لیے کوئی نقصان نہیں جیسا کہ بیع وقف میں ہے۔ بہت سے فقہاء نے غلطی کھائی اور یہ خیال کیا کہ خراجی زمین کی بیع اس کے وقف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

ان کو اس معاملے میں اس لیے اشتباہ پیدا ہوا کہ انھوں نے اس کی بیع کی کراہت میں بہت سے آثار مرویہ دیکھے اور انہیں معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے انہیں فے[1] قرار دیا ہے اور انہیں تقسیم بالکل نہیں کیا۔ اور یہ وقف کے معنی میں ہے۔ سو انہیں خیال گزرا کہ اس کی بیع اس حقیقت کے باعث مکروہ ہے اور انہوں نے کما حقہ غور نہ کیا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بیع اس بیع کی جنس سے نہیں ہے جس کی وقف میں ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ اس میں بیع سے قبل اور بعد اُس کی آمدنی اس کے مستحق کی طرف لوٹ جاتی ہے اور اس میں بلحاظ کم وکیف کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ یہ اُس گھر کی طرح نہیں ہے جو اگر فروخت کر

[1] جو زمین یا جائداد مسلمانوں نے فتح کی ہو، اُسے "فے" کہتے ہیں۔ (مترجم)

دیا جائے، تو اس کا نفع اہلِ وقف سے جاتا رہتا اور مشتری کو مل جاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب یہ بات ہے کہ ان لوگوں میں سے ایک جماعت کہتی ہے کہ مکہ کی زمینوں کا بیچنا اس لیے مکروہ ہے کہ وہ جنگ سے فتح ہوئیں اور تقسیم بھی نہیں کی گئیں، حالانکہ وہ سارے لوگوں کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ارضِ عنوہ جو ارض نفے قرار دی گئی ہے، اس کے سکونتی مقامات کی بیع جائز ہے اور خراج کھیتوں پر لگایا گیا ہے نہ کہ رہنے کی جگہوں پر۔ اگر مکہ کی زمین مسلمانوں کے لیے قرار دی جاتی اور اس پر خراج لگایا جاتا تو اس کے مساکن کی بیع اس طرح ممنوع نہ ہوتی۔ لیکن یہ کیونکر ہوتا، جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے مزارع و مساکن اس کے باشندوں کے ہاتھوں میں حسبِ دستور سابق رہنے دیے اور انہیں تقسیم نہ کیا۔ اور اُن پر خراج نہ لگایا، اسی لیے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مکہ امن و صلح سے فتح ہوا ہے۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ وہ جنگ سے فتح ہوا ہے، جیسا کہ اس پر احادیثِ صحیحہ متواترہ دال ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے اہلِ مکہ کو آزاد کر دیا تھا اور جو شخص آپ سے جنگ نہیں کرتا تھا، اُسے قتل نہیں کرتے تھے، اُن کی اولاد کو قید نہیں کیا، ان کا مال نہیں لوٹا، اسی لیے ان لوگوں کا نام طلقاء (آزاد) رکھا گیا۔

اور امام احمد وغیرہ سلف صالحین نے اس کی یہ علت بتائی ہے کہ ایک تو یہ جنگ سے فتح ہوا اور دوسرے وہ مسلمانوں کے مابین مشترک بھی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔

اور اس مسجدِ حرام سے لوگوں کو روکتے ہیں جسے ہم نے سب لوگوں کے لیے مشترک بنایا ہے، خواہ وہ اس کے اندر رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا ہو۔

یہ علت صرف مکہ کے لیے مختص ہے۔ دوسرے شہروں کی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مکہ شریف کا حج سارے لوگوں پر واجب کیا ہے۔ اس کے اعتماد کو ہمیشہ کے لیے مشروع کر دیا۔ اور اسے اپنے سارے بندوں میں مشترک قرار دیا، جیسا کہ سَوَآءً نِ الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ سے ظاہر ہے، اسی لیے منیٰ اور دیگر مشاعر کے متعلق ارشادِ نبوی ہے کہ "جو شخص ان میں سے کسی جگہ پہلے پہنچ جائے، اس کا اس جگہ پر زیادہ حق ہے حتیٰ کہ وُہ وہاں سے چلا جائے"۔ مسجدوں اور خود مکہ کی یہی حالت ہے جو شخص ان میں سے کسی مکان میں پہلے پہنچ گیا، اس مقام پر اُس کا حق راجح ہو گیا۔

جب تک انسان کو اپنے مساکن کی ضرورت رہے، اس وقت تک اس کا ان پر زیادہ حق ہے اور جب منافع سے وُہ مستغنی ہو جائے، اس کا عوض کے بغیر دوسرے حاجیوں وغیرہ پر خرچ کر دینا واجب ہے۔ اس لیے اس کے گھروں کے اجارہ اور اس کی زمینوں کی بیع کے متعلق تین قول ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہ گھروں کا اجارہ جائز ہے اور نہ زمینوں کی بیع۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں باتیں جائز ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ زمینوں کی بیع جائز ہے اور ان کا اجارہ جائز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو آثار منقول ہیں، اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ صحابہؓ اپنے گھروں کی بیع و شرا کیا کرتے تھے۔ گھروں کا ورثہ جائز ہے۔ اور ہبہ کیے جا سکتے ہیں اور جب اُن کا ورثہ و ہبہ جائز ہے تو بیع بھی جائز ہے، وقف کا یہ حکم نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی بیع، ورثہ یا ہبہ جائز نہیں، اسی طرح ام الولد اُسے کہتے ہیں جس کی بیع، ہبہ اور ورثہ جائز نہ ہو، اُن کے اجارہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ وُہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں سوائب کہلاتی تھیں، یہی مکانوں

اور زمینوں کے اجارے کا حکم ہے، جس کو ضرورت ہو وُہ ان میں رہے۔ اور جو مستغنی ہو وُہ دوسروں کو ابسادے، کیونکہ سارے مسلمانوں کو منافع کی ضرورت ہے۔ سو مکانات واراضی کے منافع بھی بازاروں، مسجدوں اور راستوں کے منافع کی طرح ہو گئے، جن کی ضرورت مسلمانوں کو پڑتی ہے، اس لیے جو شخص ان میں سے کسی چیز کے پاس پہلے پہنچ جائے اس کا حق مقدم ہو جاتا ہے اور جاننا اس کی ضرورت سے بچ جائے وُہ عوض کے بغیر کوئی اور لے لے۔ یہی حکم اُن مباحات کا ہے جن میں لوگ مشترک ہوں، اُن کا مشتری صرف اس قدر فائدہ حاصل کرتا ہے کہ جب تک اسے ضرورت ہو اسے دوسروں کی نسبت مبیعہ پر زیادہ حق حاصل ہے اور جب انہیں انسان بیچ دے تو اُن کے ساتھ اس کا اختصاص اور توریث وغیرہ حقوق وتصرفات منقطع ہو جاتے ہیں۔ البتہ یہ حق باقی رہتا ہے کہ وُہ عوض کے بغیر کسی کو نہ دے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ پر احسان کیا اور اسیر پر مصلحۃً احسان کرنا جائز ہوتا ہے۔ آپؐ نے انہیں اس کے ساتھ ان کی اولاد و اموال بھی واپس کر دیے اسی طرح قبیلہ ہوازن کا ایک طائفہ مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور احسان کی درخواست کی تو آنحضرتؐ نے اُن سے فرمایا "تمہیں اپنے عیال واطفال واپس لینے کی ضرورت ہے یا مال واسباب؟" انھوں نے عیال واطفال پسند کیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اُن کی یہ درخواست منظور کر لی حالانکہ اس سے قبل قبیلۂ ہوازن کا مالِ غنیمت اور عیال واطفال مجاہدین میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جن جن مجاہدین نے اپنا حصّہ واپس دینے پر رضامندی ظاہر نہ کی، ان کو آپؐ نے اُس کے حصّے کا عوض دے کر قبیلۂ ہوازن کے عیال و اطفال اُن سے آزاد کرا دیے۔

جس طرح ہوازن آپ صلعم سے لڑے تھے اُس طرح قریش نہیں لڑے تھے۔ آپ نے اُن قریش پر احسان فرمایا جو اُن سے لڑے نہ تھے، چنانچہ اعلان کر دیا کہ "جس نے اپنا دروازہ بند کر دیا وُہ مامون ہو گیا، جس نے اپنا ہتھیار ڈال دیا وُہ بھی مامون ہو گیا۔ اور جو شخص مسجد میں داخل ہو گیا وُہ بھی مامون ہو گیا۔"

سو جب جمہور آپ کے ساتھ جنگ کرنے سے رک گئے اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ وُہ مسلمان ہیں تو آپ نے اُن کی آزادی کا اعلان کر دیا، اُن کے مال نہیں لوٹے، اُن کی عورتیں اور بچے اور وُہ خود غلام بننے سے بچ گئے، بلکہ ان کا نام "طلقاء قریش" رکھا گیا، اس کے خلاف جب قبیلہ ثقیف کو آزادی دی گئی تو اُن لوگوں کو "عتقاء" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ کیونکہ اُن کی اولاد غلام بنانے اور تقسیم النفس و اموال کے بعد آزاد کی گئی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام، اموال ورجال اور جائدادِ منقولہ وغیر منقولہ کے ساتھ مصلحت کے مطابق معاملہ کرتا ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کیا اور اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ وہاں کی بعض عورتوں کو غلام بنایا۔ اور تمام اہل خیبر نے اس اقرار پر صلح کی درخواست کی کہ کل پیداوار کا نصف ہم رسول اللہ کی خدمت میں بھیج دیا کریں گے اور جب آپ چاہیں ہمیں خیبر سے نکال دیں۔ چنانچہ انہیں مہلت دے دی گئی۔

مکہ بزور جنگ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مصلحت کے لیے اس کی تقسیم نہ کی، اس مسئلے پر علماء کے تین گروہ ہیں، بعض کہتے ہیں کہ جو زمین جنگ سے فتح ہو اُس کی تقسیم واجب ہے، جس طرح خیبر میں ہوا، کیونکہ وُہ مالِ غنیمت ہے، دوسرے کہتے ہیں کہ وُہ ارض "فے" قرار پاتی ہے جیسا کہ سورۂ حشر میں مذکور ہے، اور وُہ زمین ارض مغنم قرار نہیں پاتی، تیسری

جماعت یہ کہتی ہے کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان امام کو مختار کیا جائے۔"

اکثر علماء تیسرے قول کے حامی ہیں اور وہی صحیح ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب ہے اور امام احمدؒ کا مشہور قول بھی اسی کا مؤید ہے اور ان دونوں کے علاوہ اور ائمہ وعلماء بھی اس کے حامی ہیں۔ اگر امام کسی شہر کو فتح کرلے اور اس کا ظن غالب ہو جائے کہ وہاں کے لوگ اسلام قبول کرلیں گے اور جہاد کیا کریں گے تو جائز ہے کہ وُہ اُن لوگوں پر اُن کے اموال و اولاد اور اُن کی جانوں کے متعلق احسان کرے جیساکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کے ساتھ کیا تو وُہ سب بلا اختلاف مسلمان ہو گئے، حالانکہ خیبر کے لوگوں میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں ہوا اور وُہ کفر پر مصر رہے، اس لیے اہل خیبر کی زمین تقسیم کی گئی۔ مکہ کی زمینیں اُن کے باشندوں کے لیے چھوڑ دی گئیں، کیونکہ وُہ سارے مسلمان ہو گئے۔

جہاد سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو اور دین اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تالیف قلب کے لیے اپنے پاس سے مال عطا کرتے تھے تو ان کے اپنے دیار و اموال کو اُن کے پاس چھوڑ کر اُن کی تالیفِ قلب کیوں نہ کرتے؛ جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگِ حنین میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں حنین کا مالِ غنیمت دے کر اُن کی تالیفِ قلب کی، حتیٰ کہ اس معاملے میں بعض انصار معتوب ہوئے، جیساکہ صحیحین میں انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ جب حنین کے دن ہوازن قبیلے کا مال وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آیا اور آپؐ قریش کے بعض آدمیوں کو سَو اونٹ دینے لگے، تو انصار کے بعض آدمیوں نے کہا: "یَغْفِرُ اللّٰہُ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ یُعْطِیْ قُرَیْشًا وَّیَتْرُکُنَا وَسُیُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَاءِ ھِمْ" "اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو بخشے، قریش پر عطائیں ہو رہی ہیں اور ہمیں محروم کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہماری

تلواروں سے ہنوز اُن کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں) انسؓ فرماتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی۔ آپ نے انصار کو طلب فرمایا اور نہیں قبۂ آدم میں جمع کر کے فرمایا "تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے ؟" انصار کے ذی فہم طبقہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ ہم میں سے جو اہل الرائے ہیں انہوں نے تو کچھ نہیں کہا، البتہ ہم میں سے چند نوعمر آدمی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو مغفرت کرے، وہ قریش کو مال دے رہے ہیں اور ہمیں محروم کر رہے ہیں، حالانکہ ہماری تلواریں ہنوز اُن کے خون سے رنگین ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " میں اُن لوگوں کو مال دے رہا ہوں، جو حال ہی میں کفر سے نکلے ہیں اور میں اُن کو اس لیے مال دیتا ہوں کہ اُن کے دل ہاتھ میں لے لوں، کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ لوگ مال و زر لے کر جائیں اور تم رسول اللہ کو اپنے گھر لے جاؤ۔ خدا کی قسم جو کچھ تم لے کر جاتے ہو، وہ اس سے بہتر ہے جو وہ لے کر جاتے ہیں۔" انصار نے عرض کی "بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَدْ رَضِیْنَا" (بے شک، یا رسول اللہ! ہم اس پر خوش ہیں) آپ نے فرمایا "تم میرے بعد سخت تنگی دیکھو گے، سو اس وقت تک صبر کرنا کہ تم اللہ و رسولؐ کے ساتھ آملو۔ میں اس وقت حوض (کوثر) پہ ہوں گا۔" انھوں نے عرض کیا "ہم صبر کریں گے۔"

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اگر لوگ وادی یا ایک راستے سے چلیں اور انصار دوسرے راستے سے چلیں۔ تو میں انصار کے راستے سے چلوں گا، باقی لوگ دثار ہیں اور انصار شعار، اگر ہجرت کا واقعہ پیش نہ آچکا ہوتا تو میں انصار میں سے ایک مرد ہوتا۔" اس کے بعد آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا پُردرد خطبہ سنایا کہ انصار

رضی اللہ عنہم زار و قطار رونے لگے۔

سو اس بذل و عطاء سے مقصود لوگوں کو اسلام میں لانا ہے اور جہاد سے بھی یہی مقصود ہے۔ بعض لوگوں کا قول یہ ہے کہ امام پر علی الاطلاق واجب ہے کہ وُہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی تقسیم کرے۔ یہ قول نہایت ضعیف اور کتاب اللہ اور سنت متواترہ کے مخالف ہے۔ ایک دلیل بھی اُس کی تائید میں نہیں ہے۔ تقسیم مغانم خیبر کا واقعہ جوازِ فعل پر دال ہے نہ کہ اس کے وجوب پر۔ کیونکہ فعل بنفسہٖ وجوب پر دال نہیں ہوتا۔ آپؐ نے مغانم مکہ کی تقسیم نہیں فرمائی حالانکہ بلاشبہ وُہ جنگ سے فتح ہُوا تھا۔ احادیث سے یہ بات پورے طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر جنگ کا مالِ غنیمت غانمین میں برابر برابر تقسیم کرنا واجب ہے۔ یہ قول بھی ضعیف ہے۔

تقسیمِ مغانم میں مصالحِ ملّت کا لحاظ

بلکہ صحیح یہ ہے کہ مصلحۃً بعض کو بعض پر ترجیح دینا جائز ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بہت سی لڑائیوں میں بعض کو بعض پر ترجیح دیا کرتے تھے اور جن مولفۃ القلوب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم خیبر میں سے کچھ مال دیا تھا، اُن کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ انھیں رسول اللہ نے اپنے حصّے ⅕ میں سے دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اصل غنیمت میں سے دیا گیا اور یہی موخر الذکر قول غالب ہے، کیونکہ جو مال اُن کو دیا گیا تھا، وُہ اتنا کثیر تھا کہ پانچویں حصّے سے اس قدر مال نہیں نکل سکتا تھا اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہیں خمس الخمیس ⅕ دیا گیا تھا، ان کے قول کی کیفیت سمجھنے سے تو ہم سراسر قاصر ہیں، متقدمین میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ اللہ تعالےٰ نے جو مال تمہیں تکلیف کے بغیر

دیا۔ اس میں سے میرے لیے صرف پانچواں حصّہ ہے اور وُہ پانچواں بھی تمہاری ہی طرف واپس کر دیا جاتا ہے۔" یہ اس لیے ہوتا تھا کہ لشکر میں مولفۃ القلوب ہُوا کرتے تھے، جنھیں مال عطاء کرنے میں بھی رسول اللہ اسی طرح مصلحۃً ترجیح دیتے تھے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ جس طرح تقسیم فے میں امام کا اجتہاد معتبر ہے۔ البتہ طیکہ امام عادل ہو اور اسے علم و عدل کے ساتھ تقسیم کرے۔ فے اور غنیمت کی تقسیم، ورثاء میں میراث کی تقسیم اور آٹھوں قسم کے صدقات کی تقسیم کی مثل نہیں ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات کے متعلق فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ فِيهَا لِقِسْمَةِ نَبِيٍّ وَّلَا غَيْرِهٖ وَلٰكِنْ جَعَلَهَا ثَمَانِيَةَ اَصْنَافٍ فَاِنْ كُنْتَ مِنْ تِلْكَ الْاَصْنَافِ اَعْطَيْتُكَ " اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی نبی اکسی اور شخص کا حصّہ نہیں بنایا لیکن اُس نے ان کی آٹھ قسمیں کر دی ہیں، اگر تم اس اصناف میں سے ہو تو میں تم کو دے دُوں گا۔"

سو معلوم ہوا کہ جو مال اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار سے بدُوں تکلیف کے دلوا دیا، وُہ اس کے خلاف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غنائم خیبر میں سے کچھ مال اہلِ سفینہ پر تقسیم کیا۔ جو جعفر کے ساتھ آئے تھے، حالانکہ ان کے سوا اُور جتنے لوگ اس میں حاضر تھے، ان پر وُہ مال تقسیم نہیں کیا گیا۔ غنائم بدر میں سے طلحہ، زبیر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا حصّہ کیا گیا، حالانکہ وُہ مدینہ میں ٹھہر گئے تھے البتہ یہ بات تھی کہ وُہ لڑنا چاہتے تھے، لیکن وُہ ان مسلمانوں کی ضروریات و مصالح میں مشغول رہے جو بدر میں مصروف رزم و پیکار تھے۔ نیز اہل سفینہ اور طلحہ اور زبیر ا، عثمان رضی اللہ عنہم دوسرے لوگوں کی طرح نہیں تھے اور جہاد قتال غنیمت کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اور غنیمت اس مباح کی طرح نہیں ہوتی جس میں سارے لوگ مشترک ہوں، مثلاً گھاس جمع کرنا، لکڑیاں کاٹنا

شکار کرنا ایسے امور ہیں جن کا مقصود اکتساب مال ہے، اس کے خلاف غنیمت کا یہ حکم ہے کہ جو شخص مال کی خاطر جنگ کرے گا وہ مجاہد فی سبیل اللہ نہیں کہلائے گا۔ اسی لیے ہم سے پہلے لوگوں کے لیے غنائم مباح نہیں ہوتے اور ہم پر مصلحتِ دین کی اعانت کی وجہ سے مباح ہوئے۔ سو غنائم دین اہل دین کی مصلحت کے لیے مباح ہوئے، اس لیے جن لوگوں نے تکمیلِ جہاد میں مجاہدین کو نفع پہنچایا، وہ بھی مجاہدین قرار پائیں گے، اگرچہ وہ جنگ میں حاضر نہ ہوتے ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مسلمان دستِ واحد ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ آدمی بھی ان کی ذمہ داری کے التزام کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور ان میں سے جو لوگ نبرد آزما ہیں وہ گھر بیٹھنے والوں کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، کیونکہ نبرد آزما بیٹھنے والوں ہی کی قوت کے بل نبرد آزمائی کرتے ہیں۔ سو مجاہدین کی اعانت کرنے والے بھی مجاہدین میں شامل ہیں۔ ان مسائل کی تفصیل کا مقام دوسرا ہے۔

یہاں صرف اس بات کی توضیح مطلوب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں یہ لحاظ کرنا ضروری ہے کہ کسی کام کو آپؐ نے کس قصد و نیّت سے کیا تھا، اگر آپ نے کسی جگہ کا قصد عبادت کے لیے کیا تو عبادت کی غرض سے وہاں کا قصد کرنا سنت ہے۔ اگر آپ نے قصد کے بغیر اتفاقاً کسی مقام میں نماز پڑھ دی ہو تو اس مقام کا قصد عبادت کے لیے کرنا سنت نہیں ہے۔ اسی لیے جمہور صحابہؓ اس بات میں آپؐ کی مشابہت کا قصد نہیں فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری فعل کی مشابہت کے نہایت دلدادہ تھے لیکن انھوں نے بھی یہ کبھی نہیں کیا

کہ جس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول فرمایا ہو، اس مقام پر نماز پڑھنی شروع کر دیتے۔ بلکہ وہ صرف اُن مقامات پر نماز پڑھتے تھے، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہوتی تھی۔ اسی لیے امام احمد بن حنبلؒ نے اس معاملے میں رخصت دی ہے، لیکن اس شرط پر کہ یہ فعل نہایت قلیل ہو اور اس فعل کی زیادت سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے۔ آثارِ انبیاء مساجد بنا لیے جاتے ہیں۔ اور ان کو مشاہد و مزارات سے موسوم کر لیا جاتا ہے۔

قبور و آثار پر مساجد و مشاہد بنا لینے کی بدعات اُن لوگوں نے نکالی ہیں جو شریعتِ اسلام، سنتِ رسولؐ اور کمالِ توحید سے واقف نہیں تھے، ان کو اس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ دینِ خالص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونا چاہیے بنی آدم کے لیے انسان شرک کے جو دروازے کھولتا ہے، اُن کو بند کرنے کا طریق نہیں جانتے تھے۔ اس لیے دیکھا گیا ہے کہ مقاماتِ شرک کی سب سے زیادہ تعظیم وہ لوگ کرتے ہیں جو دینِ اسلام کی واقفیت، دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کرنے اور توحید میں سب سے زیادہ بے بہرہ ہیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و حدیث کے واقف، توحید اور اخلاص الدین اللہ کے قریب تر ہیں، شرک سے دور رہتے ہیں اور جو لوگ سنتِ نبویؐ سے جاہل ہیں وہ شرک و بدعات سے قریب تر ہیں۔ اس لیے یہ قباحت جس قدر رافضہ میں پائی جاتی ہے اس قدر دوسرے لوگوں میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ وہ دوسروں سے زیادہ جاہل، زیادہ مشرک اور زیادہ مبتدع ہیں۔

رافضہ کی افراط و تفریط مشاہد کی تعظیم اور مساجد کی تخریب میں دوسرے لوگوں سے بہت سبقت لے گئے ہیں وہ مساجد میں جمعہ بالکل نہیں پڑھتے۔ جماعت نہیں کرتے اور اگر نماز پڑھیں

تو اکیلے اکیلے پڑھتے ہیں۔ اس کے خلاف مشاہدتکیوں اور مزاروں وغیرہ کی تعظیم مساجد سے زیادہ کرتے ہیں، حتیٰ کہ اُن کی رائے میں ان کی زیارت حج بیت اللہ سے بہتر ہے اور اس زیارت کو وُہ "حجِ اکبر" سے موسوم کرتے ہیں۔

ان میں سے ایک شخص ابنِ مفید نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام اس نے "مَنَاسِكُ حَجِّ الْمُشَاهِدِ" رکھا۔ اس کتاب میں اُس نے اکاذیب و خرافات کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے، وُہ وُہ اقوال درج کیے ہیں جو کسی جماعت کے اقوال میں موجود نہیں ہیں اگرچہ دُوسروں میں بھی شرک و کذب اور بدعات کی کوئی نہ کوئی قسم موجود ہے۔ لیکن ان لوگوں میں یہ باتیں سب سے زیادہ ہیں۔

جس قدر کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے، اُسی قدر اُس کی توحید اور اخلاص فی الدین زیادہ ہوتا ہے، اور جُوں جُوں وُہ اتباعِ رسول سے بعید ہوتا جاتا ہے، اُس کے دین میں اسی نسبت سے نقص واقع ہوتا جاتا ہے۔ جب سنتِ رسول سے اُس کا بعد زیادہ ہو جاتا ہے تو اس میں ایسا شرک پیدا ہو جاتا ہے جو اُن لوگوں میں نہیں ہوتا جو متابعتِ سنت کی طرف اُس سے قریب تر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی سنت میں یہ حکم دیا ہے کہ عبادت مساجد میں کی جائے اور عمارتِ مساجد ذکرِ الٰہی سے آباد کی جائیں۔ فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا۔	اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد میں ذکرِ الٰہی کیے جانے میں مانع آتے اور اُن کی ویرانی میں کوشاں ہو۔

یہاں اللہ نے "مَسٰجِدَ اللّٰهِ" فرمایا "مَشَاهِدَ اللّٰهِ" نہیں فرمایا۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۔

اے پیغمبر! تم کہو کہ میرے پروردگار نے مجھے اچھے کام کا حکم دیا ہے اور ہر مسجد کے پاس اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو جایا کرو اور خالص اسی کی فرمانبرداری کی نیت سے اُسے پکارا کرو۔

اللہ تعالیٰ نے "عِنْدَ كُلِّ مَشْهَدٍ" نہیں فرمایا، کیونکہ اہلِ مشاہد میں خالص اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن میں ایک قسم کا شرک ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ لِلْمُشْرِكِیْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِیْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِی النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ۔

مشرکوں سے یہ امر مناسبت نہیں رکھتا کہ وُہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں، وُہ اپنے افعال و اقوال سے اپنے کفر کی شہادت پیش کر رہے ہیں۔ اُن کے اعمال سب اکارت گئے ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ مسجدوں کی آبادی تو وُہ شخص کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ترمذی شریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک مروی ہے کہ "اِذَا رَاَیْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهٗ بِالْاِيْمَانِ" (جب تم کسی شخص کو بار بار مسجد میں آتا دیکھو تو اُس کے ایمان کی شہادت دو) اس کے بعد آپؐ نے آیہ شریفہ متذکرہ بالا پڑھی۔ مسجد کی عمارت (آبادی) سے مراد یہ ہے

کہ اس میں کثرت کے ساتھ عبادت کی جائے، نمازیں پڑھی جائیں اور اعتکاف کیے جائیں۔

جب کسی شہر میں لوگ بستے ہوں تو اُسے آباد شہر کہا جاتا ہے اور جب کوئی اس میں رہنے والا نہ ہو تو اُس شہر کو ویران کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۔	کیا تم حاجیوں کو پانی پلا دینے اور مسجدِ حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کی خدمات کے برابر قرار دیتے ہو، جو خدا پر ایمان لاتا، آخرت پر یقین رکھتا اور خدا کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو یہ لوگ مساوی نہیں ہو سکتے۔

نفس بناء مساجد تو نیک، فاجر اور مسلم و کافر سب کے لیے جائز ہے۔ اس کا نام "بنا" ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ بَنٰى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (جس شخص نے اللہ کی رضاء کی خاطر ایک مسجد بنا دی اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے)

اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ یہ بات مناسبت نہیں رکھتی کہ وُہ اللہ تعالیٰ کی مساجد آباد کریں، حالانکہ اُن کے اعمال اُن کے کفر پر شاہد ہیں، مساجد کو تو وُہ آباد کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے یہ اہلِ توحید کی صفت ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں، اُس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اُس کے سوا کسی سے امید نہیں رکھتے، اُسی سے مدد مانگتے ہیں اور اس کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اور مشاہد آباد کرنے والے

غیر اللہ سے ڈرتے ہیں، غیر اللہ سے بھلائی کی امید رکھتے ہیں، غیر اللہ سے دُعائیں مانگتے ہیں۔ سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "انما یامر مشاھد اللہ" کیونکہ مشاہد اللہ تعالیٰ کے گھر نہیں ہیں، وُہ شرک کے گھر ہیں۔ اس لیے قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے، جس میں مشاہد کی مدح کی گئی ہو اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات مروی ہے۔

پہلے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ انھوں نے اہل کہف کی قبر پہ مسجد بنا دی اور اُن لوگوں کے تشبہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرمایا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے "تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجدیں بنا لیتے تھے، تم قبروں کو مسجدیں ہرگز نہ بنانا، میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں" اس حدیث میں اہل مشاہد کی مذمت ہے، اور اسی طرح ساری صحیح احادیث میں ان کی مذمت کی گئی ہے، چنانچہ فرمایا "لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا فَعَلُوْا" (یہود و نصارٰی پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنا دیا، رسُول اُن کے افعال سے ڈراتے تھے) اور فرمایا: جب ان لوگوں میں کوئی نیک آدمی مر جاتا ہے تو اُس کی قبر پر ایک مسجد بنا دیتے ہیں اور اس میں اس مردِ صالح کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن عند اللہ سارے لوگوں سے زیادہ بُرے ہوں گے۔ اس کے بعد اہل مشاہد کا درجہ ہے مشاہد اکثر جھوٹے ہوتے ہیں، کیونکہ کتاب اللہ میں شرک کا بیان کذب کے ساتھ ملا کر بیان ہُوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔	جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو، ایک اللہ کے ہو رہو اور اس کے ساتھ کسی

کو شریک نہ بناؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا کہ "جھوٹی شہادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے" اور یہ بات اس مشہد کی طرح ہے جو قاہرہ میں حسین کے سر پر بنایا گیا ہے اور یہ بہ اتفاقِ اہل علم جھوٹ ہے۔ حسین علیہ السلام کا سر وہاں ہرگز نہیں گیا، اور اس کی اصل عسقلان میں ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وُہ راہب کا سر ہے۔ حسینؓ کا سر عسقلان میں نہیں۔ یہ بات ملاحدہ بنی عبید کے آخری دور میں گھڑی گئی۔ اسی طرح یہ بات بھی بنالی گئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر بنی بویہ کی سلطنت میں بنائی گئی محمد بن عبداللہ مطین الحفاظ وغیرہ نے کہا ہے کہ وُہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے قصرِ امارت میں معاویہؓ دمشق کے قصرِ امارت میں اور عمرو بن العاصؓ مصر کے قصرِ امارت میں مدفون ہوئے، کیونکہ اگر وُہ نمایاں قبروں میں دفن ہوتے تو انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ خوارج انہیں نکال لیں گے، خوارج ان تینوں کے قتل کے لیے عہد و پیمان کر چکے تھے۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو قتل کیا اور اُن کے ساتھی حضرت معاویہ کو مجروح کیا۔ عمرو نے ایک شخص مسمی خارجہ کو اپنی جگہ مقرر کیا سو خارجی نے اسے قتل کر دیا۔ قاتل کا ارادہ عمرو کا تھا، لیکن ارادۂ باری تعالیٰ میں عمرو کی اجل نہیں آئی تھی، اس لیے وُہ اُس کی مثل بن گیا۔

مقصودِ بیان یہ ہے کہ یہ مشہد ملاحدہ بنی عبید کے عہد میں بنایا گیا۔ لوگ جاہل، گمراہ، بے دینوں کے دست و بازو، مبتدعہ، معتزلہ و رافضہ کے معاون تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں اسلام کو بہت ضعف لاحق ہوا ہے۔ شام نصاریٰ میں داخل ہو گئے۔ ملاحدہ بنی عبید منافق تھے، انہیں اللہ و رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی غرض نہیں تھی، بلکہ جہاں تک ہو سکتا تھا وُہ

کفر و شرک کی حمایت اور اسلام کی عداوت کرتے تھے ان کے متبعین سارے کے سارے اہل بدع و ضلال ہیں۔ نصاریٰ نے ان کے عہدِ حکومت میں شام کے اکثر حصّے پر قبضہ کر لیا۔

مردانِ خدا کا ظہور اس کے بعد تقدیرِ الٰہی سے نور الدین اور صلاح الدین اور اُن کے اتباع و اخوان جیسے پابند سنت بادشاہ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے ممالکِ اسلام کو فتح کیا، کفار و منافقین سے جہاد کیا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے طلوع شمس و غروب کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی۔ کیونکہ اس وقت مشرک سورج کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور شیطان اُن کا ساتھ دیتا ہے۔ اگرچہ مسلمان نمازی سورج کے آگے سجدہ کرنے کی نیت نہیں رکھتے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ ہی بند کر دیا، تاکہ مشرکین کے بعض مختص امور کے ساتھ تشبہ بھی نہ ہو۔ اسی لیے ان دو وقتوں میں نماز ممنوع ہے۔ یہ ابنِ عمرؓ کے الفاظ ہیں جو صحیحین میں موجود ہیں۔ سو ان وقتوں میں نماز کا قصد ممنوع ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا سبب پیدا ہو جائے جس سے نماز مشروع ہو جائے۔ مثلاً اگر تحیۃ المسجد، صلوٰۃ کسوف سجدۂ تلاوت، طواف کی دو رکعتیں یا محلہ کے امام کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھنے کا موقع آجائے تو اس کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف مشہور ہے۔ قولِ اظہر یہ ہے کہ یہ نمازیں جائز اور مستحب ہیں، کیونکہ ان میں کوئی برائی نہیں بلکہ نیکی ہے اور اگر وہ چھوڑی جائے تو وہ فوت ہو جاتی ہے، لیکن اس وقت میں نماز کا قصد اس لیے ممنوع ہے کہ اس میں کفار سجدہ کا قصد کرتے ہیں۔ اور ان سے مشابہت ہوتی ہے اور جس نماز کا کوئی سبب موجود نہ ہو تو اس کا اس وقت میں پڑھنے کا قصد مفہوم ہوگا۔ اگرچہ اُس نے اس وقت کا قصد نہ

کیا ہو، اگر سبب ہو تو یہ سوال ہی دوسرا ہے۔ وُہ فعل تو سبب پر مبنی ہے۔ اس پر وقت کا کسی حالت میں اثر نہیں پڑتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقبرے میں نماز پڑھنے سے عام طور پر منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ "زمین ساری مسجد ہے۔ صرف مقبرہ اور حمام اس سے مستثنےٰ ہیں" اس حدیث کو اہل سنت نے روایت کیا ہے اور یہ مسند و مرسل ہے، حفاظ نے اس بات کو صحیح قرار دیا ہے کہ وُہ مسند ہے، کیونکہ حمام [illegible] المین کی [illegible] ہے۔ مقبروں سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان کو مسجدیں بنا[illegible] ہیں اُن سے مشابہت ہوتی ہے۔ اگرچہ نمازی اتفاقاً وہاں پہنچ گیا ہو اور اس جگہ کی فضیلت کی وجہ سے نماز نہ پڑھے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں سے تشبہ ہوتا تھا جن کی زینت یہ ہوتی ہے، اس لیے اس سے منع کر دیا گیا، جس طرح طلوع و غروب کے وقت مطلقاً نماز منع کر دی گئی۔ اگرچہ اُس وقت کی فضیلت کے خیال سے نماز پڑھی جاتے، کیونکہ اس سے مشرکین سے تشبہ لازم آتا ہے جن کا قصد اس وقت کی فضیلت ہوتی ہے۔

اس وقت میں اور اس مقام پر نماز پڑھنے کی ممانعت کی علم ایک ہی طرح کی ہے، چونکہ جس شرک نے اکثر بنی آدم کو گمراہ کیا ہے اس کی اصل اور اُس کا عظیم ترین حصّہ انسانوں کی عبادت اور اُن کی تصویروں کی پرستش تھا۔ اور مشرکین ایسے معبُودوں کے عادی تھے جو دُوسروں کے مولود تھے۔ خود بھی بچے جنتے تھے، وُہ اوروں کے وارث ہوتے اور اُن کے دوسرے لوگ وارث ہوتے تھے، اور کسی نہ کسی چیز سے ضرور بنے ہوتے ہوتے تھے۔ اس لیے انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ "جس معبود کی آپ عبادت کرتے ہیں وُہ کس چیز کا بنا ہُوا ہے، فلاں چیز کا ہے یا فلاں چیز کا، ایسے

دُنیا کس سے میراث میں ملی ہے اور اُس کے بعد دُنیا کا وارث کون ہو گا؟ سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

اے پیغمبرؐ! ان لوگوں سے کہو کہ وُہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے

ابیؓ بن کعب کی حدیث میں ہے کہ جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے، وُہ ضرور مرتا ہے۔ اور جو شخص لوگوں کا وارث بنتا ہے، ایک وقت ہوتا ہے کہ لوگ اس کے وارث بھی بنتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی بھی عبادت کی گئی ہے وُہ معبُود کسی سے پیدا ہوا ہے، وُہ مولود ہے اور ضرور مرے گا۔

تحریکِ آزادیِ فکر

جمع و ترتیب: مولانا محمد حنیف یزدانی

اور

شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی مساعی

مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اس دور کے بہت بڑے عالم گزرے ہیں — یہ کتاب انہیں کی تصنیف ہے۔ آپ جماعت اہلحدیث کے اکابرین میں سے تھے۔ ان کی یہ کتاب مسلکِ اہلحدیث پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں ہے۔

کتاب کا آغاز تحریکِ اہلِ حدیث کے ابتدائی حالات اور شاہ ولی اللہؒ کی مساعی جلیلہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد اپنے موضوع کے حق میں دلائل پیش کیے ہیں۔ ایک خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ مصنف نے بڑا سلجھا ہوا انداز اپنایا ہے، اور بعض دیگر مصنفین کی طرح موضوع سے نہیں ہٹے کتاب بیحد معلوماتی ہے اور اس میں جماعت اہلحدیث کی سرگرمیوں سے لیکر موٹے موٹے اختلافی مسائل پر مباحث سب ہی درج ہیں۔ ابتدا میں مصنف کا تعارف بھی شامل ہے۔

سفید کاغذ عمدہ طباعت۔ ٹائیٹل خوشنما

قیمت ۲۷ روپے

ہفت روزہ ایشیا
۱۶ جولائی ۱۹۸۰ء